

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مطالب الفرقان

قرآن مجید کی تفسیر — خود — قرآن مجید سے

جلد ہفتم

سُورَةُ يُوسُفَ — تا — سُورَةُ الْحُجُرِ

پرویز



طلوعِ اِلاٰہِ مُرْسِطِ (حجرت ۳) ۲۵ بی بگت، لاہور

نام کتاب: مطالب الفرقان - جلد ہفتم

مصنف: غلام احمد پرویز

پبلشر: طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
۲۵-بی، گلبرگ II، لاہور، پاکستان۔

طابع: دوست ایسوسی اٹس

الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

فون: 712-2981

مطبع: عصمت اسلم پرنٹرز

ایڈیشن: اول فروری 1991

دوم جون 1995

صفحات: (ابتدائی 18) + 201 + (انڈکس 4)

طلوع اسلام ٹرسٹ

25-B گلبرگ II لاہور - 54660 پاکستان

فون: 879246 فیکس 876219

دوست ایسوسی اٹس

الکریم مارکیٹ - اردو بازار لاہور 54000 پاکستان

فون: 712-2981

آئینہ مطالب

مطالب الفرقان — جلد ہفتم

صفحہ	مضمون	آیت نمبر	صفحہ	مضمون	آیت نمبر
۱۰	”صالحین“ کا ایک مفہوم۔			باب اول	
۱۰	اندھے کنوئیں میں ڈالنے کا فیصلہ	۱۲/۱۰	۱	سورۃ یوسف	
۱۰-۱۱	سازش پر عمل درآمد کے لیے بہانہ سازی	۱۲/۱۱-۱۲	۳	جمالِ یوسفؑ	
۱۱	حضرت یعقوبؑ کی تشویش۔	۱۲/۱۳	۲	حسنِ سیرت کی رعنائیاں۔	
۱۱	برادرانِ یوسفؑ کی حیلہ سازی۔	۱۲/۱۳	۳	لوحِ جہیں مستقبل کا آئینہ	
۱۲	یوسفؑ در چاہ۔	۱۲/۱۵	۵	قرآن مجید کا خصوصی تعارف۔	۱۲/۱-۳
۱۲	بھائیوں کی داپسی۔	۱۲/۱۶	۶	اَمْ لَكُمْ تَعْقُلُونَ کا صحیح مفہوم	
۱۳	بھائیوں کی کذب بیانی کہ یوسفؑ کو بھیڑیے نے پھاڑ کھایا۔	۱۲/۱۶	۷	قرآن کی اتھارٹی خود قرآن ہی ہے۔	
۱۳	قلبِ خائن (GUILTY CONSCIOUS)		۷	حضرت یوسفؑ کا خواب۔	۱۲/۲
۱۳	خونِ آلود کرتہ بطور شہادت۔	۱۲/۱۸	۷	جذباتِ حسد و عداوت	۱۲/۵
۱۳	حضرت یعقوبؑ کا صبر جمیل۔		۸	تاویل الاحادیث سے مراد؟	۱۲/۶
۱۳	تافلے کا حضرت یوسفؑ کو کنوئیں سے نکالنا۔	۱۲/۱۹	۹	داستانِ یوسفؑ میں آیاتِ خداوندی	۱۲/۶
۱۳	حضرت یوسفؑ کی زندگی کا نیا دور۔		۹	برادرانِ یوسفؑ کی سازشیں۔	۱۲/۹-۸

۲۲	فیصلہ حضرت یوسفؑ کے حق میں۔	۱۲۰	حضرت یوسفؑ کا بازارِ مصر میں بیگانا۔
۲۳	إِنَّ كَيْدَ كُنْ عَظِيمًا.	۱۲۱	خبرِ یوسفؑ کا انہیں گھر میں
۲۵	نقشبہ قوانین کی مثال۔		عزّت سے رکھنا۔
۲۷	عزیزِ مصر کا بیوی کو ملامت کرنا۔	۱۲۲	مشیتِ ایزدی کے مطابق حضرت یوسفؑ
۲۸	زبانِ مصر کی محفل۔		کو عمدہ موقع ملنا۔
۲۹	عورتوں کا اپنے ہاتھ کاٹنا اور حضرت یوسفؑ	۱۲۳	حضرت یوسفؑ کا جوان ہونا۔
	کی عظمت کا اعتراف۔		جہاں داری کا سلیقہ اور علم و بصیرت
۳۰	زوجہ عزیز کا عورتوں کو طعنہ اور		کی فراوانی۔
	اعترافِ حقیقت۔	۱۲۴	كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ.
۳۰	جذبہ انتقام اور قید کی دھمکی۔	۱۲۵	قلب و نگاہ کی پاکیزگی سے مالا مال جوانی
۳۱	حضرت یوسفؑ کا دعوتِ زنان کے	۱۲۶	اور۔ بنتِ تہذیبِ مصر کی عشوہ طرازیوں۔
	مقابلہ میں قید کو ترجیح دینا۔	۱۲۷	زوجہ عزیز کے ناپاک ارادے۔ اور
۳۱	اللہ کی طرف سے شرفِ قبولیت۔		حضرت یوسفؑ کی اللہ سے پناہ طلبی۔
۳۲	بلا جرم قید و بند۔	۱۲۸	عبدِ مخلص کا برائی سے بچنے کے لیے
۳۲	مصری معاشرہ کی حالت۔		بربانِ رب کو پیشِ نظر رکھنا۔
۳۳	حفاظتِ عصمت۔ بلند ٹی کرداری بنیاد۔	۱۲۹	هَمَّ بَهَا لَوْ... کی وضاحت۔
۳۴	جنسی تعلقات کا قوموں کی تہذیب و	۱۳۰	یوسفؑ۔ عبدِ مخلص۔
	تمدن پر اثر۔	۱۳۱	حضرت یوسفؑ اور عزیز کی عورت
۳۴	جبری تجربہ کی بلاکت انگیزی (ڈاکٹر انون)۔		کے درمیان کشمکش۔
۳۶	جوانی سطحِ زندگی۔	۱۳۲	دروازے پر عزیزِ مصر کا سامنے آجانا۔
۳۷	قید خانہ کے ساتھیوں کے خواب۔	۱۳۳	زوجہ عزیز کی الزام تراشی اور سزا کی تجویز۔
۳۸	ملتِ آباءِ یوسفؑ کا تعارف۔	۱۳۴	حضرت یوسفؑ کی وضاحت۔
۳۸	وَعظِ یوسفی. الدین القیّم.	۱۳۵	فیصلہ کے لیے واقعاتی شہادت۔

۴۹	متقین کا مستقبل - حال سے بہتر	۱۲ ۵۷	۴۰	قید خانہ کے ساتھیوں کے خواب کی	۱۲ ۴۱
۵۰	نظام یوسفی - تورات کا بیان			یوسفی تعبیر	
۵۱	برادران یوسف کی مصر میں آمد	۱۲ ۵۸	۴۱	حضرت یوسف کی رہا ہونے والے قید	۱۲ ۴۲
۵۲	بھائیوں کو غم دینا اور ان کے باپ جٹے	۱۲ ۵۹	۴۱	سے فرمائش اور اس کا بھول جانا	
	بھائی کو لانے کے لیے کہنا			بادشاہ کا خواب	۱۲ ۴۳
۵۲	بھائیوں کا باپ سے اجازت لے کر اُسے	۱۲ ۶۱	۴۲	(رہا ہونے والے) ساقی کا یوسف کو یاد کرنا	۱۲ ۴۵
	لانے کا وعدہ			حضرت یوسف کے پاس جا کر ساقی کا تعبیر	۱۲ ۴۶
۵۲	بھائیوں کی پونجی بھی واپس بوریوں میں	۱۲ ۶۲	۴۳	پوچھنا	
	رکھوادی			حضرت یوسف کا تعبیر بیان کرنا	۱۲ ۴۷-۴۸
۵۳	برادران یوسف کا باپ کو واقعات بتانا	۱۲ ۶۳	۴۴	سیرت یوسفی کی ایک اور جھلک	۱۲ ۵۰
۵۳	حضرت یعقوب کا ان پر عدم اعتبار	۱۲ ۶۴		عورتوں کے ہاتھ کاٹنے کے معاملہ کی تحقیق و تصفیہ	
۵۴	اپنی پونجی بھی واپس پا کر باپ سے بھائی کو	۱۲ ۶۵	۴۴	کے بغیر قید خانہ سے باہر آنے سے انکار	
	ساتھ بھیجنے پر اصرار			تورات کا بیان	
۵۴	حضرت یعقوب کا بیٹوں سے بن یا مین	۱۲ ۶۶	۴۵	ہمارے ہاں کی ایک روایت	
	کو واپس لانے کے لیے اللہ کے نام پر			معاملہ کی تحقیق اور عورتوں کا اعتراف	۱۲ ۵۱
	عہد لینا			حقیقت بے نقاب	
۵۵	داخلہ مصر کے وقت احتیاط کی ہدایت	۱۲ ۶۷	۴۷	وجہ تحقیق - عدم خیانت کا اعتراف کرنا	۱۲ ۵۲
۵۵	پسران یعقوب نے ہدایت کی پابندی کی	۱۲ ۶۸	۴۷	عزیز مصر کی بیوی کا برملا اعتراف	۱۲ ۵۳
	لیکن یہ تدبیر اس واقعہ کو روک نہ سکتی تھی			بادشاہ کا حضرت یوسف کو بلا کر عزت افزائی کرنا	۱۲ ۵۴
	جو قانون خداوندی کی رو سے پیش آنے			حضرت یوسف کا خزانہ ارض کے نظم و نسق کا	۱۲ ۵۵
	والا تھا			طلب کرنا	
۵۶	حضرت یوسف کا بھائی کو اعتماد میں لینا	۱۲ ۶۹	۴۹	ارشاد ربانی ہم محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتے	۱۲ ۵۶
۵۶	بھائیوں کی بن یا مین کے خلاف سازش	۱۲ ۷۰	۴۹	تمکین فی الابل	

۶۵	برادرانِ یوسف مذمتِ سماجت پر اتر آئے [۱۲/۷۹]	شاہی کٹورا بن یا مین کی بوری میں رکھ دیا۔
۶۶	حضرت یوسفؑ کا اصرار کہ جس سے مال برآمد ہو، اسے ہی روکا جائے گا۔	۵۷ شاہی کارندوں کی پکار اور انعام کا اعلان۔
۶۷	برادرانِ یوسفؑ کے صلاح مشورے اور باپ کو بن یا مین کے روکے جانے کی وجہ بتانے سے متعلق سوچ بچار۔	۵۷ برادرانِ یوسفؑ کا قسمیں کھا کر اظہارِ بریت [۱۲/۷۹]
۶۷	قساوتِ قلبی کی ایک جھلک۔ باپ سے یہ کہنا کہ تیرے بیٹے نے چوری کی۔	۵۸ شاہی کارندوں کا اقرار لینا۔ [۱۲/۷۹]
۶۷	حضرت یعقوبؑ کا یہ ارشاد کہ یہ سارا قصہ تمہارا خود وضع کردہ ہے۔	۵۸ بھائیوں کا جواب کہ جس سے ملے وہی اس کا بدلہ ہوگا۔ [۱۲/۷۹]
۶۸	بن یا مین کے پیچھے رہ جانے میں باپ کا سبکے پھر سے اکٹھا ہونے کے امکان کو بھانپنا۔	۵۸ پیالہ بن یا مین کی بوری سے برآمد۔ [۱۲/۷۹]
۶۸	حضرت یوسفؑ کی یاد تازہ ہو گئی۔ باپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔	۵۹ تورات اور تفسیر ابن کثیر کے بیانات۔
۶۸	بیٹوں کا باپ کو یوسفؑ کے تذکرہ پر طعن کرنا۔	۶۰ حضرت یوسفؑ کے علوم و تربیت کی شہادت
۶۹	حضرت یعقوبؑ کا یوسفؑ اور اس کے بھائی کے بارے میں پڑا امید ہونا اور بیٹوں کو دوبارہ مصر جانے کے لیے کہنا۔	۶۰ سب کچھ حضرت یوسفؑ کے ارادے یا عمل و فعل کے بغیر ہوا۔
۶۹	دربارِ یوسفؑ میں بھائیوں کا اپنی حالتِ زار بیان کرنا اور صدقہ کی درخواست کرنا۔	۶۰ كَذٰلِكَ كَذٰبَ الْيُوسُفَ خدایا اس پوری تدبیر کو اپنی طرف منسوب کرنا
۷۰	حضرت یوسفؑ نے بھائیوں کو اپنے اور	۶۱ قرآن کریم میں اس اسلوبِ بیان کی دیگر مثالیں۔
		۶۲ زیرِ نظر آیت کا پورا مفہوم۔
		۶۳ دینِ الملک۔
		۶۳ بھائیوں کا بن یا مین اور اس کے بھائی [۱۲/۷۹]
		د حضرت یوسفؑ پر چوری کا الزام۔
		۶۳ حضرت یوسفؑ نے اس الزام کی تردید نوخیز کر دی۔
		۶۴ تفسیر ابن کثیر میں حضرت یوسفؑ کے بچپن کے واقعہ کا تذکرہ۔

۷۵	حضرت یوسفؑ کی طرف سے احساناً خداوند کا تذکرہ۔	۱۲ ۱۰۱	بن یامین کے ساتھ ان کی بدسلوکی بتائی۔	۱۲ ۹۰
۷۶	یہ سبے حسن عمل کی سرگزشت زریں۔	۱۲ ۱۰۲	حضرت یوسفؑ کا اقرار۔	۷۱
۷۷	اے رسولؐ! آپ کو افسردہ خاطر ہونے کی ضرورت نہیں۔	۷۱	مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ۔	۷۱
۷۸	تاویل الاحادیث۔	۷۱	بھائیوں کا اعترافِ جرم۔	۱۲ ۹۱
۷۹	دعاے دیدہ حوالہ چین گفت	۷۲	”برادرانِ یوسفؑ“ بطور ضرب المثل۔	۱۲ ۹۲
۸۰	خوابوں کی دنیا۔	۷۲	پیرانِ یوسفؑ	۱۲ ۹۳
۸۱	سجدہ۔	۷۳	شمیم یوسفؑ کی عطریں اور باپ کا اظہارِ احساس۔	۱۲ ۹۴
۸۲	طاغوتی نظام اور عبدِ مؤمن۔	۷۳	سامعین کا حضرت یعقوبؑ کو پڑانے	۱۲ ۹۵
۸۳	نبوت اور وراثت۔	۷۳	نخط کا طعنہ۔	۱۲ ۹۶
۸۴	احسن انقصص کا مقصدِ عظیم۔	۷۳	بشارت دہندہ کی آمد۔	۱۲ ۹۷
۸۵	لوگ واضح نشانیاں دیکھ کر بھی منہ پھیر لیتے ہیں۔	۷۳	باپ کی آنکھوں کی رونق۔	۱۲ ۹۸
۸۶	لوگوں کی اکثریت، خدا پر ایمان لانے کے بعد بھی مشرک رہنا چاہتی ہے۔	۷۴	پسرانِ یعقوبؑ کی معافی طلبی	۱۲ ۹۹
۸۷	کیا یہ لوگ اچانک آنے والی تباہی سے اپنے آپ کو محفوظ تصور کرتے ہیں؟	۷۴	باپ کا وعدہ استغفار۔	۱۲ ۱۰۰
۸۸	قرآن اپنے دعویٰ کو علم و بصیرت کی رُو سے پیش کرتا اور دلیل و برہان کی رُو سے منواتا ہے۔ یہی سنتِ رسولؐ ہے۔	۷۵	تمام گھرنے کی مصر میں آمد اور حضرت یوسفؑ کا اپنے والدین کو عزت سے اپنے پاس رکھنا	۷۵
۸۹	رسولؐ انہی جیسا انسان کیوں ہے؟	۷۵	عزت و تکریم کی مسندوں پر والدین کو فائز کرنا۔	۷۵
۹۰	بظاہر یوسفؑ کُن حالات کے بعد،	۷۵	تمام متعلقین، اہل کار اور خدام کا حضرت یوسفؑ کی وجہ سے تعظیم بجالانا۔	۷۵
۹۱		۷۵	حضرت یوسفؑ کے پہلے خواب کی تعبیر۔	۷۵

۱۰۴	۱۳/۲	بِکَلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔	نصرتِ خداوندی آجاتی ہے۔		
۱۰۴	۱۳/۹-۸	عمل اور اس کے نتائج کے ظہور میں وقفہ۔ مثالیں۔	۹۵	۱۳/۱۱	قصہ حضرت یوسفؑ میں سامانِ عبرت و مواعظت۔
۱۰۶	۱۳/۱۰	اعمالِ انسانی کا محفوظ ریکارڈ۔	۹۵	۱۳/۱۱	قرآنِ کریم، بنی نوعِ انسان کے لیے خدا کی طرف سے آخری اور مکمل ضابطہ حیات
۱۰۶	۱۳/۱۱	اعمال کے محفوظ رکھنے کا طریقِ خداوندی۔			
۱۰۶		تغییرِ نفس کے بغیر خارجی احوال کا بدلنا ناممکن ہے۔			
۱۰۷	۱۳/۱۲-۱۳	تباہی کے بعد، دوبارہ زندگی کے حصول کی اُمید کی جھلک۔	۹۷		
		مظاہرِ فطرت (برق، رعد اور صاعق) کی مثال۔	۹۷		
۱۰۸	۱۳/۱۴	لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ۔ مانگنا اسی سے چاہیے۔	۱۰۰	۱۳/۱	ذبحِ تسمیہ
۱۰۸	۱۳/۱۵	مظاہرِ فطرت قانونِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز۔	۱۰۰	۱۳/۲	نزولِ کتاب، بالحق۔
۱۰۹	۱۳/۱۶	سروریِ زیبا فقط اس ذاتِ بے بہتا کو ہے۔	۱۰۱		رفعِ سماوات
		مسئلہ خیر و شر۔	۱۰۱		تدبیرِ امور
۱۱۰		کائناتی قوتوں کو وحیِ خداوندی کی روشنی میں استعمال کرنا خیر۔ اور انہیں انسانیت کی تخریب کے لیے استعمال کرنا شر۔	۱۰۱		لقارِ رب
۱۱۳	۱۳/۱۷	قرآن کا اصولِ بقا و منفعتِ انسانی۔	۱۰۱	۱۳/۳-۳	ساری کائنات میں پھیلا ہوا نظامِ ربوبیت۔
۱۱۵	۱۳/۱۸	اس اصول کے اعتبار سے دو گروہ۔	۱۰۲		مَدَّ الْأَمْصَن۔
			۱۰۲	۱۳/۵	خلقِ جدید۔ کفار کا اظہارِ تعجب۔
			۱۰۳		ربوبیتِ خداوندی سے انکار کے سبب جہالت و تہلکہ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے لوگ۔
			۱۰۳	۱۳/۶	قوموں کی زندگی میں موت و حیات نو کا سلسلہ۔
			۱۰۴		قانونِ اسباب و علل۔

۱۲۵	شُرک کا ایک اور گوشہ۔	۱۳ ۳۳	۱۱۵	خدا کی طرف سے نازل کردہ "الحق" پر ایمان رکھنے والا اور حقیقت کی طرف سے انڈھا برابر نہیں ہو سکتے۔	۱۳ ۱۹
۱۲۶	مشرکین کا انجام۔	۱۳ ۳۴	۱۱۶	اولی الالباب - اللہ سے باندھے عہد کو پورا کرتے ہیں۔	۱۳ ۲۰
۱۲۶	متقین کے لیے موعودہ جنت کی مثال۔	۱۳ ۳۵	۱۱۶	اولی الالباب کی مزید خصوصیات۔ ان کے لیے سلامتی اور خوشگوار انجام کی نوید۔	۱۳ ۲۱-۲۳
۱۲۷	اتباع قرآن کا نتیجہ۔ جنت کی زندگی۔	۱۳ ۳۶	۱۱۹	دوسرا گروہ - عہد شکن، انتشار و فساد پھیلانے والا - ان کو بُرے انجام کی وعید۔	۱۳ ۲۵
۱۲۸	واضح احکامات کے بعد، راہ گم کردہ لوگوں کے خیالات کے اتباع کا نتیجہ۔	۱۳ ۳۷	۱۱۹	رزق کی بسط و کشاد - خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق۔	۱۳ ۲۷
۱۲۸	خدا کے ہاں فیصلے قانون کی دوسے ہوتے ہیں۔ رسولوں کی بشریت یا فوق البشریت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔	۱۳ ۳۸	۱۲۰	دنیاوی اور اخروی زندگی کا تقابل۔ انکار کرنے والوں کی معجزہ طلبی اور خدا کا قانون ہدایت۔	۱۳ ۲۷
۱۲۹	قانونِ محو و ثبات۔	۱۳ ۳۹	۱۲۱	ذکر اللہ اور اطمینانِ قلب۔	۱۳ ۲۸
۱۲۹	رسول سے ارشادِ خداوندی۔	۱۳ ۴۰	۱۲۲	ایمان و اعمالِ صالحہ کا نتیجہ۔ طُوبٰی لَہُمْ وَحَسُنَ مَا یَبِیۡ	۱۳ ۲۹
۱۳۰	"آپ کا فریضہ تبلیغ اور نتیجہ ہمارے حساب کتاب ہے اور انقلاب کا آغاز ہو چکا ہے۔	۱۳ ۴۱	۱۲۲	قرآن کوئی نئی بات نہیں کہتا۔	۱۳ ۳۰
۱۳۰	زمین (وسائلِ پیداوار) بڑے بڑے شراروں کے ہاتھ سے چھین رہی ہے۔	۱۳ ۴۲	۱۲۳	انکار کرنے والے، جیسی معجزات والے قرآن پر بھی ایمان نہ لاتے۔	۱۳ ۳۱
۱۳۱	ان کی تدبیریں اس انقلاب کو روک نہیں سکتیں۔	۱۳ ۴۳	۱۲۴	استہزاء، رسل۔ پُرانی روش اور اس کا وہی انجام	۱۳ ۳۲
۱۳۱	قرآن سے انکار کے معنی رسول کی رست سے انکار کرنا ہوتا ہے۔	۱۳ ۴۴			
	باب سوم				
	سُورَةُ اِبْرٰہِیْم				
۱۳۳	نزول کتاب مقصد انسانیت کو تارکیوں	۱۴ ۱			
۱۳۵					

	جیسے انسان ہو اور ہمیں ہمارے آباؤ اجداد کے مجبوروں سے روکنا چاہتے ہو۔		سے نکال کر روشنی کی طرف لے جانا۔
۱۳۱	رسولوں کا اعتراف بشریت کے ساتھ احساناتِ خداوندی کا تذکرہ۔	۱۳۶	خدا نے عزیز و حمید کے راستہ سے انکار کرنے والوں کے لیے عذاب۔
۱۳۲	نبوت انسان کا اکتسابی ملکہ نہیں، یہ موهبتِ خداوندی ہے۔	۱۳۷	یہ منکرین وہ لوگ ہیں جو اخروی زندگی پر اس طبعی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں اور اللہ کی راہ میں روک بن جاتے ہیں۔
۱۳۲	رسولوں کا بیان کہ ہدایتِ خداوندی کے صدقے ان پر توکل اور مخاطبین کی طرف سے اذیت پر صبر واجب ہے۔	۱۳۷	رسول اپنی قوم کی زبان میں پیغامِ حق پہنچاتے تھے۔
۱۳۲	سبیل اور سبیل کی وضاحت۔	۱۳۷	ظلمات سے نور کی طرف رہنمائی۔
۱۳۳	انکار کرنے والوں کا یہ کہنا کہ ہمارا مسلک اختیار کرو، ورنہ ہم نہیں اپنی سرزمین سے باہر نکال دیں گے۔	۱۳۷	حضرت موسیٰ کی مثال۔
۱۳۳	خدا کا ارشاد کہ ظالم تباہ ہوں گے اور اہل ایمان ان کی جگہ لیں گے۔	۱۳۸	آیام اللہ۔
۱۳۳	قرآن کے بیان اور تاریخ کی حیثیت۔	۱۳۹	داستانِ قومِ موسیٰ کا تذکرہ۔
۱۳۳	دو غیر متبدل اصول۔	۱۳۹	ذبحِ ابناء
۱۳۳	ظالم آخر الامر ناکام رہتے ہیں۔	۱۳۹	شکر و کفر کا تقابل۔
۱۳۳	جو قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے محتاط رہتے ہیں، کامیاب ہوتے ہیں۔	۱۳۹	تمام اہل زمین بھی انکار کر دیں تو اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑے گا۔
۱۳۳	جنت اور جہنم کی زندگی اسی دنیا سے شروع ہو جاتی ہے۔	۱۴۰	انبیاء سابقہ اور اقوام گزشتہ کے احوال و کوائف کی یاد دہانی اور ان اقوام کا اپنے انبیاء کی دعوت کی صداقت پر عدم یقین۔
۱۳۴	مکوم قوموں کی جہنمی زندگی کی تفصیلات۔	۱۴۰	رسولوں کا جواب کہ کیا اُس خالقِ کائنات کے باسے میں شک کرتے ہو جو تمہیں تباہیوں سے حفاظت کی طرف بلاتا ہے۔
		۱۴۱	لوگوں کا جواب میں کہنا کہ تم ہمارے ہی

	کی صلاحیت تو ہوتی ہے لیکن اسے انسان کے اعمالِ صالحہ ہی رفعتوں سے آشنا کرتے ہیں۔	۱۴۳	لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ۔
		۱۴۵	کفار کے اعمال کی مثال۔
		۱۴۶	ان کے اعمال کوئی ٹھوس نتیجہ مرتب نہیں کرتے
۱۵۱	جو قومیں غلط نظریات پر عمل پیرا ہوتی ہیں ان کے لیڈر انہیں تباہی اور بربادی کے جہنم میں پہنچا دیتے ہیں۔	۱۴۶	خارجی کائنات میں ہر شے تعمیری نتیجہ مرتب کرتی ہے۔
		۱۴۶	تعمیری نتائج نہ پیدا کرنے والوں کی جگہ خدا نئی مخلوق لے آنے پر قادر ہے۔
۱۵۱	ان کے ساتھ یہ کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ انہوں نے خدا کے لیے شریک ٹھہرا رکھے تھے	۱۴۶	استبدالِ قومی کی وضاحت۔
۱۵۲	اس کے برعکس خوشگوار نظریہ زندگی کے حاملین کو صلوة و انفاق پر قائم رہنے کی ہدایت اور قانونِ مکافات کو مد نظر رکھنے کی تاکید۔	۱۴۶	شیطان کا اظہارِ بریت۔
		۱۴۸	شیطان خود اپنے ہی سرکش جذبات کا نام ہے۔
۱۵۳	تمام کائنات کو محیط نظامِ ربوبیت کی بنیاد۔	۱۴۸	تو انین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے والوں کا حسین انجام۔
	قانونِ مکافاتِ عمل۔	۱۴۹	صحیح اور غلط نظریاتِ حیات کا تقابل۔
۱۵۳	نظامِ کائنات اس لیے سرگرم عمل ہے کہ انسانوں کو ان کی ضروریاتِ زندگی میسر آتی رہیں۔	۱۴۹	ایک مثال۔
		۱۵۰	خوشگوار نظریہ زندگی کی مثال، ایک عمدہ اور پھل دار درخت کی سی۔
۱۵۳	تعمیرِ کعبہ کی تکمیل پر دُعا لے ابراہیمیؑ۔	۱۵۰	غلط نظریہ زندگی کی مثال، ایک نکتے دار درخت کی سی۔
۱۵۵	صنم کا مفہوم۔	۱۵۰	جو قوم محکم نظریہ حیات پر کاربند ہوتی ہے اسے زندگی میں ثبات و استحکام حاصل ہوتا ہے۔
۱۵۵	انسانوں کو گمراہ کرنے والے مٹی اور پتھر کے بت نہیں بلکہ وہ مذہبی پیشوا ہیں جو لوگوں کو غیر اللہ کی معبودیت کا سبق پڑھاتے ہیں۔	۱۵۱	خوشگوار نظریہ حیات میں اوپر کی طرف اٹھنے
۱۵۶	میرا وہ ہے جو میرا اتباع کئے۔ دو قومی نظریہ کی اساس۔		

۱۶۰	خدا کی تدابیر کے خلاف دوسروں کی تدابیر ناکارہ رہ جاتی ہیں۔	۱۴۳ ۳۶	۱۵۶	حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا تسلسل۔	۱۴۳ ۳۷
۱۶۱	رسولوں کے ساتھ خدا کے وعدے یقیناً پورے ہوتے ہیں۔	۱۴۳ ۳۷	۱۵۷	اقامتِ صلوٰۃ کے لیے امنِ امان کا قیام اور رزق کی طرف سے اطمینان۔	۱۴۳ ۳۷
۱۶۱	اللہ کے قوانین پر عمل پیرا ہونے سے جو انقلاب آتا ہے اس سے زمین و آسمان بدل جاتے ہیں۔	۱۴۳ ۳۸	۱۵۷	’شکر‘ کا مفہوم۔	۱۴۳ ۳۷
۱۶۲	باطل معاشرہ میں اصلاحِ احوال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔	۱۴۳ ۳۸	۱۵۸	بارالہا! جو کچھ میں گزارش کر رہا ہوں، تو خوب جانتا ہے کہ یہ میرے دل کی آواز ہے۔	۱۴۳ ۳۸
۱۶۲	اصلاحِ احوال کے لیے ایک نیا معاشرہ قائم کرنا ضروری ہے۔	۱۴۳ ۳۹	۱۵۸	ماضی کی نوازشات کریمانہ پر اظہارِ تشکر اور دُعا کی قبولیت کی آرزو۔	۱۴۳ ۳۹
۱۶۳	انقلاب کے دن مجرمین کی حالت زار۔	۱۴۳ ۴۱	۱۵۸	اور دُعا وہی۔ قیامِ نظامِ صلوٰۃ کی توفیق طلبی۔	۱۴۳ ۳۸
۱۶۳	اللہ کا قانون اعمال کی نتیجہ خیزی میں دیر نہیں لگاتا۔	۱۴۳ ۴۱	۱۵۹	اپنے، ماں باپ اور مومنین کے لیے مغفرت طلبی۔	۱۴۳ ۴۱
۱۶۳	هَذَا بَلَّغٌ لِلنَّاسِ۔	۱۴۳ ۴۲	۱۵۹	قرآنِ کریم میں اقوامِ سابقہ کی داستانوں کا تذکرہ، موعظت و عبرت کا سامان۔	۱۴۳ ۴۲
	باب چہارم		۱۵۹	اللہ کا قانون ظالموں کے اعمال سے بے خبر نہیں۔	۱۴۳ ۴۲
	سُورَةُ الْحَجَرِ		۱۵۹	ظہورِ نتائج کے وقت ان کی آنکھیں پتھرا جائیں گی۔	۱۴۳ ۴۲
۱۶۵	وجہ تسمیہ۔		۱۵۹	افراطِ فحشاء کا عالم ہوگا۔	۱۴۳ ۴۳
۱۶۶	یہ اس قرآن کی آیات ہیں جو اپنے مطالب خود واضح کرتا ہے۔	۱۵ ۱	۱۶۰	جو اس قدر سرکشی اختیار کر رہے ہیں، ذلیل و خوار ہوں گے۔	۱۴۳ ۴۴
۱۶۸	ضابطہ خداوندی سے انکار کرتے رہنے والے، انقلاب کے بعد اس حسرت میں رہیں گے کہ	۱۵ ۲	۱۶۰	ظالمین کے مسکن میں مومنین کی آبادی سے تندر۔	۱۴۳ ۴۵

۱۶۲	اور ایمان نہ لانا ان کی روش جاریہ۔	۱۵ ۱۳	کاش انہوں نے اسے تسلیم کر لیا ہوتا۔	۱۵ ۳	۱۶۸
۱۶۲	ایسی ذہنیت، خوارقِ عادت واقعہ دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتی۔	۱۵ ۱۵-۱۳	حیوانی سطح زندگی بسر کرنے والوں کی طبی چوٹی آرزوئیں انہیں زندگی کے بلند مقاصد سے غافل رکھتی ہیں۔		
۱۶۳	دایمان لانے کا طریقہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم پر غور و فکر کیا جائے نہ کہ خوارقِ عادت باتوں کا تقاضا کیا جائے۔		نظریات کی بنیاد پر انسانوں کے دو گروہ۔ صرف طبعی زندگی اور طبعی زندگی کے علاوہ ذات پر ایمان رکھنے والے۔		۱۶۸
۱۶۳	ستاروں کے ساتھ انسانی قیمتیں وابستہ نہیں بلکہ وہ زمین نگاہ کا سامان اور تخریبی قوتوں سے محفوظ ہیں۔	۱۵ ۱۴-۱۶	قوموں کے لیے اللہ کا اصولِ ہلاکت اور مہلت کا وقفہ۔	۱۵ ۲	۱۶۹
۱۶۴	نزولِ قرآن کے بعد ہر قیاس و تخمین کے پیچھے علم و یقین کا ایک چمکتا ہوا شعلہ موجود ہے جو اس کی حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے۔	۱۵ ۱۸	مہلت کا وقفہ گزرنے کے بعد ظہورِ نتائج کا ملنا ممکن نہیں۔	۱۵ ۵	۱۶۹
۱۶۵	حضور کے صاحبزادے کی وفات پر سوچو، مگر توہم پرستی کی تردید۔		خوابِ غفلت میں پڑے لوگ حاملِ ذکر کو پاگل ہی کہتے رہے ہیں۔	۱۵ ۹	۱۷۰
	انسان صاحبِ اختیار ہے۔		اور صداقت کی دلیل کے طور پر ملائکہ کا نزول چاہتے ہیں۔	۱۵ ۲	۱۷۰
۱۶۶	کشادہ زمین اور پہاڑوں کی حیثیت۔	۱۵ ۱۹	ملائکہ کا نزول تو نتائج کے حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آنے کے وقت ہوتا ہے اور پھر مہلت نہیں ملتی۔	۱۵ ۸	۱۷۰
۱۶۶	نظامِ ربوبیت کے کل پُرزے۔		قرآن ایک مستقل اور ابدی ضابطہٴ حیات ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا ہے۔	۱۵ ۹	۱۷۱
۱۶۶	زمین، انسان اور دیگر مخلوق کے لیے ذریعہٴ معاش و رزق۔	۱۵ ۲۰	اُمم سابقہ کے باں بھی رسول آتے رہے لیکن ان کا رویہ استہزاء کا ہی رہا۔	۱۵ ۱۱-۱۰	۱۷۱
۱۶۷	ہر چیز کے خزانے طے شدہ پیمانوں کے مطابق میسر آتے ہیں۔	۱۵ ۲۱	یہ مجرمین کی مشترک نفسیاتی کیفیت ہے۔	۱۵ ۱۲	۱۷۲
۱۶۸	ہواؤں، بادلوں اور مینہ کا نظام۔	۱۵ ۲۲			
۱۶۸	زندگی پر مکی اقتدار خدا کو حاصل ہے۔	۱۵ ۲۳			

۱۸۵	اہل فقہ کے ہاں قانونی ماخذ میں قیاس کا درجہ اور اہل حدیث کا مسلک۔ اَوَّلَ مَنْ قَاسَ اِبْلَیْسُ۔	۱۸۸	قرآن کے اسلوب بیان کا معجزہ۔ ممتاز مستشرق گت کا اعتراف۔
۱۸۵	خدائی فیصلہ۔ ابلیس مردود اور سعادتوں سے محروم رہے گا۔	۱۸۹	سامان زیت جس کے ساتھ افراد و اقوام کی موت و حیات وابستہ ہے، قانون خداوندی کی رو سے حاصل ہوتا ہے۔
۱۸۶	ابلیس کی ٹہلت طلبی جو بارگاہ خداوندی سے نشاۃ ثانیہ تک کے لیے دی گئی۔	۱۹۰	دوسروں سے آگے بڑھنے کا جذبہ۔
۱۸۶	ابلیس کا دعویٰ کہ وہ بنی نوع انسان کو گمراہ کرتا رہے گا۔	۱۹۱	جامعہ ترمذی کی ایک روایت۔ کیا حدیث منسوب الی الرسول، قرآن کی تفسیر بیان کرتی ہے؟
۱۸۶	جو اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا اس کی کبھی اصلاح نہیں ہو سکتی۔	۱۹۲	قرآنی نظام ربوبیت میں طبقاتی تقسیم نہیں ہوگی۔
۱۸۶	ابلیس کا بس خدا کے مخلص بندوں پر نہیں چلے گا۔	۱۹۲	تخلیق انسانی کا تذکرہ۔
۱۸۶	ارشاد خداوندی کہ میرے مخلص بندوں کی راہ ہی میری طرف لانے والی صراطِ مستقیم ہے۔	۱۹۳	آدم ایک مٹی کا پتلا تھا۔ اس کی تردید۔
۱۸۸	اور یہ کہ تیرا زور میرے بندوں پر نہیں چلے گا۔ ہاں مگر وہ جو تیرے پیچھے لگ کر گمراہ ہوں۔	۱۹۳	زندگی مختلف مراحل سے گزر کر پیکر انسانی تک پہنچی ہے۔
۱۸۸	ایسے لوگ جہنم رسید ہو کر ہی رہیں گے۔	۱۹۳	انسان سے پہلی مخلوق، جن کا اجمالی ذکر۔
۱۸۸	جہنم کی تباہی تو سب کے لیے ایک جیسی ہوگی لیکن اس تک پہنچنے کے راستے مختلف ہوں گے۔	۱۹۳	قصہ ابلیس و آدم۔ ملائکہ سے خطاب کہ بشر تخلیق کیا جا رہا ہے۔
۱۸۸	ان کے برعکس متیقن کی منزل مسر سبز و شاداب باغات اور جاری چشمے ہوں گے جہاں ہر قسم کی سلامتی اور امن ہوگا۔	۱۹۳	انسان میں انسانی توانائی ڈالنے کے بعد تمام قوتوں کو اس کے آگے تسلیم ختم کرنے کا حکم۔
۱۸۹	جنتی معاشرہ میں بھائی چارہ کی فضا۔	۱۹۴	ملائکہ کا سجدہ۔ ابلیس کا انکار۔
		۱۹۴	انکار سجدہ پر ابلیس کی جواب طلبی۔
		۱۹۴	”میں بشر سے بہتر ہوں“ ابلیس کا جواب۔

۱۹۵	مومنین کے لیے نشانیاں۔ اصحاب الایکہ کا ظلم۔ قدرت کا انتقام۔ یہ بستی بھی شاہراہ عام پر ہے۔	۱۵ ۴۸	۱۸۹	جس میں بے تکان ہمیشگی ہوگی۔	۱۵ ۴۸
۱۹۵	اصحاب الحجر یعنی قوم ثمود نے بھی رسولوں کی تکذیب کی۔ ان کے قلعہ نما گھر بھی انہیں عذابِ خداوندی سے نہ بچا سکے۔	۱۵ ۸۳-۸۴	۱۸۹	حضور سے ارشادِ خداوندی کہ میرے بندوں سے منفرت رحمت اور عذاب دونوں کا واضح بیان کر دیں۔	۱۵ ۴۹-۵۰
۱۹۵	ان داستانوں کے تذکرہ سے درحقیقت مقصود یہ بتانا تھا کہ حضور نبی کریم کے مخالفین کی روش کوئی نئی بات نہیں۔ سابقہ رسولوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا رہا۔	۱۵ ۸۳-۸۴	۱۹۰	حضرت ابراہیم کے مہان۔	۱۵ ۵۱
۱۹۴	سلسلہ ارض و سماوات کی تعمیری روش انقلاب کی گھڑی کو قریب لارہی ہے۔	۱۵ ۸۳-۸۴	۱۹۰	مہانوں کی گفتگو اور صاحبِ علم بچے کی بشارت۔	۱۵ ۵۲-۵۳
۱۹۴	آپ مخالفین سے حسن کاروانہ انداز سے الگ ہو کر اپنے بدو گرام پر عمل پیرا رہیں۔	۱۵ ۸۳-۸۴	۱۹۱	مہانوں کا بتانا کہ ان کا ہدف حضرت لوط کی قوم ہے۔	۱۵ ۵۴-۵۵
۱۹۴	حضور کو متعدد تاریخی واقعات کا علم عطا کیا گیا جو قرآنِ عظیم میں محفوظ ہے۔	۱۵ ۸۴	۱۹۱	ان کی بیوی کے سوا آل لوط کے لیے نجات ہوگی	۱۵ ۵۴-۵۵
۱۹۸	آپ مختلف لوگوں کے طبعی سامانِ زندگی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں اور عجا مومنین کو اپنے بازوؤں کے نیچے سمیٹتے چلے جائیے۔	۱۵ ۸۸	۱۹۲	مہانوں کی قوم لوط میں آمد۔	۱۵ ۵۴-۵۵
۱۹۸	ادرفریق مخالف کو ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرنے کی سیبتے۔	۱۵ ۸۹	۱۹۲	حضرت لوط سے پیغامِ خداوندی کہ نیری قوم تباہی کے دبانے پر پہنچ چکی ہے آپ اپنے ساتھیوں سمیت یہاں سے نکل جائیں۔	۱۵ ۵۵-۵۶
۱۹۹	مخالفین سارا زور قرآنِ کریم کو جھوٹ، افتراء اور فریبی مخالف کو ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرنے کی سیبتے۔	۱۵ ۹۱-۹۲	۱۹۳	بستی والوں کی مہانوں کو دیکھ کر باچھین کھل گئیں۔	۱۵ ۶۱-۶۲
			۱۹۳	حضرت لوط اور اہل بستی میں تکرار۔	۱۵ ۶۲
			۱۹۳	بستی والے جنسی جذبات کی بدستی میں اندھے ہو رہے تھے۔	۱۵ ۶۲
			۱۹۳	زلزلہ آیا اور ساری بستی تہ و بالا ہو گئی۔	۱۵ ۶۳-۶۴
			۱۹۳	فہم و قراست والوں کے لیے سامانِ عبرت۔	۱۵ ۶۵
			۱۹۳	تباہ شدہ بستی، راہ گذر عام پر۔	۱۵ ۶۶
			۱۹۳	تباہ شدہ بستی کے کھنڈرات میں	۱۵ ۶۶

۲۰۰	ان کی باتیں رسولؐ کو کبیدہ خاطر کرتی تھیں۔	$\frac{۱۵}{۹۷}$	سحر اور کہانت بتلانے پر صرف کرتے
۲۰۱	لیکن آپ اپنے پروگرام کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف رہے۔	$\frac{۱۵}{۹۸}$	ہیں۔ ہم نے انہیں طرح طرح کے مصائب میں مبتلا کیا۔
۲۰۱	اور پورے طور پر اپنے رب کی حکومت اختیار کریں تاکہ قرآن کے حقائق ایک کھوس حقیقت کی شکل میں سامنے آجائیں۔	$\frac{۱۵}{۹۹}$	۱۹۸ عِصْنِین کا مفہوم۔
۲۰۱	اور اس طرح تمام کرمہ ارض خدا کے نظام ربوبیت کے نور سے جگمگا اٹھیں۔		۱۹۹ ان سب کے اعمال کی ضرورت باز پرس ہوگی۔
۲۰۲	انڈکس		۱۹۹ احکام خداوندی پر ثابقت قدمی سے جھے رہیں اور مشرکین سے اعراض برتیں۔
			۲۰۰ مشرکین کے استہزاء سے ہمارا قانون مکافات خود نیٹ لے گا۔
			ہم تیری طرف سے ان کے لیے کافی ہیں۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

مطالب الفرقان، محترم پروفیز صاحب کی تصنیفات کا وہ سلسلہ زریں ہے جو اب کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ابتدائے نگارش سے ان کا یہ مسلک رہا ہے کہ حیاتِ انسانیہ کے ہمہ جہت مسائل کا حل قرآنی ہدایات کی روشنی ہی میں تلاش کرنا چاہیے چنانچہ انہوں نے ”قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن مجید“ پیش کرنا شروع کی۔ اس سلسلہ کی پہلی پانچ جلدیں ان کی زندگی ہی میں پیش نظر قارئین ہو کر دادِ تحسین حاصل کر چکی تھیں، جلد ششم طباعت کے لیے تیار تھی کہ وہ اپنے سفر حیات کی اگلی منزل کی طرف جا رہے ہو گئے چنانچہ یہ جلد ان کے بعد شائع ہوئی۔

محترم پروفیز صاحب نے زیر نظر جلد مفہم کا مسودہ اکتوبر ۱۹۸۲ء دبستر علالت پر فرما کر (بے پہلے ہی مکہ ڈال تھا لیکن کتابت کے لیے اس کی تہنیت کی سعادت اولاً امیر الدین بٹ اور بعد ازاں حسن عباس ضوی مرحوم کے حصہ میں آئی۔ یہ جلد محمد سعید قطبی کی حسن کتابت کی رہنمائی ہے۔ سنیہ شفقت حبیب نے کمالِ دقت کتابت کی تصحیح فرمائی۔ آئینہ مطالب اور ابواب کی فہرستیں شیخ اللہ داتا اور محمد عمر درازی مشترکہ کاوش کا نتیجہ ہیں جبکہ انڈکس پروفیسر رفیع اللہ شہاب کا مرتب کردہ ہے۔

طلوع اسلام ٹرسٹ ان تمام احباب کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے اس کتاب کی ترتیب، تدوین، تحریر، کتابت اور طباعت وغیرہ کے سلسلہ میں دستِ تعاون ارزاں فرمایا۔

بعید از سپاس گزار ہی ہو گا اگر اس تمام عمل کے دوران محترم شیخ عبد الحمید مرحوم کی دیوانگی شوقی کا ذکر نہ کیا جائے جس نے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں مہمیز کا کام کیا۔

حرفِ آخر کے طور پر ہم یہاں محترم پروفیز صاحب کا قرآنِ فہمی سے متعلق اپنا مسلک جو انہوں نے مفہوم القرآن پیش کرتے ہوئے بیان فرمایا تھا، بار دیگر پیش کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔

دو آخر میں پھر اس حقیقت کو دہرا دینا چاہتا ہوں کہ جو کچھ مفہوم القرآن میں پیش کیا گیا ہے وہ مفہم قرآن کی انسانی کوشش ہے اور انسانی کوشش کبھی سہو و خطا سے مستزہ نہیں ہو سکتی، نہ ہی اسے کبھی حرفِ آخر کہا جاسکتا ہے۔ میں نے قرآنِ فہمی کے سلسلہ میں اپنی بصیرت کے مطابق ایک نئی طرح ڈالی ہے، اگر میری یہ کوشش نتیجہ خیز ہوئی تو مجھ سے بہتر صلاحیتیں رکھنے والے اسے واضح سے واضح تر کرتے جائیں گے اور یوں یہ سلسلہ قانونِ کائنات کے مطابق، اپنی ارتقائی منازل طے کرنا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ قرآنِ فہمی کا سلسلہ نہ کسی دور میں ختم ہو سکتا ہے نہ کسی انسان تک پہنچ کر رک سکتا ہے۔ یہ ایک نئے رواں ہے جو لامتناہی دستوں کا امکان رکھتی ہے جو انسانی علم و وسیع ہوگا، قرآنی حقائق پیش از پیش بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا۔ ”حی حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ“

زاہد خانم ڈوانی

انتظامی سہارا

طلوع اسلام ٹرسٹ (دہرا)

۲۵۔ بی، گلبرگ، لاہور، پاکستان

۱۳ فروری ۱۹۹۰ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بارہواں پارہ ————— بارہویں سورۃ



باب اول سورۃ یوسف

حسنِ لقصص

- | | |
|--|--|
| ○ مسندِ بلند پر سرفرازی اور | ○ جمالِ یوسفی۔ |
| ○ حسنِ انتظام۔ | ○ ستاروں کا سجدہ۔ |
| ○ بھائی غلہ لینے آئے۔ | ○ برادرانِ یوسف کی آتشِ حسد۔ |
| ○ شاہی کٹورہ کی گمشدگی اور بھائیوں کے | ○ یوسف درچاہ اور صبرِ یعقوب |
| ○ ترکشِ حسد کا آخری تیر۔ | ○ بازارِ مصر سے عزیز کے محلات میں۔ |
| ○ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ۔ | ○ جذبات بے باک کی دست درازیاں اور |
| ○ تاویلِ الاحادیث۔ | ○ برہانِ رب سامنے رکھنے والے کا کردار۔ |
| ○ خوابوں کی دنیا۔ | ○ غیر فطری تہذیب میں غیرت کا حشر۔ |
| ○ سجدہ۔ | ○ قید خانہ اور وعظِ یوسفیؑ۔ |
| ○ دعوتِ الی اللہ علی وجہ البصیرت۔ | ○ بادشاہ کا خواب اور حضرت یوسفؑ |
| ○ رسولؐ کی سنت۔ | ○ کی تعبیر۔ |
| ○ داستانِ یوسفؑ۔ | ○ رہائی سے قبل (عورتوں کے) معاملہ |
| ○ سامانِ عبرت و موعظت۔ | ○ کی تحقیق کا مطالبہ۔ |

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بابِ اَوَّل

سُورَةُ يُوسُفَ

بارہویں سورۃ

جمالِ یوسفی

(حسنِ سیرت کی رعنائیاں)

مطالعہ الفرقان، جلد سوم (صفحہ ۵۲) میں بتایا جا چکا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کس طرح اپنے وطن مالو سے ہجرت کر کے کنعان اور شام کے علاقہ میں آئے۔ وہاں انہوں نے ایک مملکت قائم کی جو آل ابراہیم تک قائم رہی (۲۶)۔ ان کے چھوٹے بیٹے حضرت اسحاقؑ تو اس مملکت کے نگران رہے لیکن بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو حجاز میں بسایا گیا جہاں تولیتِ کعبہ کی نہایت استقامت طلب خدمت ان کے سپرد ہوئی حضرت اسحاقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ بھی کنعان میں رہے لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ ان کے زمانے میں مملکت ہموٹ کر قبیلہ کی سرداری تک محدود ہو گئی تھی۔ قرآن کریم میں حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا تفصیلی ذکر نہیں آیا، صرف ان کا شمار زمرہ انبیاء میں کیا گیا ہے۔ (۱۳۶، ۱۳۷) حضرت یعقوبؑ کے بیٹے حضرت یوسفؑ تھے جن کی داستانِ جمیل و جلیل ان صفحات کے لیے وجہ زینت بن رہی ہے۔ میں نے اس داستان کو اپنی کتاب 'جوتے نور' میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ جو کچھ اب بیان کیا جانے گا وہ بیشتر اسی سے مقتبس ہوگا۔

داستان حضرت یوسفؑ کے سلسلہ میں دو خصوصیات نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ دیگر انبیاء کرامؑ کے احوال و کوائف قرآن کریم کے مختلف مقامات میں منتشر موتیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں۔ تشریف آیات کے قرآنی اسلوب کے مطابق انہیں چُن چُن کر سلک گہر دار میں پرویا گیا ہے لیکن حضرت یوسفؑ کی داستان ایک ہی سُورۃ میں مسلسل بیان ہوئی ہے۔

دوسرے یہ کہ دیگر اولوالعزم انبیاء کرامؑ کی داستانیں ان انقلابات کے تذکرے ہیں جو انہوں نے برپا کیے اس سلسلہ میں ان انبیاء کرامؑ سے کہیں زیادہ ان اقوام کے احوال و کوائف مذکور ہیں جنہوں نے ان کی دعوتِ حق و صداقت کی مخالفت کی اور بالآخر تباہ و برباد ہو گئیں۔ داستان حضرت یوسفؑ اس قسم کے کسی تضادم یا انقلاب کا تذکرہ نہیں۔ یہ اس حقیقت کی مظہر ہے کہ ایک فرد کے جو ہر ذاتی، اس کی سیرت کی بلندی اور کردار کی پاکیزگی، اُسے کس طرح خاک نشینی سے اٹھا کر مدارج و مناصبِ انسانیت کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن یہ راہ، صحنِ گلستان کی روش نہیں کہ جس میں انسان رنگینی بہار کے جھوٹے جھوٹا، مچلتا، لوٹتا، اٹھکیا کرتا آگے بڑھتا چلا جائے۔ بلکہ یہ وہ کٹھن راستہ ہے جہاں قدم قدم پر ایسی صبر آزما اور نظر فریب لغزش کی گھاٹیاں آتی ہیں کہ وہاں سے ذرا پاؤں پھسلا اور انسان سیدھا ذلت و خواری کے جہنم میں جاگرا۔ اس راستہ سے ہر کانٹے سے دامن بچاتے اور ہر گھاٹی سے قدم سنبھالتے مردانہ وار صحیح و سلامت آگے بڑھ جانا یقیناً من عزم الامور ہے۔ یہ ہے وہ راستہ جس میں ہر چشم بصیرت کو قدم قدم پر جمالِ یوسفی کی رعنائیاں جلوہ بار نظر آتی ہیں اور وہ قدم قدم پر ان کے نقوشِ پاک کے مستم ذرات کو دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھتی ہے کہ عجب مَوجِ خسرام یار بھی کیا گل کتر گئی!

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ فلسطین کی سرزمین میں حضرت یعقوبؑ کے

لوحِ جبیں میں مستقبل کا آئینہ

ہاں حضرت یوسفؑ کی پیدائش ہوئی۔ لوگ اس بچے کو عام چرواہے سے زیادہ کچھ نہیں جانتے تھے لیکن باپ (حضرت یعقوبؑ) کی حقیقت بین نگاہیں بیٹے کی پیشانی میں کچھ اور ہی جھلکتا دیکھ رہی تھیں۔ وہ اُس کی خداداد ذہانت و فطانت اور سنجیدگی و متانت سے اس کی لوحِ جبیں پر کھلے کھلے الفاظ میں پڑھ رہے تھے کہ دائیہ فطرت اُسے کس طرح مویشیوں کی پاسبانی سے جہانداری و جہانبانی کے طور طریق سکھا رہی ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر بیٹا باپ کی آنکھوں کا تار بن رہا تھا لیکن یہ چیز دوسرے بھائیوں کی آنکھوں

لہ تورات بتاتی ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے (مختلف بیویوں سے) بارہ بیٹے تھے جن میں حضرت یوسفؑ اور بنیامین حقیقی بھائی تھے۔ (باقی رہے)

کانٹا بن کر کھٹک رہی تھی۔ یہیں سے اس قصے کی ابتداء ہوتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے تمہیداً خود قرآن مجید کا خصوصی تعارف کرایا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿۱۲﴾ **الَّذِي نَزَّلَ عَلَيْكَ فِي الْكِتَابِ الْبَيِّنَاتِ ۖ إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَذَا الْقُرْآنَ ۖ وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمَنَّ**

الْغٰفِلِينَ ﴿۱۳﴾

خدا نے علیم و رحیم کا ارشاد ہے کہ یہ ایک واضح ضابطہ قوانین کی کتاب ہے (۱) ہم نے قرآن کو واضح اور فصیح اس لیے بنایا ہے کہ تم اچھی طرح سمجھ بوجھ سے کام لے سکو، تاکہ تم عقل سے کام لینا سیکھو۔ یعنی نزول قرآن کا مقصد انسانی عقل کو جلا دینا ہے (۲) اسے رسول! ہم اس قرآن کو، تم پر وحی کے ذریعہ نازل کر کے، تم سے انبیاء سابقہ اور اقوام گزشتہ کی سرگزشتیں بہترین طریق پر بیان کرتے ہیں۔ وہ سرگزشتیں جن سے تم نزول قرآن سے پہلے باخبر نہیں تھے۔ (انہی میں یوسف کی سرگزشت ہے جسے اب بیان کیا جاتا ہے)۔ ﴿۱۳﴾

آیات کا مفہوم تو واضح ہے لیکن آیت نمبر ۲ میں ایک ایسی عظیم حقیقت آگئی ہے جس سے یوسف آگے بڑھ جانے کو جی نہیں چاہتا۔ کہا گیا ہے کہ **إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا**۔ قرآن کا اسلوب بیان نہایت واضح، صاف اور سلیجھا ہوا ہے۔ اس میں کوئی بیج و خم نہیں، کسی قسم کا ابہام نہیں۔ یہ رہی قرآن کے اسلوب بیان کی خصوصیت۔ اس کے بعد ہے: **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ**۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے: تاکہ تم سمجھ سکو، یا سمجھ جاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن کا اسلوب بیان ایسا نہیں کہ یہ خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس کے لیے قرآن کے طالب علم کو خود کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ جس طرح (مثلاً) خارج میں روشنی ہو تو دیکھنے والے کے لیے اس سے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی آنکھ کھلی رکھے۔ اس کے بعد سب کچھ خود بخود نظر آنے لگ جاتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲) اور بنیائیں سب سے چھوٹے تھے حضرت یوسف کی طرف باپ کا میلان خصوصی، سوتیلے بھائیوں کی آتش حدود

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ کا یہ مفہوم حقیقت اور منشاء قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن کریم خود بخود سمجھ میں نہیں آجاتا۔ اس کے لیے کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اور اس حقیقت کو قرآن نے ایک لفظ میں سمو کر رکھ دیا۔ "تَعْقِلُونَ" فعل کا صیغہ ہے۔ اور فعل اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ فاعل وہ کام کرے۔ جہاں تک میری نگاہ یا وری کرتی ہے لفظ عقل کو فعل کے طور پر کسی زبان میں استعمال نہیں کیا گیا۔ کم از کم اُردو میں تو قطعاً نہیں۔ اس لیے تَعْقِلُونَ کا ایک لفظ میں ترجمہ ہو نہیں سکتا۔ یہی اس قبیل کے دیگر الفاظ کا ترجمہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ۔ (۱۳۴)۔ "اس طرح خدا نے اپنی آیات کو واضح طور پر بیان کر دیا تاکہ تم ان پر غور و فکر کر سکو" لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ کا مفہوم کچھ اس قسم کے الفاظ میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ "تاکہ تم عقل سے کام لے سکو" تاکہ تم عقل کو بروئے کار لا سکو؛ اس مفہوم کی وضاحت اس قسم کی آیات میں کر دی جہاں کہا۔ صَمُّ بِكُمْ عَمَىٰ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ۔ (۱۳۵)۔ "یہ لوگ بہرے، گونگے، اندھے بنے رہتے ہیں اور عقل و فکر سے کام نہیں لیتے" اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے "عقل" ایک صلاحیت ہے جو خود بخود کام نہیں کرنے لگ جاتی۔ اس سے کام لیا جائے تو وہ اپنا منصب ادا کرتی ہے، کام نہ لیا جائے تو بیکار رہ جاتی ہے۔ اس صلاحیت کو قرآن نے قلب کہہ کر پکارا ہے، جہاں کہا ہے: فَتَكُونُ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا (۱۳۶)۔ "تاکہ ان کی عقل سے کام لینے کی صلاحیت بیدار ہو" گویا قلب وہ ذریعہ ہے جس سے انسان عقل کو بروئے کار لاتا ہے۔ مقصد اس بحث کا یہ ہے کہ عقل انسانی (آنکھ کی بینائی یا سماعت کی طرح) ایسی صلاحیت نہیں جو خود بخود بروئے کار آجائے۔ اسے بروئے کار لانا پڑتا ہے۔

اس گفتگو سے واضح ہے کہ :

۱۔ کسی بات کے سمجھانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا اسلوب بیان واضح، صاف، نکھرا اور سلجھا ہوا ہو۔ قرآن کریم نے اسی لیے بار بار کہا ہے کہ اس کا انداز بیان نہایت واضح اور مبین ہے۔

۲۔ لیکن اس کے انداز بیان کے واضح اور مبین ہونے کے معنی یہ نہیں کہ اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے انسان کو خود کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ اسے اپنی عقلی صلاحیت کو استعمال کرنا پڑے گا۔ جو ایسا نہیں کرے گا، قرآن کے اسلوب بیان کی وضاحت اُسے کچھ فائدہ نہیں دے گی۔ یہ اُس قوم کے لیے منفعت بخش ہے جو عقل سے کام لے۔ كَذَلِكَ نَفَصَّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (۱۳۷)۔

اسی سورۃ میں چار آیات آگے چل کر کہا گیا ہے: لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٍ لِّلسَّالِكِينَ (۱۳۸)

یوسفؑ اور اس کے بھائیوں کی اس داستان میں اُن لوگوں کے لیے عبرت و موعظت کی نشانیاں ہیں جو حقیقت کے متلاشی اور صداقت کے جو یا ہوں، جنہیں اس کی احتیاج ہو؛ اس سے قرآن نے یہ بتایا کہ اس کے متن سے فیض یاب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے دل میں حقیقت تک پہنچنے کی طلب پیدا ہو، اس سے عقل کی صلاحیت بیدار ہوگی اور قرآنی مفاہیم سمجھ میں آئیں گے۔ اس سے آپ اُس قوم کی حالت کا اندازہ لگا لیجئے، جو ساری عمر ناظرہ قرآن پڑھنے میں صرف کر دے۔ ناظرہ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ، ان کے معنی اور مطلب سمجھے بغیر، رٹتے چلے جائیں۔ جو ان الفاظ کو ایک ایک رات میں دُہرا کر (جسے شبینہ کہا جاتا ہے) ثواب باریں حاصل کرتے ہیں جنہیں اس کے مترجم یا مفسر ہونے کا دعویٰ ہو، (یا جو ان تراجم یا تفاسیر کی رُو سے اسے سمجھنے کی کوشش کریں، وہ بھی اپنی عقل و فکر سے کام لینے کی بجائے صدیوں پہلے کے انسانوں کی عقل و فکر کو حرفِ آخر سمجھیں، جو نہ خود سائیلین کے زمرے میں آئیں نہ ”عاقِلین“ کی صف میں، وہ قرآن سے کس طرح نفع یاب ہو سکیں گے؟ قرآن انہی کی سمجھ میں آسکے گا جو انسانی علم، تجربہ، مشاہدہ۔ جس سطح تک وہ پہنچ چکے ہیں۔ اس کی روشنی میں، قرآن کریم کو، خود قرآن کریم کی رُو سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کے لیے دوسروں کے علم و ادراک سے استفادہ کیا جاسکتا ہے لیکن اسے اتھاڑی نہیں سمجھا جاسکتا۔ قرآن کی اتھاڑی خود قرآن ہی ہے۔

﴿۵﴾

اس تمہید کے بعد داستانِ حضرت یوسفؑ کی طرف آئیے، جس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

﴿۱۲﴾ اِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَ

الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ﴿۴﴾

جب یوسفؑ نے اپنے باپ (یعقوبؑ) سے کہا کہ میں نے (خواب میں ۱۱) دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں، اور چاند اور سورج، یہ سب میرے سامنے ٹھکے ہوئے ہیں؛

بیٹے کا خواب سُن کر باپ (حضرت یعقوبؑ) نے کہا:

﴿۱۳﴾ قَالَ يَبْنَئِي لَآ تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلَيَّ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ

كَيْدًا إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿۵﴾

باپنے بیٹے سے کہا کہ اس خواب کو اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا (جو سوتیلے تھے ۱۲/۵) ورنہ وہ تیرے خلاف کسی منصوبے کی خفیہ تدبیریں کرنے لگ جائیں گے حقیقت یہ ہے کہ شیطان (حسد و عداوت کا جذبہ) انسانوں میں تفرق پیدا کر کے، بھائی کو بھائی کا بیری بنا دیتا ہے۔

یہاں دیکھئے، (حضرت) یوسفؑ کے بھائیوں کے حسد کو کس طرح ”شیطان کی عداوت“ کہہ کر پکارا گیا ہے شیطان اور ابلیس کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۹۹ تا ۱۲۸) میں وضاحت سے بیان ہو چکا ہے کہ وہ خود انسان ہی کے بے راہرو جذبات کا نام ہے۔

باپنے بیٹے (حضرت یوسفؑ) سے یہ تاکید کی، اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اسے اُس کا مستقبل کس قدر درخشندہ نظر آ رہا تھا۔ فرمایا:

﴿۱۲/۴﴾ وَكَذَلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ
وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ آلِ يَعْقُوبَ كَمَا أَتَمَّهَا عَلَىٰ أَبَوَيْكَ
مِن قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحٰقَ إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۶﴾

”میں جو تجھ میں مضمحل صلاحیتوں کے آثار دیکھتا ہوں تو اس سے مجھے نظر آتا ہے کہ تیرا پروردگار تجھے کس عظیم مقصد کے لیے منتخب کرے گا اور تجھے ایسی فراست و بصیرت عطا کر دے گا کہ تیری نگاہ معاملات کے انجام و مال تک فوراً پہنچ جائے۔ وہ تجھے اپنی عنایات سے سرفراز کرے گا اور تیرے ذریعہ یعقوب کے گھرنے پر انعام نعمت کرے گا، جس طرح اُس نے، اس سے قبل، تیرے آباء و اجداد۔ ابراہیمؑ اور اسحاقؑ پر انعام نعمت کیا تھا۔ یقیناً تیرا پروردگار ہر بات سے واقف ہے اور اس کے فیصلے حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔“

”تاویل الاحادیث“ سے کیا مراد ہے، اس کی وضاحت آگے چل کر کی جائے گی۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتایا جائے گا کہ حضرت یوسفؑ پر انعام نعمت کس طرح ہوا۔

اس کے بعد بتایا کہ حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائیوں پر کیا گزری۔ لیکن پہلے یہ واضح کر دیا کہ قرآن کریم کوئی تاریخ کی کتاب نہیں جس میں ازمنہ گزشتہ کے احوال و کوائف محض واقعات کے طور پر درج ہیں۔ یہ انسانی زندگی

کے لیے ضابطہ حیات ہے اور تاریخی شواہد اس ضابطہ کے کسی نہ کسی گوشہ کی تشریح و تائید کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) فرمایا:

﴿۱۲﴾ لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٍ لِّلسَّاعِلِينَ ﴿۹﴾

آگے بڑھنے سے پہلے، اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس فقرے، یوسف اور اس کے بھائیوں کی آویزش کی داستان بیان کرنا مقصود نہیں، اس میں ہر اس شخص کے لیے عبرت و موعظت کی واضح نشانیاں ہیں جو اپنے آپ کو ان نشانیوں کا ضرورت مند سمجھے۔ (سب سے پہلے تو خود رسول اللہ اور جماعت مومنین کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ جس مشن کو لے کر یہ اُٹھے ہیں، اس میں انھیں سب سے پہلے اپنے بھائی بندوں کی طرف سے طرح طرح کی تکالیف پہنچیں گی، لیکن انجام کار کامیابی انھیں ہی حاصل ہوگی)۔

حضرت یوسف کے بھائیوں نے، شدتِ حسد و عداوت کی بنا پر، یہ اسکیم تیار کی کہ کسی نہ کسی طرح اس کانٹے کو الگ کر دیا جائے۔

﴿۱۲﴾ اِذْ قَالُوا لِيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَيْنَا مِمَّا وَنَحْنُ

عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۸﴾ اِقْتُلُوا يُوسُفَ

أَوْ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِن

بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ ﴿۹﴾

”برادرانِ یوسف، آپس میں کہا کرتے تھے کہ یہ عجیب بات ہے کہ ہمارا باپ، ہماری نسبت یوسف اور اُس کے (حقیقی) بھائی سے زیادہ محبت کرتا ہے، حالانکہ ہمارا جھٹہ بڑا ہے اور اس اعتبار سے ہماری قوت بھی زیادہ ہے۔ یقیناً اس باب میں ہمارا باپ بڑی غلطی کرتا ہے۔“

چنانچہ انھوں نے باہمی مشورہ کیا کہ اس مصیبت کا حل یہ ہے کہ یوسف کو قتل کر دیا جائے یا کسی دُور دراز جگہ پھینک دیا جائے تاکہ، اس کے بعد، باپ کی ساری توجہ ہماری طرف مبذول ہے۔

اور ہمارے سارے کام سنور جائیں“

آیت کے آخر میں ”صالحین“ کا لفظ غور طلب ہے۔ ہمارے ہاں صالحین کا ترجمہ خدا کے نیک بندے اور اعمالِ صالحہ سے مُراد نیک کام لیے جاتے ہیں۔ اس آیت کا مفہوم اگر یہ لیا جائے کہ اُنھوں نے کہا کہ یوسف کو باپ سے الگ کر دیا جائے تاکہ اس کے بعد باپ کی ساری توجہ ہماری طرف مبذول رہے اور اس طرح ہم نیک بندے بن جائیں“ تو اس سے بات نہیں بنتی۔ اُنھوں نے کہا یہ تھا کہ اس وقت حالت یہ ہے کہ باپ کی ساری توجہ یوسف پر مرکوز رہتی ہے جس سے ہمارے حالات اُتر رہتے ہیں۔ یہ رکاوٹ دُور ہو جائے تو ہمارے حالات سنور جائیں گے۔ ”صُلِحْ، اَصْلِحْ، صَالِحٌ“ وغیرہ سے مُراد حالات کا سُدھرنا اور سنور جانا ہوتے ہیں۔ اعمالِ صالحہ سے مراد ایسے کام اور ایسا نظام ہے جس میں انسانی ذات بھی سنور جائے اور معاشرہ میں بھی ہمواریاں پیدا ہو جائیں۔ فرد اور معاشرہ دونوں کی اصلاح ہو جائے (اس کی تشریح مطالبُ الفرقان۔ جلد اول ص ۳۳ میں گزر چکی ہے)۔

تورات میں ہے کہ ان میں سے ایک بھائی (روبن) نے کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو، کسی اندھے کنوئیں میں پھینک دو۔ قرآن کریم میں ہے :

﴿۱۲﴾ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا يُوسُفَ وَالْقُوَّةُ فِي غَيْبِ الْجَبِّ

يَلْتَقِطُهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فَعِلٰلِيْنَ ﴿۱۰﴾

”ان میں سے ایک نے کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو۔ اگر تم نے اس کے خلاف ضرور کچھ کرنا ہی ہے تو اسے کسی اندھے کنوئیں کی گہرائی میں پھینک دو۔ کوئی راہ گیر قافلہ ادھر سے گزرتا ہوا اسے نکال کر لے جائے گا اور اس طرح تمہارا مقصد حاصل ہو جائے گا“

اس سازش کے بعد وہ باپ کے پاس آئے۔

﴿۱۲﴾ قَالُوا يَا أَبَانَا مَا لَكَ تَأَمَّنَّا عَلَىٰ يُوسُفَ وَإِنَّا لَهُ لَنَاصِحُونَ ﴿۱۱﴾

أَرْسَلَهُ مَعَنَا غَدًا يَّزْتَعُّ وَيَلْعَبُ وَإِنَّا لَهُ لَحَفِظُونَ ﴿۱۳﴾

”(چنانچہ اس اسکیم کو سنبھالنے پر باپ کے پاس آکر کہنے لگے کہ ابا جان! یہ کیا بات ہے کہ آپ یوسف کے معاملہ میں ہم پر اعتماد نہیں کرتے اور اُسے ہمارے ساتھ کہیں آنے جانے نہیں دیتے

حالانکہ ہم اس کے دلی خیر خواہ ہیں۔

ہم کل باہر جا رہے ہیں، اسے بھی ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ یہ کھائے پیئے، کھیل تفریح کرے۔
ہم سب اس کی حفاظت کریں گے۔“

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ کی خصوصی تربیت کے لیے اسے اپنے قریب رکھتے تھے، لیکن دوسرے بیٹے اسے عدم اعتماد پر محمول کرتے تھے اس لیے انہوں نے باپ سے شکایت کی کہ وہ اس باب میں ان پر اعتماد کیوں نہیں کرتے۔ اس پر حضرت یعقوبؑ نے کہا کہ بات عدم اعتماد کی نہیں۔

﴿۱۲﴾ قَالَ اِنِّي لَيَحْزُنُنِيۤ اَنْ تَذٰهَبُوۡا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ
الذَّيْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوۡنَ ﴿۱۳﴾

”باپ نے کہا کہ بے اعتمادی کی بات نہیں، مجھے خطرہ یہ ہے کہ تم اسے جنگل میں سیر و تفریح کیلئے ساتھ لے جاؤ، اور ذرا سی غفلت برتو، تو اسے بھیڑیا کھا جائے۔“

قرآن کریم نے اس کی تصریح نہیں کی کہ اُس وقت حضرت یوسفؑ کی عمر کیا تھی۔ حضرت یعقوبؑ کے بیان کردہ خدشہ سے مترشح ہوتا ہے کہ اُن کی اُس وقت عمر کچھ زیادہ نہیں تھی۔ تورات کا بیان ہے کہ اُس وقت اُن کی عمر سترہ برس کی تھی۔

یعقوبؑ کا احوال یہ ہے کہ یوسفؑ سترہ برس کا ہو کے اپنے بھائیوں کے ساتھ گلہ چراتا تھا اور

وہ جوان اپنے باپ کی جوڑوؤں، بلہاہ اور زلفا کے بیٹوں کے ساتھ رہتا تھا اور یوسفؑ اُن کے

باپ کے پاس اُن کے بڑے کاموں کی خبر لاتا تھا۔ (پیدائش - ۲۶)

لیکن قرآن کریم میں بیان کردہ حضرت یعقوبؑ کے خدشہ سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ بہر حال باپ کے اس خدشہ پر بیٹوں نے کہا:

﴿۱۲﴾ قَالُوۡلِیۡنَ اَكَلَهُ الذَّيْبُ وَاِنَّا اِذَا الْخَسِرُوۡنَ ﴿۱۳﴾

انہوں نے کہا کہ آبا جان! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اگر ہمارے اتنے بڑے جتنے کی موجودگی میں بھی اسے بھیڑیا کھا گیا تو حیف ہے ہمارے جینے پر! اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ ہم بالکل ہی گئے گئے

ہو گئے ۱۱

گمہ بانی کی زندگی میں بھیڑیوں کے حملے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی۔ حضرت یعقوبؑ نے اس خیال سے خدشہ ظاہر کیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بیٹوں کی بدخواہ طبیعت نے اس چیز کو اپنے سلسلہ مکر و فریب کی ایک کڑی بنانے کے لیے گرہ میں باندھ لیا۔ بھائی انہیں ساتھ لے گئے اور اپنی طے شدہ خفیہ تجویز کے مطابق حضرت یوسفؑ کو ایک اندھے کنوئیں میں گرا دیا۔

﴿۱۲﴾ **فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَاجْتَمَعُوا أَن يَجْعَلُوهُ فِي غِيَابِ الْجُبِّ** ﴿۱۵﴾

چنانچہ وہ یوسفؑ کو ساتھ لے گئے، اور سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ اسے گہرے کنوئیں میں گرا دیا جائے۔

ذرا اندازہ لگائیے اس جگرگداز سانحہ اور ہوش ربا منظر کا، کہ باپ کا چہیتا بیٹا، اپنے بھائیوں کے ہاتھوں زندہ درگور کیا جا رہا ہے۔ اس بھیانک قبر میں حضرت یوسفؑ کے دل پر کیا گزری ہوگی؟ لیکن اُدھر اُنہوں نے حضرت یوسفؑ کو (بزعم خویش) دُنیا کے تمام اسباب و علائق سے منقطع کیا اور اُدھر اسباب و علل کے مالک حقیقی نے فوراً وحی بھیجی کہ مت گھبراؤ!

﴿۱۲﴾ **وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَهُمْ بِأَمْرِهِمْ هَذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ** ﴿۱۵﴾

» عین اُس وقت جب وہ یوسفؑ کو کنوئیں میں گرا رہے تھے، ہم نے اُسے وحی کے ذریعہ بتا دیا کہ تم بالکل نہ گھبراؤ، تم صحیح و سلامت رہو گے۔ اور اس کے بعد ایک دن ایسا آئے گا کہ تم انہیں بتاؤ گے کہ اُنہوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا کیا تھا اور اُن کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ تم زندہ کیسے رہ گئے اور اس مقام تک کیسے پہنچ گئے۔ « (۱۲/۱۵)

مکر و فریب کے یہ سنگدل مجسمے شام کے قریب گھر لوٹے لیکن عجیب ڈھونگ بھائیوں کی واپسی رچائے ہوئے:

﴿۱۲﴾ **وَجَاءُوا أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ** ﴿۱۷﴾

» (یوسفؑ کو کنوئیں میں گرا دینے کے بعد) وہ رات کو اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے اور کہا:

﴿۱۲﴾ قَالُوا يَا بَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوسُفَ عِنْدَ
مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ
كُنَّا صَادِقِينَ ﴿۱۲﴾

”اور کہا کہ ابا جان! ہم جنگل میں گئے تو یوسف کو سامان کے پاس بٹھا دیا اور ہم دوڑ میں مصروف ہو گئے کہ دیکھیں، کون آگے نکلتا ہے۔ اتنے میں ایک بھیڑیا آیا اور اُس نے یوسف کو پھاڑ کھایا۔ ہم جانتے ہیں کہ خواہ ہم کتنے ہی سچے کیوں نہ ہوں، آپ ہماری بات کا یقین نہیں کریں گے۔ لیکن واقعہ یہی ہے جو ہم نے آپ سے بیان کر دیا ہے۔“

آیت کے آخری ٹکڑے پر پھر نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ برادرانِ یوسف کے قلبِ خائن (GUILTY CONSCIENCE) کی دھڑکنیں اُن کے مکرو فریب کے چلمنی پردوں سے کس طرح پھٹ پھٹ کر باہر آرہی ہیں۔ ”اگرچہ ہم کتنے ہی سچے کیوں نہ ہوں، آپ تو ہمارا یقین کریں گے ہی نہیں۔“ نفسِ نیم شعوری (SUBCONSCIOUS MIND) کی بے تابانہ لیکن غیر محسوس کیفیت کا ایسا نقشہ قرآن کریم کے اسلوبِ بیان کی خصوصیت ہے۔ انہوں نے فریب کارانہ طور پر رونادھونا بھی شروع کیا اور ساتھ ہی اس مکر کی تکمیل کے لیے حضرت یوسف کے کُرتے پر جھوٹے موٹے کاغذ بھی لگا لائے تاکہ اسے بطور شہادت پیش کر دیا جائے :

﴿۱۳﴾ وَجَاءُوا عَلَى قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ ط

اور وہ یوسف کے کُرتے پر جھوٹے موٹے کاغذ بھی لگا کر ساتھ لے آئے تھے۔ انہوں نے اپنی طرف سے تو اس سوانگ میں کسی قسم کی کوئی کسر نہ چھوڑی لیکن ایک صاحبِ فراست کی نگاہِ بصیرت کے لیے اس قسم کے جھوٹ اور سچ میں فسق کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ حضرت یعقوب نے فرمایا کہ کیوں یونہی باتیں بنا رہے ہو یہ ساری کہانی تمہارے فریبِ نفس کے سوا کچھ نہیں۔

﴿۱۴﴾ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا فَصَبْرٌ جَبِيلٌ ط وَاللَّهُ

الْمُسْتَعَانُ عَلَى مَا تَصِفُونَ ﴿۱۴﴾

”باپ نے اس داستان کو سن کر اور کُرتے کو دیکھ کر کہا کہ یوسف کو بھیڑیے نے بالکل نہیں کھایا۔ یہ سب تمہاری خود ساختہ کہانی ہے، جسے تمہارے فریبِ نفس نے تمہیں بڑا خوشنما بنا کر دکھایا ہے (کہ یہ تدبیر بڑی کامیاب رہے گی)۔ بہر حال، میرے لیے یہی بہتر ہے کہ میں صبر اور بہتت سے کام لوں (اور گھر کا شیرازہ بکھرنے نہ دوں) اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو، اس پر خدا سے مدد مانگوں“

اُدھر یہ ہو رہا تھا، اُدھر ایسا ہوا کہ ایک قافلہ کا گزر اس راستہ سے ہوا جس پر وہ کنواں پڑتا تھا جس میں حضرت یوسف کو گرایا گیا تھا۔

﴿۱۲﴾ وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَى دَلْوَةً قَالَ يَبْنَئِي

هَذَا غُلْمًا وَاسْتَرَوْهُ بِضَاعَةٍ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿۱۹﴾

”اُدھر ایسا ہوا کہ جنگل میں ایک قافلہ آیا اور انہوں نے اپنے پیش رس کو پانی کی تلاش میں بھیجا۔ وہ اس کنوئیں پر پہنچا اور اس میں ڈول لٹکایا۔ (نیچے سے یوسف نے آواز دی۔ اُس نے کنوئیں میں جھانکا تو دیکھا کہ وہاں ایک لڑکا ہے)۔ اُس نے دوسرے افراد کا روال کو آواز دی اور کہا کہ ایک خوشخبری سنو! کنوئیں سے ایک لڑکا ملا ہے۔ انہوں نے اُسے چھپا کر رکھ لیا کہ کہیں دُور لے جا کر فروخت کرینگے۔ انہوں نے یہ کچھ لوگوں کی نگاہوں سے چھپا کر کیا۔ لیکن خدا تو سب کچھ دیکھ رہا تھا۔“

تِزَات ہیں ہے کہ یہ قافلہ اسمعیلی عربوں کا تھا جو اپنا سامان تجارت لے کر مصر جا رہا تھا۔ نیز یہ کہ حضرت یوسف کے بھائیوں نے انھیں بیس سکوں کے عوض قافلہ والوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ لیکن قرآن کریم کا یہ بیان ہے کہ اہل قافلہ نے انھیں چھپا کر رکھ لیا تھا کہ ان کا کوئی دعویدار نہ آسکے۔ آج بھی خانہ بدوش قبائل جو اس قسم کی بردہ فروشی کرتے ہیں، ہاتھ پڑے بچوں کو اسی طرح چھپا کر کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں۔

اب حضرت یوسف کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہونا ہے (اور اندازہ لگاتے کہ کس رُوح فرسا مرحلہ سے شروع ہوتا ہے) ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ فلسطین کی زندگی بدوی زندگی تھی، جیسے جنگلوں میں مویشی چرانے والوں کی ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں مصر اس زمانہ میں تمدن و حضارت کی ان بلندلیوں پر تھا کہ آج بھی جب اس کے نوادرات کے زمین دوز و ذیفینے باہر نکلتے ہیں تو چشم حیرت کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے کہ وہ زمانہ اور اس قسم کے تہذیب و تمدن کے نمونے! جس طرح آج بھی شہروں کی ”مہذب“ آبادی کے نزدیک گاؤں والوں کی غیر مہذب زندگی انفرت کی نگاہ سے

دیکھی جاتی ہے۔ اہل مصر، اپنے گرد و پیش کے چرواہوں کو سخت حقارت سے دیکھتے تھے۔ بہر حال، صحرائی علاقہ کے چرواہوں کا ایک لڑکا مصر کی آبادی میں پہنچتا ہے اور وہ بھی اس انداز سے کہ ایک اجنبی قافلہ والوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہے جو اسے بازار میں جنس کی طرح بیچنے کے لیے لیے جا رہے ہیں۔

﴿۱۲﴾ **وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ**

مِنَ الزَّاهِدِينَ ﴿۲۰﴾

’قافلہ والوں نے، یوسف کو (مصر کے بازار میں) ظلم و تعدی سے جیسا کہ غلاموں کی خرید و فروخت میں ہوا کرتا تھا۔ ویسے بھی انسانوں کی خرید و فروخت قرآن کی رو سے بہر حال ظلم و زیادتی ہے۔ بخیس کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے، معمولی سی قیمت پر جو چند درہموں سے زیادہ نہ تھی، بیچ ڈالا۔ انھوں نے اس کی فروخت میں بے رغبتی سے کام لیا، (اس لیے کہ ایک تو انہیں یہ مال مفت ہلاکتا اور دوسرے انھیں خیال ہوگا کہ اس کا کوئی دعویٰ درج نہ کیا تو مشکل ہو جائے گی)۔“

انہوں نے اس ’غلام‘ کو سربازار فروخت کر دیا اور چونکہ مالِ مفت ہاتھ آ گیا تھا اس لیے اس کی بھی چنداں پڑانہ کی کہ کتنے میں بیک رہا ہے، جو کسی نے دیا، لینے کی کی۔

اللہ اکبر! غلام، اور اس بے قدری سے بچا ہوا غلام ایوں مصر میں داخلہ ہوا۔ تو رات میں ہے کہ جس شخص نے حضرت یوسف کو خریدا تھا، اس کا نام فوطیفار تھا۔

اور مدیانیوں نے اسے مصر میں فوطیفار کے ہاتھ جو فرعون کا ایک امیر اور لشکر کا رئیس تھا، بیچا۔ (پیدائش ۳۳) قرآن کریم نے اسے فقط عزیز (بڑی عزت والا، یا صاحب اختیار) کے لقب سے پکارا ہے کہ مقصد اس کی حیثیت کا تعارف تھا نہ کہ اس کے عہدے کا ذکر۔ عزیز نے حضرت یوسف کو ایک غلام کی حیثیت سے خریدا لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے آپ کی راست بازی، دیانت داری، حسن سیرت اور خدا داد فراست سے اندازہ لگا لیا کہ یہ لڑکا اس قابل ہے کہ اس پر کئی اعتماد کیا جائے اور گھر کا نظم و نسق اس کے سپرد کیا جائے۔ چنانچہ:

﴿۱۷﴾ **وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِّصْرَ لِمَرْأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ**

عَسَىٰ أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا ۗ وَط

”جس شخص نے یوسف کو خرید لیا تھا اُس نے اپنی بیوی سے کہا کہ (اس لڑکے کے ساتھ عام غلاموں کا سا برتاؤ نہ کرنا بلکہ عزت سے رکھنا کیونکہ اس کے چہرے بشرے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی اچھے گھرانے کا لڑکا ہے۔ اس لیے، ہو سکتا ہے کہ یہ ہمارے لیے کسی فائدے کا موجب بن جائے یا ہم اسے اپنا بیٹا ہی بنا لیں۔“

قرآن کریم نے اَکْرَمٰی مَثْوٰی (اسے عزت کے ساتھ رکھو) کہہ کر کہانی کا ایک بہت بڑا حصہ دو لفظوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ یہ حیاتِ یوسفی میں پہلا انقلاب تھا۔ یعنی غلام کی حیثیت سے گھر میں داخل ہونے، اور وہ بھی کنعانی غلام (یعنی مصریوں کے نزدیک ایک گنوار غلام) کی حیثیت سے اور چند ہی روز میں مصر کے ایک بہت بڑے صاحبِ منصب میرے گھر بار کے معتمد علیہ ناظم بن گئے۔

﴿۱۲﴾ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْاَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهُ مِنْ تَاْوِيْلِ
الْاَحَادِيْثِ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾

”اس طرح ہم نے سرزمینِ مصر میں یوسف کے پاؤں جما دیے اور ایسا انتظام کر دیا کہ اُس کی اچھی طرح سے تعلیم و تربیت ہو جائے اور اُس میں معاملہ فہمی اور واقعات سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اللہ اپنی اسکیموں کو کامیاب بنا کر رہتا ہے لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں کہ ایسا کیوں اور کس طرح ہو رہا ہے۔“

ذرا غور کیجئے، مشیت کی تدبیر کو اپنے نقطہ آغاز سے تکمیل تک پہنچنے کے لیے اسباب و علل کی کون کون سی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن عام انسانوں کی نگاہوں سے چونکہ یہ راز پنہاں ہوتا ہے اس لیے وہ تدبیر کی ان کڑیوں کو سمجھ نہیں سکتے۔

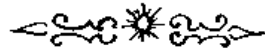
اس طرح حضرت یوسف نے اس جدید ماحول میں پرورش پانا شروع کی :

﴿۱۲﴾ وَلَمَّا بَلَغَ اَشَدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهٗ حِكْمًا وَّعِلْمًا وَّكَذٰلِكَ
نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

”چنانچہ جب یوسفؑ (اس قسم کے ماحول میں تربیت پا کر) جوان ہوا تو وہ کارفرمائی اور جہان داری کے سلیقوں سے واقف اور علم و بصیرت کی فراوانی سے مالا مال تھا۔ (یہ وہ چیزیں تھیں جو اُسے اپنی صحرائی زندگی میں میسر نہیں آسکتی تھیں) لیکن اسے یہ حاصل اس لیے ہو گئیں کہ اُس نے یہاں نہایت حُسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کی تھی۔

جو لوگ بھی اس طرح زندگی بسر کریں، انھیں اس کا ایسا ہی صلہ مل سکتا ہے (وحی البتہ اس طرح نہیں مل سکتی)۔“

سب حضرت یوسفؑ نے عمر کے کچھ اور مراحل طے کر لیے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں کارفرمائی کی قوت اور علم کی نعمت سے سرفراز فرمایا اور یہ سب اُن کے حُسن عمل کی بدولت تھا۔ (وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ) غور کیجئے قرآن کریم نے اس پہلے انقلاب کے ساتھ ہی نگاہوں کو کس طرح قصے سے عبرت و موعظت کی طرف مُلتفت کر دیا۔ یعنی یہ انقلاب یونہی اتفاقیہ سرزد نہیں ہو گیا تھا، بلکہ خدا کے اُس اعلیٰ قانون کے تحت واقع ہوا تھا کہ حُسن سیرت اور پاکیزگی کر دار کا لازمی نتیجہ ایسا ہوتا ہے۔ (وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ)۔



اب اس زریں داستان کی اگلی کڑی شروع ہوتی ہے اور کاروانِ شوق اس وادی میں داخل ہوتا ہے جہاں سیر و کردار کی آزمائش کے لیے ترغیباتِ نفس کے صبر آزما اور نگاہِ فریب مناظر، سامانِ صد ہزار بدامانِ بلبے، دامِ ہمرنگِ زمیں کی طرح چاروں طرف پھرے پڑے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کی عمر اُس وقت بھر پور جوانی کی تھی۔ اُن کا ابتدائی زمانہ تمدنِ حضارت کی اعصاب شکن مصنوعی زندگی سے دُور، دُشت و بیاباں کی کھلی فضاؤں میں گزرا تھا۔ آج بھی اس کا اندازہ لگانا ہو کہ کھلی فضا میں اور سادہ و بیباک زندگی، انسانی حُسن کو کس طرح نکھارتی ہے تو آزاد قبائل کے کسی بچے کو دیکھئے۔ افلاس و غربت کا یہ عالم کہ بدن پر کپڑے نہیں، چھپتھڑے ہیں، لیکن صحت و ندرستی کو دیکھئے تو رگ رگ سے ارغوانی موجیں تلاطم خیز ہیں۔ حُسنِ صحت کا نام ہے اور جب صحت و جوانی یکجا ہو جائیں تو ان کے امتزاج سے جذب و کیف کا ایک ایسا بلوریں مجسمہ وجود میں آجاتا ہے جس میں زندگی اپنی پوری توانائی و رعنائی سے مُترسم دکھائی دیتی ہے پھر رگوں میں خانوادۂ نبوت کا صالح خون، ان تمام خصوصیات کے ساتھ حُسنِ عفت سونے پر سہاگہ تندرست جوانی اگر قلب و نگاہ کی پاکیزگی میں گزرے تو اس کے بڑا حُسن اور کیا ہو سکتا ہے؟۔ یہ ہیں حضرت یوسفؑ۔ اور دوسری طرف عزیز کی بیوی۔ تہذیبِ تمدن کی بیباکیوں کی تخلیق، عشرت و کامرانی کے ماحول کی پروردہ، دولت کی

مذبح کاریوں سے جگمگاتا حسن۔ غرضیکہ دونوں طرف جذب و کشش کے پورے پورے سامان۔ لیکن ایک طرف جذبات نفس کی مکمل حکمرانی اور دوسری طرف ترغیبات نفس پر حدودِ اللہ کی حکمرانی۔ نتیجہ یہ کہ حضرت یوسف کا خیال کبھی بھولے سے بھی ادھر نہ گیا۔ لیکن عزیز کی بیوی کی دل باختگی، آتش خاموش کی طرح سُنگتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ایک دن جوشِ فریفتگی نے شعلہ بیباک کی صورت اختیار کر لی۔ حضرت یوسف مکرے کے اندر تھے۔ وہ عشوہ طراز یوں کا فتنہ مجسم، ہزاروں بجلیاں اپنے دامن نگاہ میں لیے وہاں آہنچی۔ دروازے بند کر لیے اور ناز، ہزار نیا مندلیوں کے ساتھ ایک نگہِ التفات کے لیے ملتجی ہوا۔ قرآن کریم نے اس تمام واقعہ کو چند لفظوں میں سمودیا ہے۔ فرمایا:

﴿۱۲﴾ **وَرَأَوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ وَغَلَّقَتِ
الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ط قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي
أَحْسَنُ مَثْوَايَ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿۱۳﴾**

دو اور جس عورت کے گھر میں یوسف رہتا تھا (یعنی عزیز کی بیوی) وہ اس پر ریجھ گئی۔ لیکن یوسف کی نیت میں کبھی خرابی پیدا نہ ہوئی۔ بالآخر، اُس عورت نے تہیت کر لیا کہ اسے بہلا پھسلا کر مجبور کر دیا جائے کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف اس کی بات مان لے۔ چنانچہ اس نے ایک دن مکان کے تمام دروازے بند کر دیے اور یوسف سے کہا کہ ادھر آؤ۔

یوسف نے کہا کہ معاذ اللہ! (مجھ سے ایسی بات کبھی نہیں ہو سکتی) میرے پروردگار نے مجھے سیرتِ کر دار کے ایسے بلند اور حسین مقام پر پہنچا دیا ہے۔ (کیا تو مجھے اس مقام سے نیچے گرانہ چاہتی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا)۔ یہ تو کھلی ہوئی حدودِ فراموشی ہے اور حدودِ فراموشی انسان کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

لیکن اُس کی آتش جذبات کے شعلے تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔ وہ اس دیوانگی میں سب کچھ بھول کر معاملہ کی انتہائی حد تک پہنچ چکی تھی۔ ذرا غور کیجئے۔ اُس مکرے کے اندر کوئی تیسرا دیکھنے والا نہ تھا۔ جذباتِ نفس کی تسکین کے پورے سامان موجود تھے۔ لیکن وہ کیا چیز تھی جس نے اس سیلابِ انگیزیوں کے باوجود حضرت یوسف کے دامنِ عفت کو ترنہ ہونے دیا! فقط ایک اللہ کا خیال! یعنی اس بات پر ایمان اور غیر متزلزل ایمان کہ جب کوئی اور۔

دیکھنے والا نہ ہو تو ایک ذات ایسی ہوتی ہے جو سب کچھ دیکھتی ہے۔ اس بات کا یقین کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے ہر غلط کام اپنا تباہ کن نتیجہ مرتب کر کے رہتا ہے خواہ اس پر کوئی گرفت کرنے والا ہو یا نہ ہو۔ یہ تھا امرأۃ العزیز اور اور حضرت یوسفؑ میں فرق۔ ایک کی آنکھ پر تحریصاتِ نفس کے گہرے پردے پڑے ہوئے تھے اور دوسرے کی نگہِ حقیقت رُس ایسے خود فراموش ماحول میں بھی قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ رہی تھی ورنہ انسان ہونے کی جہت سے جوانی کی اُمنگیں دونوں طرف تھیں۔ دیکھئے، قرآن کریم نے اس میں فرق کو ایجاز و اختصار کے باوجود کس حسین انداز سے بیان کیا ہے۔ فرمایا:

﴿۱۲﴾ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّهٖ
كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهٗ السُّوْءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا
الْمُخْلِصِيْنَ ﴿۲۳﴾

”لیکن وہ عورت اس بات کا تہیہ کر چکی تھی اور اُس نے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ اگر یوسفؑ کے سامنے اپنے پروردگار کی دُشمندہ و تابندہ اخلاقی قدر نہ ہوتی تو وہ بھی اس پر آمادہ ہو جانا۔ اس اخلاقی قدر کے پیش نظر رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس بے حیائی کے کام سے مجتنب رہا اور بُرائی کا تکب نہ ہوا، اور یوں اُس نے اپنے حُسنِ سیرتِ ثابت کر دیا کہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔ بعد میں اس کا اعتراف و اقرار خود اُس عورت نے بھی کر لیا کہ یوسفؑ کی نیت خراب نہیں ہوئی تھی (۱۳)۔“

داستان اس قدر پُرکِیف، دلکش اور جاذب ہے کہ دلوں کا تقاضا ہے کہ

نگو بھسم مزین، تمانہ شکنی زنگ تماشا را

دآنکھ بھی نہ جھپکو، کہ اس سے رنگینی تماشا میں شکن پڑ جائے گی!

لیکن اِس میں ایک مقام ایسا نازک اور اہم آگیا ہے جس کی وضاحت کیفِ داستان سے بھی زیادہ گراں بہا ہے۔ اس لیے ہم اِس گریز کے لیے معذرت خواہ ہیں۔

آیت نمبر ۲۳ میں ہے: وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۛ ہماری کتب تفسیر میں بالعموم اس کا ایسا مفہوم بیان کیا گیا ہے جس سے داہنِ یوسفؑ تازنار ہو جاتا ہے۔ ان مفاہیم کا مخلص

یہ ہے کہ اُس عورت نے غلط اقدام (بدکاری) کا ارادہ کر لیا اور حضرت یوسفؑ نے بھی اس کا ارادہ کر لیا لیکن وہ اس عملاً باز رہے کیونکہ انھوں نے ”برہانِ رب“ دیکھ لی تھی۔ ایسا کہنے والوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ فعلِ بد کا قصد و ارادہ، عملِ بد سے کم معصیت نہیں ہوتا۔

قرآنِ کریم کی رو سے قصد و ارادہ کو کس قدر اہمیت حاصل ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اُس نے قتلِ عمد (بالارادہ) کی سزا موت مقرر کی ہے اور قتلِ خطا (بلا ارادہ) کے لیے صرف خون بہا (دیت) ادا کرنے کا کہا ہے (۹۳، ۹۴)۔ اُس نے عام معاشرتی معاملات میں بلا ارادہ لغزش کو قابلِ مواخذہ قرار نہیں دیا۔ قابلِ مواخذہ وہ ہے جس میں دل کا ارادہ شامل ہو۔ (مَا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ ۚ ۳۳)۔ اس کی تائید اس دُعا سے بھی ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ۔ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا ۗ (۲۱۶)۔ یعنی جو لغزش سہوایا بلا ارادہ ہو جائے اس پر مواخذہ نہ ہو۔ اس سلسلہ میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے ظلم سنگین جرم ہے لیکن ظلم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ظلم وہ ہے جو دُور سے پر کیا جائے۔ دُورِ ظلم وہ ہے جو خود اپنے آپ پر کیا جائے۔ (وَلَكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۲۱) اسے ایک مثال سے سمجھیے۔ کسی شخص پر آپ بلا ارادہ زیادتی کرتے ہیں۔ اس زیادتی کا جو اثر اُس پر ہوا وہ تو اُس پر ظلم ہوا۔ لیکن اس کا جو اثر آپ کی ذات پر ہوا، وہ آپ کا اپنے آپ پر ظلم ہے۔ دُوسری شکل یہ ہے کہ آپ کسی کے خلاف بلا ارادہ زیادتی سرزد ہو گئی۔ اس سے اُس پر تو ظلم ہوا ہے مگر آپ کا اپنے آپ پر ظلم نہیں ہوا۔ تیسری شکل یہ ہے کہ آپ نے کسی پر زیادتی کا ارادہ کیا لیکن وہ زیادتی عمل میں نہیں آئی۔ اس سے اُس شخص پر تو ظلم نہیں ہوا، لیکن آپ کا اپنے آپ پر ظلم ہو گیا ہے۔ قصۃ زبیرِ نظر میں، اس عملِ شنیع کا ارتکاب تو نہیں ہوا، لیکن وہ عورت مجرم قرار پائی کیونکہ اُس نے اس کا ارادہ کیا تھا۔ اگر حضرت یوسفؑ کے منقلب بھی یہ خیال کر لیا جائے کہ انھوں نے بھی اس کا ارادہ کر لیا تھا تو ان میں اور اُس عورت میں فرق کیا ہوگا۔ لہذا یہ کہنا کہ حضرت یوسفؑ نے بھی اس کا ارادہ کر لیا تھا لیکن وہ اپنے ارادے کو عمل میں نہ لاسکے کیونکہ انہوں نے اپنے رب کی برہان دیکھ لی تھی، ایک نبی کے شایانِ شان نہیں۔

پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ حضرت یوسفؑ نے پہلے فقرہ میں کہا ہے: (۱) مَعَاذَ اللَّهِ! میں تو انینِ خداوندی اور اقدارِ الہیبہ کی پناہ طلب کرتا ہوں؛ پھر کہا: (۲) إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ۔ میرے رب نے مجھے حُسنِ سیرت سے نوازا ہے۔ میں اس آئینے کو کس طرح داغدار کر سکتا ہوں؟ اور اس کے بعد کھلے الفاظ میں خدا کا یہ فیصلہ کہ: (۳) إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ۔ اس کے نانوںِ مکافات کی رو سے ظالم کبھی پینپ نہیں سکتا۔

اور زنا تو صریح ظلم ہے۔۔۔ ان نظریات کا حامل اور ان ارادوں کا مالک یوسفؑ کبھی نفسِ کاری کا قصد کر سکتا تھا؟۔ (معاذ اللہ!۔ ثم معاذ اللہ)۔ آیت کا مطلب واضح ہے کہ حالات ایسے پیدا ہو چکے تھے کہ جس طرح عزیز کی بیوی اس اقدام کا قصد کر چکی تھی (کیونکہ اُس کے سامنے اقدارِ خداوندی نہ تھیں) اسی طرح اگر فریقِ مقابل بھی ایسا ہی ہوتا جس کے سامنے اقدارِ خداوندی نہ ہوتیں، تو وہ بھی اس کا قصد کر لیتا۔ لیکن حضرت یوسفؑ کے سامنے چونکہ بُرہانِ خداوندی تھی، اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اس کا قصد کرتے۔ قرآن کریم نے یہاں دو رجحاناتِ قلبی کا فرق نمایاں کیا ہے۔ ایک اُس کا رجحان جو کسی بلند قدر کا پابند نہ ہو۔ دوسرا اُس کا جو اپنے آپ کو ان اقدار کا پابند سمجھے۔ اول الذکر کی نظیر عزیز کی بیوی کی تھی ثانی الذکر کی آئینہ دار سیرتِ یوسفؑ!

(حضرت) یوسفؑ نے جو "بُرہانِ رب" دیکھی تھی اس کے متعلق بھی ہماری کتبِ تفاسیر میں عجیب و غریب افسانے ملتے ہیں۔ ان میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ:

حضرت یوسفؑ نے اپنے والد (حضرت یعقوبؑ) کو دیکھا کہ وہ اپنی انگلی منہ میں ڈالے کھڑے ہیں اور

حضرت یوسفؑ کے سینے پر اُس نے ہاتھ مارا۔ (تفسیر ابن کثیر۔ بارہواں پارہ ص ۱۴)

اللہ تعالیٰ نے اپنے ضابطہٴ اقدار و قوانین (قرآن) کو بُرہانِ مَن رَّبِّکُمْ دیکھ کر پکارا ہے (ہجرت)۔ اس لیے خدا کا ہر حکم، اُس کا ہر قانون، اُس کی ہر قدر بُرہانِ خداوندی ہے۔ حضرت یوسفؑ نے جو کہا تھا کہ اِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ (۱۲/۱۶)، تو یہ سب بڑی بُرہانِ خداوندی تھی جو اُن کے پیشِ نظر تھی اور اس سے وہ اس غلط اقدام کے قصد سے باز رہتے۔

اور سب بڑی دلیل وہ ہے خود خدا نے اِن الفاظ میں بیان کر دیا کہ اِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلِصِينَ (۱۲/۱۶)

وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا جن کے متعلق خود ابلیس نے کہا تھا:

قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَتَّبِعَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَا غَوِيَّةَ لَهُمْ أَجْمَعِينَ ۝

إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ (۱۲/۳۹)

”اُس نے کہا کہ اے میرے پروردگار! تو نے مجھے جو اس طرح زندگی کی سعادتوں سے محروم کر دیا اور مجھ پر

خوشگوار یوں کی راہ مسدود کر دی تو میں بھی اب ایسا کروں گا کہ انسانوں کو، ان کی طبعی زندگی کے

مفاد و اسباب اس طرح خوشنما بنا کر دکھاؤں گا کہ وہ اُنہی میں الجھ کر رہ جائیں اور انسانی زندگی کے

بلند مقاصد کو یکسر نظر انداز کر دیں (اور یوں) میری طرح یہ بھی زندگی کی حقیقی سعادتوں سے محروم رہ

جائیں۔ (۳۹)

ہاں جو تیرے مخلص بندے ہوں گے اُن پر میرا زور نہیں چل سکے گا۔ (وہ اپنے آپ کو وحی کے تابع رکھیں گے، اس لیے سرکش جذبات ان پر غالب نہیں آسکیں گے) (۳۷)

اور خدا نے کہا تھا کہ :

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَن اَتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ . (۱۵)

”میرے (ان) مخلص (بندوں) پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکے گا، نیز غلبہ انہی پر ہو سکے گا جو اس متوازن راہ کو چھوڑ کر تیرے پیچھے لگ جائیں“

اس لیے حضرت یوسف ان نظر فریب مناظر کے دام تزیور میں کس طرح آسکتے تھے! اللہ کے بندے ان تمام خاردار جھاڑیوں سے اپنا دامن صاف بچا کر نکل جاتے ہیں۔

بندہ را کہ بفرمانِ خدا راہ رود

نگارند کہ در بند زلیخا ماند (غالب)

~~~~~ ❁ ~~~~~

اب آئیے اس داستان نور و نکہت کی اگلی کڑی کی طرف۔ (حضرت) یوسف کے انکار پر وہ عورت جذبات سے بے قابو ہو کر دست درازی تک اُتر آئی۔ حضرت یوسف دامن چھڑا کر بھاگے کہ کمرے سے باہر نکل جائیں۔ وہ عورت بھی لپکی کہ آگے بڑھ کر انہیں روک لے۔

۱۲/۲۵ **وَاسْتَبَقَا الْبَابَ ...**

”یوسف، دروازے کی طرف بھاگا کہ کسی طرح باہر نکل جائے اور وہ عورت اس کے پیچھے بھاگی کہ اُسے نکلنے نہ دے“

وہ دونوں دروازے کی طرف لپکنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ وہ حضرت یوسف سے آگے نہ بڑھ سکی تو پیچھے سے گرتے پکڑ لیا اور وہ پھٹ گیا :

۱۲/۲۵ **وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ ...**

عورت نے پیچھے سے یوسف کا کمر پکڑ لیا، لیکن یوسف تیزی سے آگے بڑھ گیا اور اُس کا کمر تہ

”بچھے پھٹ گیا“

اور سامنے؟۔ لیکن اتنے میں حضرت یوسف دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گئے۔ دروازہ کھلا تو کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے اُس عورت کا خاندن کھڑا ہے :

﴿۱۲﴾ **وَالْفِيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ...**

”اور ان دونوں نے دیکھا کہ عورت کا خاندن دروازہ کے سامنے کھڑا ہے“

اس اچانک سانحے نے امراۃ العزیز کے قلب کے ہیجان کا رخ بدل دیا۔ بالآخر بواہوس ہی تو تھی۔ فوراً اس ذلیل ترین حربہ پر اُتر آئی جو اس ترکم کیریئر کا خاصہ ہوا کرتا ہے :

﴿۱۲﴾ **قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلَّا أَنْ يُسْجَنَ أَوْ**

**عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۲۵﴾**

” (اُس عورت نے ایک سیکنڈ میں بات بنا ڈالی اور کھٹ سے اپنے خاندن سے کہا کہ) جو شخص تیری بیوی سے بدکاری کا ارادہ کرے، اُس کی سزا کیا ہونی چاہئے؟ کیا اُس کی سزا یہ نہیں ہونی چاہئے کہ اُسے جیل خانہ بھجوا دیا جائے؟ یا اُسے۔ اس سے بھی زیادہ الم انگیز سزا دی جائے!“

حضرت یوسف نے فرمایا :

﴿۱۲﴾ **قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَفْسِي ...**

”اس پر یوسف نے کہا کہ یہ جھوٹ بولتی ہے۔ خود اُس نے یہ سب مکرو فریب کیا اور مجھے مجبور کرتی رہی کہ میں

اس فعلِ شنیع کا مرتکب ہو جاؤں۔ (لیکن میں اس سے دامن چھڑا کر بھاگ نکلا۔)“

وہ انہیں ملزم قرار دے رہی ہے، اور یہ نہ صرف اقبالِ جرم سے منکر ہیں، بلکہ اُسے ملزم ٹھہراتے ہیں۔ مگر اس کے اندر کوئی

تیسرا تھا نہیں۔ حضرت یوسف اپنی بریت میں کسے بطور گواہ پیش کر سکتے تھے؟ لیکن

**شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا**

جب بات آگے بڑھی تو خود اُس عورت کے خاندان میں سے ایک صاحبِ دانش اور

حقیقت شناس نے کہا کہ جب کوئی اور گواہی نہیں مل سکتی تو احوال و کوائف کی گواہی (CIRCUMSTANTIAL EVIDENCE) کو دیکھنا چاہیے۔

﴿۱۲﴾ **وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ**



مِنْ قَبْلِ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَاِنْ كَانَ قَبِيْصُهُ  
قَدْ مِّنْ دُبْرِ فَكٰذِبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾

» (بات آگے بڑھی تو) خود اُس عورت کے خاندان میں سے ایک پسندیدہ شخص نے یہ فیصلہ دیا کہ اگر یوسفؑ کا کرتہ آگے سے پھٹا ہے تو یہ عورت سچی ہے اور یوسفؑ جھوٹا۔ اور اگر کرتہ پیچھے سے پھٹا ہے تو عورت جھوٹی، اور یوسفؑ سچا ہے۔

اُس نے ایک اصول متعین کر دیا جو فی الواقعہ فیصلہ کن تھا۔ عزیز نے جب دیکھا تو حضرت یوسفؑ کا کرتہ پیچھے سے پھٹ رہا تھا، جس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کی بیوی انہیں پیچھے سے پکڑ کر روکنے کے لیے کوشاں تھی۔

﴿۲۸﴾ فَلَمَّا رَا قَبِيْصَهُ قَدْ مِّنْ دُبْرِ قَالِ اِنَّهُ مِّنْ كٰذِبِيْنَ ط

اِنَّ كٰذِبِيْنَ كُنَّ عَظِيْمًا ﴿۲۸﴾

» چنانچہ جب کرتے کو دیکھا تو وہ پیچھے سے پھٹا تھا (اس سے واضح ہو گیا کہ یوسفؑ سچا ہے اور عورت جھوٹی) اس پر اُس عورت کے خاوند نے (بیوی سے) کہا کہ تم عورتیں بڑی مکار ہوتی ہو۔ تمہاری مکاریوں سے خدا کی پناہ! تمہاری چالیں کس قدر گہری اور تمہارے فریب کس قدر خطرناک ہوتے ہیں!

اِنَّ كٰذِبِيْنَ كُنَّ عَظِيْمًا پر غور کیجئے۔ صاف نظر آتا ہے کہ اُس زمانہ تہذیب تمدن میں عورتوں کے متعلق عام خیال کیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ عزیز مصر کا قول ہے۔ لیکن بعض سادہ لوح اس فقرہ کو جنس نسواں کے مکر و فریب کی تائید میں بطور آسمانی شہادت پیش کرتے ہیں۔ یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! عورتیں ہوتی ہی مکر و فریب کی گھڑیاں ہیں۔ دیکھئے قرآن کریم میں ہے: اِنَّ كٰذِبِيْنَ كُنَّ عَظِيْمًا۔ لیکن قرآن کا دامن ان انتہامات سے پاک ہے۔ اُس کے نزدیک مرد نہ محض مرد

ہونے کی حیثیت سے دیانت داری اور راست بازی کا مجسمہ ہے اور نہ عورت

محض عورت ہونے کی جہت سے مکر و فریب کی پیکر۔ دیانت و امانت اور مکر و

اِنَّ كٰذِبِيْنَ كُنَّ عَظِيْمًا

فریب کی استعداد دونوں میں موجود ہے اور دونوں اپنے اپنے اعمال کے مطابق واجب التکریم یا مستوجب نفرین ہیں۔

لہٰذا اس قسم مقبول عام مقولے جب شاعروں کے ہتے چڑھ جائیں تو پھر پوچھئے نہ کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے؟ بہر وارث شاہ پنجابی (باقی صفحہ ۲۳)

یہاں پر ایک ثانیہ کے لیے رُکے۔ جرم کے اثبات کے لیے بالعموم عینی شاہدوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن نظام عدل میں ایک اور شہادت کو بھی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور وہ شہادت ہے واقعاتی یا احوالی (CIRCUMSTANCIAL) یعنی موقعہ کے احوال و کوائف کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچنا۔ دورِ حاضر میں ان کوائف کے مطالعہ نے سائنٹیفک اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ اس میں طبعی تحقیق و تفتیش بھی شامل ہے۔ مثلاً مقتول کے خون کا ٹیسٹ، ضرب اور آواز ضرب کا باہمی تعلق وغیرہ۔ ان شواہد کو بالعموم دورِ حاضر یا دورِ تمدن کی خصوصیات سمجھا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کے اس بیان کی رُو سے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ماضی کے اس قدر بعید زمانہ میں بھی واقعاتی شہادت کو اس قدر اہمیت دی جاتی تھی۔ زیرِ نظر شاہد نے واقعاتی شہادت کی رُو سے یہ ثابت کیا ہے کہ مجرم عورت ہے، نہ کہ (حضرت) یوسف۔ اگرچہ اس ذریعہ اثباتِ جرم کو قرآن کریم نے اپنی طرف سے پیش نہیں کیا، لیکن جس انداز سے اُس نے اس کا ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ اُسے اُس کی تائید حاصل ہے۔ اگر وہ اس کے حق میں نہ ہوتا تو کہہ دیتا کہ اثباتِ جرم کا یہ طریق قابلِ قبول نہیں قرار پاسکتا۔ بہر حال، جرائم کی تفتیش اور فیصلہ کے سلسلہ میں واقعاتی شہادت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

لیکن جو قوانین پاکستان میں نافذ کئے گئے (اور نافذ کیے جا رہے ہیں)۔ ان میں اثباتِ جرم کے لیے طریق ہی الگ اختیار کیا گیا ہے۔ جرمِ زنا کے سلسلہ میں مطالب الفرقان جلد چہارم (۲۹۵) دیکھئے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اس جرم کے ثبوت کے لیے ضروری ہے کہ چار گواہ اس کی شہادت دیں کہ انہوں نے عملِ دخول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اگر چار عینی گواہ نہ ہوں، یا ان میں کسی ایک جزئی بات میں بھی اختلاف ہو، تو ملزم بری ہو جائے گا اور گواہ مجرم قرار پا جائے گا۔ فقہ حنفی کی مشہور اور مستند کتاب "تناوی عالمگیری" میں ہے کہ "اگر تین گواہوں نے عینی گواہی دے دی اور چوتھے گواہ نے بھی ان کی تائید تو کر دی لیکن کہا کہ اُس نے ملزم مرد اور عورت کو ایک لحاف میں دیکھا تھا تو

وبقیہ فٹ نوٹ صفحہ گزشتہ) زبان کی کلاسیکی شاعری کی شاہکار ہے۔ اس میں عورتوں کے متعلق کہا ہے۔ "ایہ تریوتاں مکر دیاں کُنیاں نیں"۔ عورتیں مکر و فریب کی کُنیاں ہیں۔ اک (مداد) کا پودا بڑا زہریلا ہوتا ہے۔ اس میں جو بھیل لگتا ہے اس کی شکل آم کی سی ہوتی ہے لیکن اندر زہر سے بھرا ہوتا ہے۔ اُسے کئی کہتے ہیں جس کی جمع کُنیاں ہے۔ اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ دارش شاہ عورتوں کے متعلق کیا کہہ گیا ہے جو ضرب المثل بن چکا ہے۔ سند اس کی ان کئی کئی عظیمہ۔ کُن سے کئی۔

لہ یہ سطور ۱۹۸۲ء میں قلمبند کی جا رہی ہیں۔

اس سے اس ملزم پر حد (سزا) جاری نہیں ہوگی اور پہلے تین گواہوں کو جرمِ قذف (جھوٹی تہمت لگانے) کا مرتکب قرار دیا جائے گا اور انہیں اسی اسی کوڑے مارے جائیں گے؛ (فتاویٰ عالمگیری۔ اردو ترجمہ صفحہ ۳۴۲، بحوالہ طلوع اسلام بابت مارچ ۱۹۷۹ء ص ۱۰)

ان قوانین کے نفاذ کے وقت، طلوع اسلام نے ان پر تفصیلی تبصرہ کیا اور کہا کہ یہ ناممکن العمل ہیں۔ ان کی رو سے کسی ملزم کے خلاف جرم ثابت نہیں ہو سکے گا۔ (ملاحظہ ہو طلوع اسلام بابت اپریل ۱۹۷۹ء، ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۹ء) لیکن اس دور میں قرآن کی آواز سننے کے لیے کون تیار ہوتا ہے؟ اس کے بعد خود صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے اعتراف کیا کہ جس قسم کی شہادت کو شرط قرار دیا گیا ہے اس کی رو سے جرم ثابت ہی نہیں ہو سکے گا۔ یہ قوانین (حدود آرڈیننس، فروری ۱۹۷۹ء میں نافذ ہوئے تھے۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد انہوں نے امریکہ کی (C.B.S.) کی ٹی۔وی ٹیم کو ایک انٹرویو دیا تھا۔ انٹرویو لینے والوں نے اعتراض کیا کہ یہ قوانین بڑے وحشیانہ ہیں۔ اس کے جواب میں صدر مملکت نے فرمایا تھا:

یہ ٹھیک ہے۔ لیکن میں اس کی وضاحت کروں گا۔ اسلام، سزا کے بجائے، تخویف (DETERRENCE) پر زور دیتا ہے۔ اگر آپ اس فلسفہ پر نگاہ رکھیں گے جو ان سنگین سزاؤں کے پیچھے کار فرما ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اس قانونِ شہادت کی رو سے جس کا نفاذ کیا جا رہا ہے، ایک فی ہزار مجرموں کو بھی سزائیں نہیں دی جاسکیں گی۔

(پاکستان ٹائمز۔ ۱۸ فروری ۱۹۷۹ء۔ بحوالہ طلوع اسلام، جنوری ۱۹۸۲ء)

ہانگ کانگ سے شائع ہونے والے بین الاقوامی شہرت کے حامل میگزین (ASIA WEEK) کے ایڈیٹر انچیف (MICHAEL O'NEILL) نے اواخر ۱۹۸۱ء میں صدر مملکت سے ملاقات کی جس کی رپورٹ اس جریدہ کی ۴ دسمبر ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں ان قوانین کے متعلق تفصیلی گفتگو ہوئی تھی۔ اس کے اس اعتراض کے جواب میں کہ (ان قوانین کی رو سے) کسی مجرم کو سزا دی ہی نہیں جاسکے گی، صدر مملکت نے کہا:

یہ ٹھیک ہے۔ ایسا نہیں کیا جاتا۔ آپ لوگوں کو سنگسار نہیں کر سکتے۔ قرآنی قوانین کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ منہارے ہاں ایسی قوت ہونی چاہیے جو لوگوں کو از تکاب جرم سے باز رکھ سکے۔ ذرا سوچو کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے چار گواہ مل سکیں جو شہادت دیں کہ انہوں نے عمل دخول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ایسا ناممکن ہے۔

(طلوع اسلام، جنوری ۱۹۸۲ء)

لہٰذا ان قوانین کی رو سے عورت کی شہادت بھی قابل قبول نہیں ہوگی۔

لیکن اس کے باوجود یہ قوانین مملکتِ پاکستان میں بدستور موجود ہیں۔ یہ قوانین درحقیقت ان فقہی قوانین پر مبنی ہیں جو آج سے ہزار سال پہلے ہمارے دورِ ملوکیت میں اُس زمانے کے معنّین نے مرتب کیے تھے اور ملوکیت اور نظامِ سرمایہ داری میں اس قسم کے جرائم بالعموم اوپر کے طبقہ میں عام ہوتے ہیں۔ (ہم کسی کی نیت پر شبہ کرنا نہیں چاہتے، لیکن نظر ایسا آتا ہے کہ) ان جرائم کی سزائیں تو نہایت سخت رکھی گئیں لیکن انہیں شرائط ایسی کے ساتھ مشروط کر دیا کہ جن کی رُو سے جرم ثابت ہی نہ ہو سکے۔ نہ جرم ثابت ہو، نہ سزا مل سکے۔

لیکن یہ قوانین نہ اسلامی تھے، نہ ابدی کہ ہم پر ان کی پابندی لازم ہو۔ اُمتِ مسلمہ کے لیے خدا کی کتاب (قرآن) ابدی اور غیر متغیر ضابطہ حیات ہے جس کے احکام و قوانین، ہر دور کی اُمت (یعنی اسلامی مملکت) اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر، باہمی مشاورت سے نافذ کرے گی۔ (واضح رہے کہ اسلامی مملکت اسے کہتے ہیں جس کا تمام کاروبار قرآنِ کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے)۔ قرآنِ کریم نے جرمِ زنا کے ثبوت کے لیے عینی شاہدوں کی شرط عاید کی ہے، نہ جرمِ سنگسار کرنے، کو اس کی سزا قرار دیا ہے۔ (جرائم اور ان کی قرآنی سزائوں کے متعلق مطالعہ القرآن جلد چہارم (صفحہ ۲۹۹ تا آخر) دیکھیے۔)

اب پھر سلسلہ داستان کو لیجئے۔ عزیزِ مصر نے اپنی بیوی کی تو اس طرح ملامت کی اور حضرت یوسف سے کہا کہ اس معاملہ کو رفت گزشت کرو۔ ان کی بریت کی توثیق کے لیے ایک مرتبہ پھر اپنی بیوی سے کہا کہ اپنی خطاؤں کی معافی مانگو، جرم تیرا ہی ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں ہے:

يُوسُفُ أَعْرَضَ عَنْ هَذَا سَكُوًّا سَتَغْفِرِي لِدُنْبِكَ ۖ إِنَّكَ

كُنْتَ مِنَ الْخٰطِئِينَ ﴿۲۹﴾

(حضرت) یوسف سے کہا کہ (میاں صاحبزادے!) اس معاملہ سے درگزر کرو۔ (اس پر مٹی ڈالو۔ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔ کیا کیا جانے)۔ پھر بیوی سے کہا کہ تم خطا کار ہو۔ یوسف سے اپنے قصور کی معافی مانگو، اس سے ضمناً یہ بھی ظاہر ہے کہ اُس تمدن میں جس کی بنیاد خدا فراموشی پر ہو اور جس میں اخلاقِ باخستگی عام ہو جائے انسان میں غیرت و حیثیت کا کتنا عنصر باقی رہ جاتا ہے؛ کسی بدوی قبیلہ میں یہی واقعہ ہوتا (جو مذہبِ شہریوں کے نزدیک

لہ اس قسم کے معاشرہ میں غیرت کا جنازہ نکل چکا ہوتا ہے۔

جاہل اور گنوار ہوتے ہیں، تو خاندان کی غیرت ایسی بیوی کی گردن اڑا دیتی۔ لیکن اس "تہذیب کے فرزند" کو دیکھئے کہ آنکھوں کے سامنے یہ واقعہ ہوا۔ بیوی کا جرم ثابت ہو گیا اور اس پر بیوی سے زیادہ سے زیادہ کہا تو فقط اتنا کہ تمہارا فرقہ بڑا ہی مکار ہے اور حضرت یوسف سے کہا کہ میاں صاحبزادے! اس قصے کو آگے نہ بڑھانا۔ یہیں ختم کر دینا۔

یہ آج سے چار ہزار سال پیشتر کی تہذیب مصر ہی کا نتیجہ نہ تھا، ہر وہ تہذیب جس کی عمارت حدود اللہ کی بنیادوں پر استوار نہ ہو، اس میں غیرت اور حمیت، جہلاً کا حصہ سمجھی جاتی ہے۔ اس میں مرد اور عورت دونوں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ، بقول اکبر سے

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں

حیا ان کو نہیں آتی، انہیں غصہ نہیں آتا!

حقیقت یہ ہے کہ غیرت، ضبط نفس سے پیدا ہوتی ہے اور "تہذیب" کی حکمرانی میں خدا سے انکار کیا ہی اس لیے جانتے ہیں کہ نفس کی کامرانیوں میں کوئی روک ٹوک نہ رہے۔

عورتوں کی محفل | اس کے بعد قرآن نے، اس قصہ کی اگلی کڑی یوں بیان کی ہے:

﴿۱۲﴾ تَرَاوُدْفَتْهَا عَنْ نَفْسِهِ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۗ إِنَّا لَنَرَاهَا

فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۳۰﴾ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ

وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكًا ۖ وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّينًا

وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ ۖ وَقَطَّعْنَ

أَيْدِيَهُنَّ ذَوَقْنِ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَذَا بَشَرًا ۖ إِنْ هَذَا إِلَّا

مَلَكٌ كَرِيمٌ ﴿۳۱﴾

جب اس واقعہ کا چرچا ہوا تو شہر کی عورتوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ انھوں نے کہا کہ عزیز کی

کی بیوی نے اپنے غلام پر ڈورے ڈالنے شروع کیے ہیں۔ وہ اُس کی محبت میں دیوانی ہو رہی ہے، لیکن اس کے لیے اُس نے جو طریقہ اختیار کیا وہ غلط تھا (اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس کا مقصد حاصل نہ ہوا، غلام بری لڑکر قرار پا گیا اور وہ مجرم قرار پا گئی۔ اسے یوں نہیں، یوں کر ناچاہیے تھا۔ جس سے یا تو مقصد برامی ہو جاتی یا غلام، مجرم قرار پا جاتا)۔ (۳۰)

جب عزیز کی بیوی نے اُن کی تدبیر سنی (تو اُس نے کہا، اسے بھی آزما دیکھنا چاہیے۔ چنانچہ) اُس نے انہیں (راز دارانہ طریق سے) کھانے پر بلایا۔ اُن کے لیے مسدیں بچھا دی گئیں اور چھڑیاں (چھپے وغیرہ) سلنے رکھ دیے گئے۔ پھر اُس نے یوسف کو بلایا۔ (چنانچہ اُنہوں نے وہ سب کچھ کر کے دیکھا جس کے لیے اس قدر اہتمام کیا گیا تھا۔ لیکن اُن کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ اس پر وہ یوسف کی بختگی سیرت کی قائل ہو گئیں)۔ اور کہنے لگیں کہ سبحان اللہ! یہ انسان نہیں، واقعی کوئی واجب التکریم فرشتہ ہے۔ (اب وہ اپنی تدبیر کے دُورے حصے کی طرف آئیں۔ کہ اگر مقصد برامی نہ ہو سکے تو یوسف مجرم قرار پا جائے۔ اس کے لیے اُنہوں نے) اپنے ہاتھ زخمی کر لیے۔ (یہ اُن کی بہت بڑی چال تھی۔ (۳۱))

صنفاً، قرآن کریم نے یہاں ”قطعید“ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اُنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ کر کلائیوں سے الگ کر دیے تھے۔ اس سے مراد یا تو محض ہاتھ روک لینے کے ہیں اور یا ہاتھوں کو زخمی کر لینے کے۔ قرآن کریم نے چور کی سزا کے سلسلہ میں جو ”قطعید“ کے الفاظ استعمال کیے ہیں، اُن کا مطلب یہاں سے واضح ہو جاتا ہے۔ (دیکھئے مطالب الفرقان جلد چہارم ص ۵۳)

ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ اس مجلس میں جو کچھ ہوا، اسے حضرت یوسف نے ان عورتوں کا کیتھ (مکر، خفیہ سازش) کہہ کر پکارا ہے (دیکھئے ۱۲/۵، ۱۲/۶) اور اپنے رب سے دعا کی ہے کہ مجھے اس کی توفیق عطا فرما کہ ان کے حربوں کا مقابلہ کر سکوں (۱۲/۱۲)۔ اس سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ خود وہ عورتیں بھی حضرت یوسف کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب بادشاہ نے اس معاملہ کی تحقیق کی تو اس نے ان عورتوں سے (یعنی اکیلی عزیز کی بیوی سے نہیں بلکہ دوسری عورتوں سے بھی) کہا تھا:

قَالَ مَا خَطْبُكُمْ إِذْ رَأَوُكُمْ يُوسُفَ عَنْ نَفْسِهِ قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوءٍ (۱۲/۵)

”چنانچہ بادشاہ نے اس مقدمہ کی خود تحقیق کی، اور ان عورتوں سے کہا کہ سچ سچ بناؤ کہ جب تم نے یوسف کو

اُس کے ارادے سے پھیرنا چاہتا تھا، تو اُس وقت کیا بات پیش آئی تھی؟ انہوں نے کہا حاشا للہ! ہم نے یوسفؑ میں کوئی بُرائی کی بات نہیں دیکھی تھی۔ (وہ بالکل بے گناہ تھا)۔ ۱۳

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ تنہا عزیز کی بیوی نے نہیں بلکہ سوسائٹی کی اور عورتوں نے بھی حضرت یوسفؑ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا۔ لہذا، ہو سکتا ہے کہ اس محل میں اُن کا مہبوت ہو کر اپنے ہاتھ زخمی کر لینا اور حُسنِ یوسفؑ کی اس قدر تعریف کرنا، ان کی ”ایکٹنگ“ ہی ہو جس سے مقصود خود اپنی محبت کا اظہار ہو۔ اس لیے کہ نفسیاتی طور پر یہ حربہ بڑا موثر ہوتا ہے کہ کسی کے حُسن کی اس طرح والہانہ تعریف کی جائے اور اُسے باور کرایا جائے کہ اُسے دیکھ کر بڑے سے بڑے بھی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں۔



اس کے بعد:

قَالَتْ فَاذِلْكَ الَّذِي لُمْتُنِي فِيهِ ط وَلَقَدْ رَاودْتَهُ  
عَنْ نَفْسِهِ فَاَسْتَعْصَمَ ط

”عزیز کی بیوی نے اپنی سھیلیوں سے کہا کہ کیوں؟ تم نے بھی آزما کر دیکھ لیا ناں!! یہ ہے وہ غلام“ جس کے بارے میں مجھے طعنہ دینی تھیں (کہ مجھ سے اتنا بھی نہیں ہو سکا کہ ایک غلام کو رام کر لوں) میں نے اسے اس کے ارادے سے پھیرنے کے لیے سب کچھ کر دیکھا، لیکن اس پر کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔“

اس کے بعد وہ عورت ضد پر آگئی۔ اور اس نے بر ملا کہہ دیا:

جذبۃ انتقام | وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَا امْرَاةٌ لَّيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُونَا مِّنَ

الصَّغِيرِينَ ﴿۳۶﴾

”اگر اب بھی اُس نے میرا کہنا مانا تو اسے ضرور قید کر کر رہوں گی اور اسے ذلیل و خوار ہونا پڑے گا۔ (اس لیے کہ اب، تمہاری اس تدبیر کی وجہ سے، اس کے خلاف جرم ثابت کرنے کے لیے محکم ثبوت موجود ہے کہ اُس نے تم پر بھی ہاتھ ڈال دیا تھا اور اس کی مدافعت میں تمہارے ہاتھ زخمی ہو گئے)“

ذرا اس تصور کو سامنے لائیے۔ دُنیا جہاں میں قاعدہ یہ ہے کہ لوگوں کو اس لیے حوالہ قید و بند کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور اُنہوں نے کسی کی عصمت پر ہاتھ ڈال دیا۔ یہاں معاملہ مختلف ہے۔ حضرت یوسفؑ کو اس لیے قید کی دھمکی دی جا رہی ہے کہ اُنہوں نے اپنے جذبات پر قابو کیوں رکھا! یہ ایک نئی آزمائش تھی۔ محل کی آرام کی زندگی،

عزت و وقار۔ دولت و حشمت اور اس کے مقابلہ میں جیل خانہ کی عقوبت! حضرت یوسفؑ کو اختیار حاصل تھا کہ ان دنوں میں سے جسے چاہیں پسند کریں۔ انہوں نے ایقان و ایمان کی پوری قوت سے بلا تامل کہہ دیا:

﴿۱۲﴾ قَالَ رَبِّ السِّجْنِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ ۖ وَإِلَّا

تَصْرِفُ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿۳۳﴾

»یوسف اب اچھی طرح دیکھ چکا تھا کہ ان عورتوں کے ارادے کیا ہیں۔ چنانچہ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ قید بند کی مصیبتیں برداشت کرے گا لیکن اپنی سیرت و کردار کو داغدار نہیں ہونے دیکھا۔ اُس نے اپنے نشوونما دینے والے سے کہا کہ جس بات کی طرف مجھے یہ بلاتی ہیں، اس کے مقابلہ میں مجھے جیل جانا زیادہ پسند ہے۔ بارالہا! تو میری مدد کر اور مجھے توفیق عطا فرما کہ میں ثابت قدم رہوں۔ اس لیے کہ اگر ایسا نہ ہوا اور میں ان کے فریب میں آکر اُن کی طرف مائل ہو گیا تو یہ بڑی حق ناشناسی ہوگی۔

عورتوں کی نگاہوں میں حضرت یوسفؑ کا حُسن صورت ہی تھا، لیکن دیکھنے والی آنکھ کے لیے اُن کے حُسن سیرت کی جمال آفرینی حُسن صورت سے کہیں بڑھ کر تھی۔

یہاں پھر دیکھئے۔ حضرت یوسفؑ نے یہی کہا ہے کہ "مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ" جس بات کی طرف مجھے یہ عورتیں بلا رہی ہیں، اُس سے قید خانہ کہیں اچھلے ہے۔ اس سے بھی اس توجیہ کی تائید ہوتی ہے جسے ہم مجلس ضیافت والے واقعہ میں بیان کر چکے ہیں۔ یعنی اس مجلس کے تمام اہتمامات اس غرض کے لیے تھے کہ وہ عورتیں حضرت یوسفؑ کو اپنی طرف مائل کر لیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے اُنہوں نے طرح طرح کے مکر و فریب سے کام لیا تھا۔ انہی میں سے ایک ہاتھ کاٹنے کا تریاچلتر بھی تھا۔

ادھر سے، خدا کے اس مخلص بندے نے اپنے رب کو مدد کے لیے پکارا اور ادھر سے اُس کے رب نے باب

اجابت دافرما دیا:

﴿۱۲﴾ فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۳۴﴾

» سو اُس کے پروردگار نے اُس کی دعا کو شرف قبولیت عطا فرمایا۔ چنانچہ اُن کا جادو نہ چل سکا اور وہ اسے

اپنی طرف مائل کرنے میں ناکام رہیں۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔



**بلا جرم قید بند** جب عزیز مصر کی بیوی نے دیکھا کہ دھمکی سے بھی کام نہ چلا تو اُس نے دھمکی کو سچ کر دکھانے کا سوچا اور اپنی ہمزاد عورتوں کے صلاح و مشورے سے کچھ ایسی بات بتائی کہ عزیز اور اُس کے متعلقین کو اسی میں مصلحت نظر آئی کہ حضرت یوسف کو کچھ وقت کے لیے پابندِ سلاسل کر دیا جائے :

﴿ثُمَّ بَدَأَ لَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوُا الْآيَاتِ لَيْسَ جِنَّهُ حَتَّىٰ حِينٍ﴾ (۱۲/۳۵)

” (یوں ناکام رہنے کے بعد، ان عورتوں نے یوسف کے خلاف جھوٹا مقدمہ کھڑا کر دیا)۔ جنوں نے مختلف قرائن سے دیکھ لیا کہ یوسف بے گناہ ہے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ یوسف کو کچھ مدت کے لیے قید کی سزا دے دی جائے۔ (اس قسم کے معاشرہ میں اعلیٰ طبقہ کی مصلحتیں کچھ ایسی ہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ یوسف کو داخل زندان کر دیا گیا)۔“

آگے بڑھنے سے پہلے، راستہ کے اس گوشہ پر ایک مرتبہ پھر نگہ باز گشت ڈال لے۔ عزیز مصر دیکھ چکا تھا کہ اُس کی بیوی حضرت یوسف کی طرف کس طرح مائل ہے، لیکن اس کے باوجود نہ تو وہ حضرت یوسف کو محلات سے الگ کر سکا اور اس لیے کہ اس کی بیوی کبھی ایسا نہ ہونے دیتی اور نہ ہی اپنی بیوی کو اُس کے مذموم ارادوں سے روک سکا۔ یہ سب اس لیے کہ اس قسم کی مصنوعی تنہذیب میں عورت کے مقابلہ میں مرد بیچارے کی حالت ایسی ہی ہو جاتی ہے۔ اور یہ حالت اکیلے عزیز ہی کی نہ تھی، دیگر امراء و اراکین بھی ایسے ہی تھے اس لیے کہ ان کی عورتوں کی کیفیت بھی ہمارے سامنے آچکی ہے۔ یعنی اس سوسائٹی کی عام معاشرتی حالت ہی ایسی ہو چکی تھی۔ پھر دیکھئے کہ ایک ناکام محبت عورت اپنے جذبہ انتقام میں کیا کچھ کرتی ہے؛ اور تیسرے یہ کہ مرد کس طرح عورتوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے ضمیر کا کلا گھونٹ دیتا ہے۔ عزیز اور اس کے گھرانے کے لوگ حضرت یوسف کی راست بازی اور عصمتِ نفس کی نشانیاں دیکھ چکے تھے، وہ جانتے تھے کہ قصور کس کا ہے۔ لیکن بائیں ہمہ مجبور ہو گئے کہ امراء العزیز نے جو دھمکی دی تھی اُسے پورا کر دیا جائے۔ خدا فراموش سوسائٹی میں حق و انصاف کی اسی طرح مٹی پلید ہوا کرتی ہے۔

ہم نے شروع میں کہا ہے کہ اس سورۃ میں حضرت یوسف کی عظمتِ سیرت کے مختلف گوشوں کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس وقت تک اس میں ایک گوشہ نمایاں طور پر ہمارے سامنے آیا ہے۔ یعنی حفاظتِ عصمت۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، حفاظتِ عصمت کس قدر گراماں بہا قدر ہے۔ قرآن کریم نے حضرت یوسف کے علاوہ ایک اور ہستی کی انفرادی زندگی کا تفصیلی تذکرہ بھی پیش کیا ہے۔ وہ ہیں حضرت مریم (علیہا السلام)۔ مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں یہ تذکرہ محفوظ ہو چکا ہے (دیکھئے بالخصوص جلد چہارم، ص ۱ تا آخر)۔ وہ نبی تو نہیں لیکن اُن کے لیے بھی

اصطفاً (برگزینی) کا لفظ انبیاء کرام کی طرح آیا ہے (۱۲) ان کی اس بلندی مرتبت کی وجہ کیا تھی؟ یہ کہ —  
 أَحَصَّنَتْ فَرْجَهَا (۱۱) انہوں نے اپنے دامن عصمت کو داغدار نہ ہونے دیا۔ (اور اسی خصوصیت کی بنا پر  
 اُن کے اُسوہ کو دنیا جہان کی عورتوں کے لیے مثالی قرار دیا۔ (۱۲))

حیوانی سطح پر جنسی اختلاط کا تعلق عمل افزائش نسل سے ہے۔ لیکن انسانی سطح پر اس کا مقام کچھ اور ہے۔ اس  
 کے متعلق ہم نے مطالب الفرقان جلد اول (ص ۲۳ پر) لکھا تھا کہ اور تو اور خود مغرب کے محققین بھی اپنی مدت العمر  
 کی تحقیقات کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قوموں کے عروج و زوال کا اس کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ ہم نے وہاں  
 کہا تھا کہ اس کے متعلق مناسب مقام پر تفصیل سے لکھیں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ مقام اس تشریح کے لیے مناسب ہے۔  
 کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر (J. D. UNWIN) نے اس سوال کو اپنی تحقیقات کا موضوع قرار دیا کہ جنسی جذبہ  
 کی تسکین محض ایک انفرادی فعل ہے جس کا تعلق دو افراد سے ہوتا ہے یا اس کا کوئی اثر اس قوم کی تہذیب و  
 تمدن پر بھی پڑتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اُس نے دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے اسی غیر مہذب (قدیمی)  
 قبائل کی زندگی کا مطالعہ کیا، اور پھر سولہ مہذب اقوام کی معاشرتی زندگی کا اس کے بعد اس نے اپنی تحقیق کے نتائج  
 کو اپنی گراں قدر تصنیف (SEX AND CULTURE) میں پیش کیا۔ معلوم نہیں ڈاکٹر انون اس وقت حیات  
 ہیں یا وفات پا چکے ہیں، لیکن ان کی زندہ جاوید کتاب ہمارے سامنے ہے جس کے ضروری اقتباسات پیش  
 خدمت ہیں۔ اس کتاب کا پہلا فقرہ یہ ہے۔

”دنیا کی مہذب اقوام ہوں یا غیر مہذب قبائل، سب کے ہاں جنسی مواقع اور قوم کی تمدنی حالت میں بڑا گہرا تعلق

ہے۔ اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اس مسند پر تفصیلی تحقیق کی جائے۔ میری اس تحقیق کا حاصل اور اس

سے مستنبط نتائج اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں“

متن کتاب سے بھی پہلے دیا چاہے میں لکھا ہے کہ :

اپنی تحقیقات کے بعد میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں، وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ ہو، اس کی تمدنی سطح

کا انحصار دو چیزوں پر ہے، ایک اُن لوگوں کا نظام اور دوسرے وہ توانائی جو اُن حدود و قیود کی بنا پر حاصل

ہوتی ہے جو اُس گروہ نے جنسی تعلقات پر عاید کر رکھی ہوں۔ (xiv)

اس کلیہ کو اس نے متن کتاب میں ان الفاظ میں لکھا ہے کہ :

کوئی گروہ کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو، اس کی تمدنی سطح کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ اس

نے ماضی اور حال میں جنسی تعلقات کے لیے کس قسم کے ضوابط مرتب کر رکھے تھے۔ (ص ۳۲)

آپ نے غور کیا کہ یہ محقق اپنی تحقیقات کے بعد کس نتیجہ پر پہنچا ہے؟ وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جنسی تعلقات محض ایک جعلی جذبہ کی تسکین کا نام نہیں بلکہ قوموں کی تہذیب و تمدن کا دار و مدار اس جذبہ کی تحدید و تادیب پر ہے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر الفونن یہ بھی لکھتا ہے کہ:

”اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہو گا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔“ (ص ۳۲)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ:

”جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد (یعنی قریب سو سال میں) نمودار ہوتے ہیں:

(ص ۳۳)

اس لیے اگر کسی قوم میں تمدنی تبدیلی واقع ہو، یعنی اُسے دنیا میں تمدنی عروج حاصل ہو یا اس پر زوال آجائے تو اس عروج و زوال کے اسباب کے لیے دیکھنا چاہیے کہ اس قوم نے سو سال پہلے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں کس قسم کی تبدیلیاں کی تھیں۔ جیسی وہ تبدیلیاں ہوں گی، اسی قسم کے نتائج مرتب ہوں گے۔

سب سے پہلے تجرد کی زندگی (CELIBACY) کو لیجئے، جسے عیسائیت (اور اس سے متاثر شدہ مسکب خانقاہیت) روحانی ارتقاء کے لیے اولین شرط قرار دیتی ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر الفونن کی تحقیق یہ ہے کہ:

”جبری تجرد (COMPULSORY CELIBACY) کے اثرات انسانی تمدن پر ہلاکت انگیز ہوتے ہیں:

(ص ۳۴)

جبری تجرد سے مفہوم یہ ہے کہ یہ چیز انسانی عقاید یا معاشرتی ضوابط میں شامل کر دی جانے کے تجرد کی زندگی و تجرّف تقدّس ہے اور اس طرح لوگوں کو ذہنی طور پر مجبور کر دیا جاتے کہ وہ تجرد کی زندگی بسر کریں۔ جیسے عیسائیوں کے نونس (NUNS) اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

عیسائیت یا مسکب خانقاہیت میں جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ تجرد کی زندگی ہی وجہ شرف انسانی ہے تو دوسری طرف آج کل عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر جنسی جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں کسی قسم کی بھی پابندی عائد

کی جائے تو اس سے انسان کے اعصاب پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے اور اس سے خطرناک قسم کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خیال غلط ہے۔ جنسی جذبات پر پابندیاں عائد کرنے سے اعصابی بیماریاں پیدا نہیں ہوتیں، بلکہ انہیں بے لگام چھوڑ دینے سے ایسا ہوتا ہے۔ (دیباچہ صفحہ ۳۵)

آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ :

”جو قومیں اپنے مردوں اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دیں کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح جی چاہے کر لیں، ان میں فکر و عمل کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ رومیوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ حیوانوں کی طرح بلا قیود جنسی جذبات کی تسکین کر لیا کرتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ان کے پاس کسی اور کام کے لیے توانائی ہی نہ رہی۔“ (صفحہ ۳۹)

ڈاکٹر فریڈ (ہمارے دور کا علم النفس کا ممتاز محقق) اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ :

”جب جنسی جذبات پر کچھ پابندیاں عائد کر دی جائیں تو یہ اپنا رخ دوسری طرف منتقل کر لیتے ہیں جسے (SUBLIMATION) کہتے ہیں، اور اس لیے افراد کی نالتو توانائی جنسی گوشوں کی طرف سے مہٹ کر ان گوشوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جو تمدنی طور پر بہت زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔“

(INTRODUCTORY LECTURES ON PSYCHO-ANALYSIS

TRANSLATED BY J. RIVIERE P.17)

اس کے برعکس، جو قوم جنسی جذبات کی تسکین کو بے محابا چھوڑ دیتی ہے اس کا حشر کیا ہوتا ہے؛ اس کے متعلق ڈاکٹر انون کہتا ہے کہ :

”اس قوم میں علم و بصیرت کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے راہنمائی حاصل نہیں کرتی بلکہ وہ واقعات کے اسباب و علل (CAUSES) کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی۔ جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے وہ اُلٹے اُلٹے طریقے تسلیم کرتی چلی جاتی ہے۔ زندگی سے متعلق تمام معاملات کے بارے میں ان کی بندھی بندھائی رہتی ہے (جس کے مطابق وہ چلتے چلے جاتے ہیں) وہ ہر غیر معمولی واقعہ کو جوان کی سمجھ میں نہ آئے، کسی عجیب و غریب قوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اس قوت کا مظہر کبھی پتھروں کو سمجھا جاتا ہے اور کبھی درختوں کو۔ کبھی ایسے

نہ دیکھئے یہ الفاظ کس طرح تجربہ ہیں قرآن کی اس آیت کا لہم قلوبہ لا یفقہون بہا۔ ان کے پاس سمجھنے کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ (۲۹)

حیوانات کو جو انہیں محیر العقول نظر آئیں، اور کبھی دیگر ایسی اشیاء کو جن کی ماہیت ان کی سمجھ میں نہ آئے، جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں انہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے، وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے۔ حتیٰ کہ اُس کی موت کے بعد بھی اسے اس قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر انون نے ان تمام قوم پرستوں کی تفصیل بتائی ہے جو مذنیاز، گندہ، تعویذ، اکابر پرستی اور قبر پرستی کی صورت میں ایسی قوم سے ظہور میں آتی ہیں، اس کے بعد وہ لکھتا ہے، اس قسم کے معتقدات اس قوم میں نسلاً بعد نسل متواتر چلے آتے ہیں۔ بزنا کا امتداد ان پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس معاشرہ میں انسان پیدا ہوتے ہیں، اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور ان کی لاشوں کو تہ خاک دبا دیا جاتا ہے تو وہ نسیاً منسیاً ہو جاتے ہیں۔ یہ انسان نہیں ہوتے بلکہ حیوان ہوتے ہیں۔ (صفحہ ۳۲۶-۳۲۵)

یہ ایک غیر مسلم مغربی محقق کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ جنسی جذبہ کی تسکین کا قوم کی حیات سے کس قدر گہرا تعلق ہے اور قرآن حکیم نے اس پر جو اس قدر پابندیاں عائد کی ہیں، ان کی غرض و غایت کیا ہے؟ ہمارے ہاں کا نوجوان طبقہ (اقوام مغرب کی تقلید میں) عام طور پر کہہ دیا کرتا ہے کہ جنسی جذبہ کی تسکین فطرت کا تقاضا ہے، اسے جس طرح بھی پورا کر لیا جائے، ٹھیک ہے۔ اس پر پابندیاں معاشرتی تقاضے ہیں معاشرہ مناسب سمجھے تو انہیں نرم کر دے، یا سرے سے ختم ہی کر دے۔ اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اعتراض وہ ہو سکتا ہے جسے خود اقوام مغرب کے ایک محقق نے اپنی مدت العمر کی تحقیق کے بعد عائد کیا ہے۔ ان پابندیوں کا تعلق قوم کے عروج و زوال سے ہے۔ اسی سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن کریم نے داستان حضرت یوسفؑ میں اس واقعہ کو اس قدر اہمیت کیوں دی ہے اور اسے ہمارے لیے کیوں موجب عبرت و موعظت قرار دیا ہے۔ اب آگے بڑھیے۔ محلات کے نظم و نسق کا کارفرما اور (فی الجملہ) وہاں کی آرام و آسائش کی زندگی کا خوگر یوسفؑ اب قید خانے کی مصیبتیں جھیل رہا ہے۔ اور اس جرم میں کہ اُس نے جذبات کو مشتعل کر دینے والے اسباب مواقع میں بلند اخلاقی قدر کی، جو خدا کی طرف سے متعین ہوئی تھی، پابندی کیوں کی! حضرت یوسفؑ کی پاکبازی شرافت نفس اور نیکو کاری کچھ ڈھکی چھپی نہ تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک حصہ اسی جگہ گزارا تھا جہاں انہیں اب قید میں ڈالا گیا تھا۔ اس لیے قید خانہ میں بھی ان کا احترام اور تقدس مُسکَم تھا۔ بیل میں آپکے ساتھ دو اور

لہ یہ بھی قرآن ہی کی آیت کا ترجمہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ یتَمَتَّعُونَ دَیْنًا کُلُّونَ کَمَا تَأْکُلُ الْأَنْعَامُ۔ (۱۲/۲۰)

وہ سامان زلیست سے اس طرح کھلتے پیتے ہیں جس طرح حیوان!

نوجوان بھی تھے۔ ایک بادشاہ کے ساتھیوں کا سردار اور دوسرا دروغہ مطبوعہ۔ یہ کسی معاملہ میں زیرِ عتاب آگئے اور قید خانہ کے ساتھیوں کے خواب | اور چونکہ حضرت یوسفؑ کی فراست اور بزرگی پہلے سے معروف تھی، وہ ان کے پاس گئے کہ اپنے خوابوں کی تعبیر دریافت کریں۔

﴿۱۲﴾ وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيْنِ ط قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرَيْتُ  
أَعَصِرُ خَمْراً ۖ وَقَالَ الْآخَرُ إِنِّي أَرَيْتُ أَحْمِلُ فَوْقَ رَأْسِي  
خُبْزًا تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۗ نَبِّئْنَا بِتَأْوِيلِهِ ۗ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ  
الْمُحْسِنِينَ ﴿۳۶﴾

یوسفؑ کے ساتھ دو اور نوجوان بھی قید خانہ میں آئے۔ (ایک دن، ان میں سے ایک نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شہبِ بنانے کے لیے انگورِ نچوڑ رہا ہوں۔ دوسرے نے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے انہیں (نوج نوج کر) کھا رہے ہیں۔ ہمیں بتاؤ کہ ان کا مطلب اور مال کیا ہے، کیونکہ تم بڑے سمجھدار اور نیک آدمی دکھائی دیتے ہو۔

قید خانہ میں حضرت یوسفؑ جو کچھ ان قیدیوں کے متعلق دیکھ اور سن رہے تھے، اُس سے ان کے خوابوں کی تعبیر کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہ تھا۔ اس لیے آپؑ نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ وہ نوجوان اپنی ضرورت کی غرض سے آپؑ کی طرف خاص طور پر متوجہ تھے۔ آپؑ نے سوچا کہ دینِ حقیقی کے متعلق ایک اصولی بات ان کے کان میں ڈال دی جائے، ممکن ہے وہ اُسے بادشاہ تک پہنچادیں۔ لیکن انہوں نے ان نوجوانوں کو نفسیاتی طور پر مزید متاثر کرنے کے لیے انہیں محوِ اسا انتظار میں رکھنا ضروری سمجھا:

﴿۱۲﴾ قَالَ لَا يَا تَيْكَمَا طَعَامُ نُرْسِقِيهِ ۗ الْإِنْبَاءُ تَكْمًا بِنَاوِيلِهِ قَبْلَ  
أَنْ يَأْتِيَكُمَا ۗ ذَلِكُمْ مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي ۗ إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ  
بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿۳۷﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي

إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ط ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿۳۸﴾

(ایک مبلغ پینامات خداوندی کی طرح، جو اس مقصد کے لیے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، یوسف نے سوچا کہ یہ نوجوان، اس وقت اس کی بات سُننے کے لیے ہمت نہ گواہی، لہذا ان کے کان میں توحید کی آواز ڈال دینی چاہیے)۔ چنانچہ اُس نے اُن سے کہا کہ میں تمہارے کھانے کے وقت سے پہلے تمہارے حوالوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ (لیکن پہلے، یہ تو سن لو کہ میں کون ہوں اور میرا پیغام کیا ہے)۔ میں جو کچھ کہتا ہوں اپنی طرف سے نہیں کہتا، بلکہ اس علم کی بنا پر کہتا ہوں جو مجھے میرے پروردگار کی طرف سے ملا ہے۔

سب سے پہلے یہ سن لو کہ میں اُن لوگوں کے مسلک پر نہیں ہوں جو خدا کو مانتے ہیں اور نہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

(تم نے ابراہیم، اسمٰعیل و یعقوب کا نام تو سنا ہوگا)۔ میں انہی کی اولاد میں سے ہوں اور انہی کے مسلک کا پیرو ہوں۔ ہم اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کرتے۔ اس حقیقت کا پالینا کہ اقتدار خداوندی میں کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہیے، خدا کا بہت بڑا فضل ہے جو اس نے ہم پر اور دوسرے انسانوں پر (جو اس مسلک کے منتجع ہیں) کیا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ اُس کے اس فضلِ عظیم کی قدر شناسی نہیں کرتے؛

وَعِظٌ يُّوسُفٰی | اپنے کیش و مشرب کالیوں تعارف کرانے کے بعد اب مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ کی تشریح ارشاد فرمائی اور اس میں دینِ خداوندی کی اس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان

کر دیا جو اسلام کا اصل الاصول ہے۔ فرمایا:

﴿۱۲-۳۸﴾ يٰصٰحِبِ السِّجْنِ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرًا اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُوْنِهٖ اِلَّا اَسْمَاءٌ سَمِيْتُمْ بِهَا اَنْتُمْ وَاٰبَاؤُكُمْ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهِمْ مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط اَمَرَ

## الَّا تَعْبُدُوا إِلَّا آيَاتُهُ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۴۰﴾

توحید کے اس نکتہ کو میں تمہیں ایک اور انداز سے سمجھانا ہوں، ایک شخص صرف ایک آقا کا نوکر ہے۔ اور وہ آقا بھی ایسا ہے جو ہر قسم کے اختیارات رکھتا ہے۔ اور دوسرا شخص بیک وقت متعدد مالکوں کی نوکری کرتا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ ان میں سے کس کی زندگی اچھی طرح سے گزرے گی؟ ظاہر ہے کہ اس کی زندگی اچھی ہوگی جو ایک آقا کا ملازم ہے اور وہ اس کی تمام ضروریات پوری کرتا رہتا ہے۔

بس یہی صورت ایک خدا کی اطاعت اختیار کرنے والوں کی اور ان کے مقابلے میں، ان کی ہے جو مختلف آقاؤں کو اپنا خدا مانیں۔ تم لوگ مختلف خداؤں کے سامنے جھکتے ہو۔ کبھی تم نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ ان خداؤں کی حقیقت اور اصلیت کیا ہے؟ بس اتنی ہی کہ یہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں۔ ورنہ ان کی اپنی کوئی حقیقت اور پوزیشن نہیں۔ (تم سے کہا جاتا ہے کہ یہ خدا اس کے نمائندے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے) خدا نے ان کے لیے کوئی سند نہیں بھیجی (کہ اُس نے انہیں اپنے اختیارات دے رکھے ہیں)۔ یاد رکھو! اختیارات و اقتدارات کا واحد مالک خدا ہے۔ اس کے سوا حکومت کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ اُس کا فرمان یہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اور اطاعت اختیار نہ کی جائے۔ یہ ہے زندگی کا حکم اور استوار نقشہ۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے؛

اسلام کیا ہے؟۔ وعظ یوسفی کے ان مختصر سے جملوں کی عملی تفسیر۔ یوں کہیے کہ سارا قرآن اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہجہان کو جب قلعہ آگرہ میں قید کر دیا گیا تو اُس نے ایک نادارہ کار صنّاع سے کہا کہ اس کے مکرے کی دیوار میں ایک چھوٹا سا نگینہ اس انداز سے ٹکا دے کہ وہ مکرے کے اندر جہاں بھی ہو، اُسٹے بیٹھے پورے کا پورا "تاج" اس کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ وعظ یوسفی کے ان چھوٹے چھوٹے نگینوں کو دیکھیے، ایک ایک نگینہ میں پورے کا پورا "تاج" کس طرح جھلمل جھلمل کرتا نظر آ رہا ہے۔! **عَآرِبَابٌ مَّتَقَرِّقُونَ خَيْرًا أَمْرًا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ** توحید کی پوری کائنات اس نگینہ کے اندر سمائی ہوئی ہے۔ انسان اُس کے سامنے جھکتا ہے جس میں (بزعیم خویش، شان ربوبیت سمجھتا ہے جس کے متعلق اُسے خیال ہوتا ہے کہ مجھے کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہے یا نقصان دے سکتا ہے)۔ ذرا سوچئے کہ خدا تراشی کے اس مسک میں اُسے دنیا میں کس کس کے سامنے جھکنا پڑتا ہے اور وہ کن کن چوکھٹوں کی ذلت آمیز خاک سے اپنی پیشانی



کو داغدار کرتا ہے۔

گاہ اور اب کلیسا ساز باز  
دین او آئین لوسودا گری است  
گاہ پیش دیریاں اندر نیاز  
عنتری اندر لباس حیدری است (اقبال)

مثل مشہور ہے کہ ایک شخص بیک وقت دو آقاؤں کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ اس سے اُس "عملی مشرک" کی کیفیت کا اندازہ لگائیے جسے اپنی ہر ضرورت کے لیے اپنے نئے آقا کے سنگ آستان پر جہیں سائی کرنی پڑے اور پھر تم ظریفی یہ کہ اُن میں سے کسی میں بھی وہ قوت نہ ہو جس کے احساس سے وہ ان کے سامنے جھکتا ہے مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاءُكُمْ مِمَّا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ ط سو جب کسی انسان میں ربوبیت کی قدرت ہی نہیں تو ایک انسان کسی دوسرے انسان کی حکومت کیوں اختیار کرے؟ حکومت صرف اُس ذات کو زیبا ہے جس کے قانون کے مطابق نفع و نقصان کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اس لیے اُن رکھو کہ (إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ ط) اس کا حکم ہے کہ اس کے قانون کے سوا اور کسی قانون کی اطاعت نہ کرو۔ یہ ہے (دینِ قیم) محکم نظام جس کے تابع انسان کو چلنا چاہیے۔ سابقہ جلدوں میں شرک اور توحید، خدا کی حکومت، عبدیت، اسلامی مملکت، قرآنی نظام حکومت کے متعلق اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ انڈکس کی مدد سے ان مقامات کو سامنے لائیے۔ وعظِ یوسفی کی تشریحات پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ ریز ہو جائیں گی۔

۱۲/۳۱ یٰصَاحِبِ السِّجْنِ أَمَّا أَحَدُكُمْ فَسَيَقِي رَبَّهُ خَيْرًا وَأَمَّا  
الْآخَرُ فَيُصَلِّبُ فَتَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَأْسِهِ قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي

فِيهِ تَسْتَفْتِينَ ط

اس تبلیغ کے بعد، یوسف نے ان سے کہا کہ اب سنو اپنے خوابوں کی تعبیر۔ تم میں سے ایک (جس نے دیکھا ہے کہ وہ انگور بیٹڑ رہا ہے) اپنے آقا کی ساتی گری کرے گا اور دوسرا سٹونی پر چڑھا دیا جائے گا جہاں سے پرندے اس کا سر نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ تم نے جن خوابوں کے متعلق مجھ سے پوچھا ہے اُن کی تعبیر یہ ہے۔ تعبیر کیا؟ بس یوں سمجھو کہ یہ قطعی فیصلہ ہے (میرا اندازہ یہی ہے)۔

جس کے متعلق سمجھا تھا کہ وہ مصائب سے نجات پا جائے گا، حضرت یوسف نے اُس سے کہا کہ موقع پا کر

بادشاہ سے ان امور کا تذکرہ کر دینا جو میں نے تم سے کہے ہیں، یعنی توحید باری تعالیٰ اور حکومتِ خداوندی سے متعلق۔ لیکن ان باتوں کا اثر اسی صورت میں ہو سکتا تھا جب بادشاہ کو یہ معلوم ہو جانے کہ وہ قیدی بے گناہ ہے ورنہ ایک مجرم قیدی کے پند و نصائح پر کون کان دھرتا ہے۔ اس لیے یہ بھی کہا ہو گا کہ بادشاہ سے میری قید کی حقیقت بھی کہہ دینا۔ وہ دونوں نوجوان قید سے نکال لیے گئے اور حضرت یوسفؑ کی بیان کردہ تعبیر کے مطابق ہی ان کے ساتھ سلوک ہوا۔ لیکن وہ نوجوان جو اپنے منصب پر بحال ہو گیا تھا، حضرت یوسفؑ کی بات بھول گیا اور یوں

﴿۱۲﴾ وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ ۗ

فَأَنسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ ﴿۱۲﴾

ان میں سے جس کے متعلق یوسفؑ کا اندازہ یہ تھا کہ وہ چھوٹ جائے گا، اس سے یوسفؑ نے کہا کہ تم جب اپنے آقا کے پاس جاؤ تو اس سے ان باتوں کا ذکر ضرور کرنا جو میں نے تم سے کی ہیں۔

چنانچہ وہ قید سے رہا ہو گیا لیکن شیطان نے اُسے بھلا دیا کہ وہ ان باتوں کا ذکر اپنے آقا سے کرے۔

اس بات کو کئی برس ہو گئے اور یوسفؑ قید میں پڑا رہا۔

وقت گزرتا گیا حتیٰ کہ ایک رات بادشاہ نے عجیب و غریب خواب دیکھا جس کی

تعبیر بتانے سے دربار کے اہل دانش عاجز رہ گئے۔

﴿۱۳﴾ وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَى سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ

عِجَافٌ وَسَبْعٌ سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخْرَىٰ يُبْسِتُ ۗ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ

أَفْتُونِي فِي رَأْيِي إِن كُنْتُمْ لِلرَّءْيِ يَ تَعْبُرُونَ ﴿۱۳﴾ قَالُوا أَضْغَاثُ

لَحْلَامٍ ۗ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِينَ ﴿۱۴﴾

ایک رات بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں جنہیں سات ڈبلی گائیں کھل رہی ہیں اور سات خوشے ہرے ہیں اور سات سوکھے ہوئے۔

اُس نے اپنے درباریوں سے اپنا خواب بیان کیا اور ان سے کہا کہ اگر تم خوابوں کی تعبیر بتا سکتے ہو تو بتاؤ میرے

خواب کی تعبیر کیا ہے؟

انہوں نے کہا کہ یہ خواب نہیں، محض پریشان خیالی ہے۔ اور اس قسم کی پریشان خیالیوں کی تعبیر ہم نہیں جانتے؛ اہل دربار میں جب اس کا چرچا ہوا تو سابقوں کے سردار کو اپنا قید خانہ کا خواب اور حضرت یوسف کی بتائی ہوئی تعبیر اور تعبیر کی صداقت یاد آگئی۔

﴿۱۲﴾ وَقَالَ الَّذِي نَجَّاهُمَا وَادَّكَّرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيلِهِ  
فَأرْسِلُون ﴿۴۵﴾

اُن دو قیدیوں میں سے جس نے رہائی پائی تھی، اُسے (اس خواب کے سلسلہ میں) مدت کے بعد یوسف کی یاد آگئی۔ اُس نے کہا کہ مجھے (قید خانے میں) جانے دو۔ میں تمہیں اس خواب کی تعبیر بتا دوں گا؛ چنانچہ وہ بھاگا بھاگا حضرت یوسف کے پاس پہنچا؛

﴿۱۲﴾ یوسفُ ایہا الصِّدِّیقُ افْتِنَانِي سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ  
سَبْعُ عَجَافٍ وَسَبْعُ سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخْرَىٰ يُسْتَلْعَلَىٰ رَجْعٌ  
إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۴۶﴾

وہ قید خانہ میں آیا اور یوسف سے کہا کہ اے سچی تعبیریں بتانے والے! ہمیں اس خواب کی تعبیر بتاؤ کہ سات موٹی گائیں ہیں جنہیں سات ڈبلی پتلی گائیں بھل رہی ہیں اور سات سبز خوشے ہیں اور (سات) خشک۔ میں اس کی تعبیر کو اُن لوگوں تک پہنچاؤں گا (جنہوں نے مجھے اس مقصد کے لیے یہاں بھیجا ہے) وہ اس سے تمہاری قدر و قیمت پہچان لیں گے؛

غور کیجئے یہ وہی نوجوان ہے جسے حضرت یوسف نے اس کی رہائی کا مزدورہ سنایا تھا اور تاکید کی تھی کہ وہ اس کا ذکر بادشاہ سے کرے۔ لیکن وہ نہ صرف یہ کہ بادشاہ سے اس کا ذکر کرنا بھول گیا بلکہ اظہارِ تشکر کے لیے بھی اُن کے پاس نہ آیا اور اب جبکہ ایک غرض لاحق ہوئی، تو حضرت یوسف یاد آئے۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو سب سے پہلے اس نوجوان سے ان تمام امور کا گلہ کرتا اور معاملہ کی اہمیت کے پیش نظر اس سے کہتا کہ میں تمہیں اس کی تعبیر کیوں بتاؤں؟ بادشاہ کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے تو مجھے یہاں سے نکالے، میں خود جا کر بتاؤں گا۔ لیکن

ایک عام انسان اور اللہ کے مخلص بندوں میں کشادہ نگہی اور وسعتِ ظرف کا یہی فرق ہوتا ہے۔ آپ نے نہ اُس سے کسی قسم کی شکایت کی اور نہ ہی اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ تعبیر بھی بنادی اور اس تعبیر کے ساتھ تدبیر بھی۔

﴿۱۴﴾ قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَابًّا ۖ فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ فِي

سُنْبُلِهِ ۖ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تَأْكُلُونَ ﴿۱۴﴾ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ سَبْعٌ

شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تُحْصِنُونَ ﴿۱۵﴾ ثُمَّ يَأْتِي

مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْرِوْنَ ﴿۱۶﴾

یوسف نے اس سے ایک حرفِ شکایت کہے بغیر کہ تم نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا، کہا کہ میں نہیں اس خواب کی تعبیر بھی بتانا ہوں اور وہ تدبیر بھی جس سے تمہارا ملک آنے والی تباہی سے بچ جائے گا۔ لو سنو، تم لوگ سات سال تک خوب محنت سے کھیتی باڑی کرو۔ اور جب فصل کاٹو تو سوانے اتنے غلے کے جو تمہارے کھانے کے کام آئے، باقی اناج، بالوں کے اندر ہی رہنے دو (تاکہ وہ کیڑوں سے محفوظ رہے)۔

اس کے بعد سات سال ایسے آئیں گے جو (قطع سالی کی وجہ سے) سخت مصیبت کے ہوں گے۔ اس قحط سالی کے زمانے میں وہ سارا غلہ منہا بے کام آنے گا جسے تم نے ذخیرہ کر رکھا ہوگا۔ اس میں سے اتنا ضرور بچا رکھنا جو بیج کے کام آئے)

کیونکہ اس کے بعد جو سال آئے گا اس میں عام بارش ہوگی (اناج بھی بافراط پیدا ہوگا اور انگور بھی) جس کا عرق لوگ پھوٹیں گے یہ

جب بادشاہ نے اس تعبیر اور اس کے ساتھ حسن تدبیر کو سنا تو اس پر حضرت یوسف کی دانش و بینش اور فراد تدبیر کے جوہر آشکارا ہو گئے اور اُس نے فوراً حکم دیا کہ اس شخص کو قید خانے سے رہا کر کے دربار میں لایا جائے۔ چنانچہ بادشاہ کا ناصد رہائی کا حکم لے کر حضرت یوسف کے پاس پہنچا۔

اس مقام پر سیرتِ یوسفیؑ کا ایک اور تابناک گوشہ و خبر شادابی، قلب و نگاہ ہوتا ہے۔ جب تک قرآنِ کریم نہ بتائے، آپ تصور میں بھی نہیں لاسکتے کہ انہوں نے قاصد کو کیا جواب دیا ہوگا! اس لیے کہ اس کے بعد جواب

لہ خواہوں کی حقیقت کے متعلق سورۃ کے آخر میں گفتگو کی جائے گی۔

کیسا؟ قیاس یہی کہتا ہے کہ آپ نے قید و بند کے مصائب سے نجات ملنے کو غنیمت سمجھا ہوگا اور فوراً اُس کے ساتھ دربار میں تشریف لے گئے ہوں گے۔ ہر شخص ایسے موقع پر یہی کچھ کرتا۔ لیکن جس کی خودی میں اتنی بیداری اور جس کے کیریکٹر میں اتنی بلندی پیدا ہو چکی ہو، وہ یہ نہیں کرے گا۔ اس سے الگ کچھ اور کرے گا۔ حضرت یوسف نے کہا کہ بادشاہ کی توجہ فرمائی کا شکر یہ، لیکن میں اس ترخم خسروانہ کے صدقے قید خانہ سے نکلنا نہیں چاہتا۔ بادشاہ سے جا کر کہو کہ پہلے میرے مقدمہ کی تحقیق کرے اور جب ثابت ہو جائے کہ میں بے گناہ ہوں تو پھر میری رہائی کا حکم بھیجے۔ میرا مقصد قید و بند کے مصائب سے خلاصی حاصل کرنا نہیں، اپنی بریت ثابت کرنا ہے۔

﴿۱۲﴾ وَقَالَ الْمَلِكُ اِتُّونِي بِهِ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ اِلَى رَبِّكَ فَسْئَلُهُ مَا بَالُ النَّسُوءِ الَّتِي قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ اِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ﴿۵﴾

جب اُس شخص نے یہ تعبیر اور تدبیر بادشاہ تک پہنچائی تو وہ دنگ رہ گیا۔ اور اُس نے کہا کہ اُس قیدی کو میرے پاس لاؤ (جس نے یہ تعبیر اور تدبیر بتائی ہے)۔ جب بادشاہ کا قاصد یوسف کے پاس آیا (اور اُسے قید سے نکلنے کے لیے کہا۔ تو) یوسف نے کہا (کہ میں اس طرح، ترخم خسروانہ کی بنا پر قید سے نہیں نکلنا چاہتا) تم اپنے آقا کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ (وہ پہلے میرے مقدمہ کی از سر نو تحقیقات کرائے تاکہ) یہ واضح ہو جائے کہ عورتوں کے ہاتھ کاٹ لینے کا ماجرا کیا تھا اور وہ کتنا بڑا فریب تھا جو مجھے پھنسانے کے لیے اختیار کیا گیا تھا۔ اس وقت تو اس حقیقت کا علم صرف میرے خدا کو ہے (لیکن مقدمہ کی تحقیق کے بعد، اس کا علم عام ہو جائے گا کہ قصور کس کا تھا۔ اگر میں اس طرح بے گناہ ثابت ہو گیا تو پھر قید خانے سے باہر آؤں گا)۔

اللہ اکبر! کتنی بلند سیرت کا مظاہرہ ہے۔ لیکن تورات میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ وہاں یہی مذکور ہے کہ حضرت یوسف نے لیا س تبدیل کیا اور فوراً دربار میں چلے گئے۔

تورات کا بیان | تب فرعون نے یوسف کو بلوایا۔ وہ جلد اُسے قید خانے سے لے آئے اور اُس نے سر

منڈایا اور کپڑے بدل کے فرعون کے حضور آیا۔ (پیدائش ۴۱)

یہاں پہنچ کر ہمیں اپنے ہاں کی بھی ایک روایت یاد آگئی۔ تورات کے متعلق ہمارے ہاں کی ایک روایت | تو ہمارا یقین ہے کہ وہ محرف ہے لیکن مقام تاسف ہے کہ ہماری ان کتابوں میں جنہیں "صح الکتب" کہا جاتا ہے، اس سے بھی کچھ زیادہ پایا جاتا ہے۔ بخاری میں ہے کہ حضور نبی اکرم نے فرمایا کہ جیسے بادشاہ کا قاصد آیا تھا، اگر میں حضرت یوسف کی جگہ ہوتا تو فوراً اس کے ساتھ چلا جاتا۔

لَوْلَبِثْتُ فِي السَّجْنِ مَا لَبِثْتُ يَوْسُفَ لَأَجِبْتُ الدَّاعِيَ۔

اگر میں قیدخانہ میں اتنے عرصہ تک رہا ہوتا جتنے عرصہ تک یوسف رہے تھے تو میں قاصد کے ساتھ ہولیتا۔ صاف نظر آتا ہے کہ اس قسم کی روایتیں معاندین اسلام (یہود و نصاریٰ) کی کار فرمایوں کا نتیجہ ہیں جو انبیاء بنی اسرائیل کے مقابلہ میں حضور کی سیرت اقدس کو گھٹا کر پیش کرنا چاہتے تھے بلکہ لیکن جگہ ان پر نہیں، انہوں پر ہے کہ یہ اس قسم کی روایتوں کو سینہ سے لگائے لگائے پھرتے ہیں اور اگر حضور کی عظمت و لادنس کا خیال کسی کو اس امر پر مجبور کر دے کہ وہ ان روایات کو حضور کی طرف منسوب کرنے کی جرأت نہ کرے تو اس کی تکفیر و تفسیق کے فتاویٰ صادر کر دیئے جاتے ہیں، اور یہ سب کچھ اس لیے کہ یہ روایتیں بخاری اور مستم کی کتابوں میں درج ہیں۔ یعنی حضور کی شان اقدس میں (معاذ اللہ) طعن پایا جائے تو مضائقہ نہیں لیکن بخاری اور مستم میں غلط روایات کے امکان کا خیال نہ پیدا ہونے پائے۔ بایں ہمہ حقیقت ہیں نگاہوں سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ غلطی سے مبرا اس آسمان کے نیچے کتاب اللہ کے سوا کچھ نہیں۔

وَذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (۱۲)

۴۵

فرعون، حضرت یوسف کی دانش و بینش کا تو پہلے ہی مغزف ہو چکا تھا، جب آپ کا یہ جواب سنا تو آپ کی بلند سیرت کا احترام بھی اُس کے دل میں اُتر گیا۔ اُس نے فوراً تحقیقات کا حکم دے دیا اور ان عورتوں سے دریافت کیا کہ بتاؤ اصل معاملہ کیا ہے۔

قَالَ مَا خَطْبُكُمْ إِذْ رَأَوْتَنِي يَوْسُفَ عَنْ نَفْسِهِ ط قُلْنَ

لے اس قسم کی ایک اور سازش کے متعلق مطالب الفرقان جلد سوم (ص ۷۶) دیکھئے جہاں بتایا گیا ہے کہ ان روایات کی رو سے نمازوں کی تعداد کس طرح متعین ہوئی تھی اور پھر یہ روایات کہ حضور ایک عرصہ بعید تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ (مطالب الفرقان جلد سوم، ص ۷۶)

## حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْعٍ ط...

دچنانچہ بادشاہ نے اس مقدمہ کی خود تحقیق کی، اور ان عورتوں سے کہا کہ سچ سچ بتاؤ کہ جب تم نے یوسف کو اُس کے ارادے سے پھیرنا چاہا، تو اُس وقت کیا بات پیش آئی تھی؟

انہوں نے کہا حاشا للہ! ہم نے یوسف میں کوئی بُرائی کی بات نہیں دیکھی تھی۔ (یہ بالکل بے گناہ ہے)

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہاں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان عورتوں نے بھی حضرت یوسف کو اپنی نظر مائل کرنا چاہا تھا اور مجلسِ ضیافت کی تمام حیلہ جو نیاں اور فریب کاریاں اسی غرض کے لیے تھیں اور اس کے بعد حضرت یوسف کو قید خانہ میں بھجوانا بھی انہیں کے دامِ تزویر کی ایک کڑی تھی جو امراء العزیز کے ایما پر مرتب کی گئی تھی۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ حضرت یوسف نے امراء العزیز کا نام نہیں لیا۔ صرف ان عورتوں کی طرف اشارہ کیا (۱۲/۱۳) اس لیے کہ تمہیں پھٹنے والے واقعہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ عزیز نے حضرت یوسف سے کہا تھا کہ اس معاملہ کو رفتِ گزشت سمجھو۔ حضرت یوسف کو ابھی تک اس بات کا خیال تھا اس لیے اپنے مرتب کی بات کا پاس کیا اور اُس کی بیوی کا نام لینا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن جب عورتوں کے معاملہ کی تحقیق ہوئی تو سب کچھ بے نقاب ہو گیا۔ اس دوران میں عزیز مصر کی بیوی کے جذبات کی آندھیاں بھی اُتر چکی تھیں اور وہ حضرت یوسف کی بلند سیرت کی قائل ہو چکی تھی۔ لاکھ جذباتِ انتقام ہوں، سیرت کی بلندی اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ جب دوسری عورتوں نے حضرت یوسف کی پاکیزگی و اماں کی قسم کھائی تو اُس سے بھی نہ رہا گیا، اور

## حقیقتِ نقاب

اُس نے برملا کہہ دیا کہ ان کا معاملہ تو ایک طرف، خود میرے معاملہ میں بھی یوسف کا کوئی قصور نہ تھا۔

قَالَتْ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ اَنْ حَصَّصَ الْحَقُّ زَانَا رَاوَدْتُهُ عَنْ

نَفْسِهِ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۵۱﴾

یہ سن کر عزیز کی بیوی بھی لب کشائی پر مجبور ہو گئی اور اس نے ٹھکی ہوئی ٹکٹا ہوں اور لرزتے ہوئے ہونٹوں کے

ساتھ کہا۔ اب جبکہ حقیقت اس طرح بے نقاب ہو گئی ہے تو مجھے اس کا اقرار کر لینا چاہیے کہ وہ میں ہی تھی جس

نے یوسف کو پھسلانا چاہا تھا۔ بے شک یوسف اپنے بیان میں بالکل سچا ہے؛

اس پر حضرت یوسف نے کہا:

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّي لَمْ أَخْنُفْ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي

### كِدَّ الْخَائِنِينَ ﴿۵۲﴾

یوسفؑ نے کہا کہ میں نے اس مقدمہ کی از سر نو تحقیق پر اس لیے بھی زور دیا تھا کہ میرے مرتب اور مہربان (عزیز) کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے، اس کی امانت میں خیانت نہیں کی تھی اور یہ کہ خدا کا قانون مکافات خیانت کرنے والوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ (خیانت اس کی بیوی نے کی تھی۔ وہ خاسر و نامراد سامنے کھڑی ہے۔ میں امین تھا۔ آخر الامر کامیابی میرے ہی حصّہ میں آئی)۔

### تیرہواں پارہ شروع

پھر عزیز مصر کی بیوی نے اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا:

وَمَا اَبْرِيْ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَامَّارَةٌ بِالسُّوْءِ اِلَّا مَا رَحِمَ

### رَبِّيْ ۗ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾

عزیز کی بیوی نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میں اپنے بے گناہ ہونے کا دعویٰ نہیں کرتی، میرے نفس نے مجھے بہکا دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے حیوانی جذبات اُسے بُرائی کے لیے اکساتے رہتے ہیں۔ اس سے ہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جس پر خدا رحم کرے۔ وہی اس قسم کی لغزشوں سے محفوظ رکھنے والا اور رحمت کرنیوالا ہے! کون تھا جس کے دل میں سیرتِ یوسفی کی اس درخشندگی سے احترام و عظمت کے جذبات بیدار نہ ہو جلتے، ادب و بینش، تدبیر و فراست کے ساتھ، سیرت کی اتنی بلندی اور کیر کھڑکی اتنی سُنجی۔ بادشاہ کی نگہ جو ہر شناس نے فوراً اس گنڈن کو پہچان لیا۔

وَقَالَ الْمَلِكُ اَتُّونِيْ بِهٖ اَسْتَخْلِصُهٗ لِنَفْسِيْ ۚ فَلَمَّا كَلَمَتْهٗ

### قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اٰمِيْنٌ ﴿۵۳﴾



بادشاہ نے (حقیقتِ حال سے باخبر ہونے کے بعد) کہا۔ یوسف کو میرے پاس لاؤ۔ میں اُسے دوسروں سے ممتاز کر کے، خاص اپنے لیے منتخب کر لینا چاہتا ہوں۔ (وہ میرا مشیرِ خاص ہوگا) چنانچہ جب بادشاہ نے یوسف سے بات چیت کی (تو اس کے اور جوہر بھی اُس پر نمایاں ہو گئے)۔ اس نے کہا۔ آج سے تم ہماری جگہاں میں بڑی عزت و تمکین کے مالک قرار پانے لگے ہو۔ منہجاری امانت اور دیانتِ مسلم ہے۔

اللہ اکبر! کنعان کا چرواہا، بازارِ مصر میں نیلام شدہ غلام، برسوں کا قیدی اور بادشاہ کی طرف سے ان الفاظ کا مخاطب:

إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ (۱۲/۵۵)

حضرت یوسف نے سلطنت کے نظم و نسق کے مختلف شعبوں پر نگاہ ڈالی اور اندازہ لگایا کہ کس شعبہ کو اپنے ہاتھ میں رکھنے سے باقی انتظامات صحیح رُخ اختیار کر لیں گے۔

قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۗ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ﴿۵۵﴾

یوسف نے بادشاہ سے کہا کہ (مملکتِ مصر کی خوشحالی کا راز، اُس کی زمین کے خزانوں میں مضمر ہے) تم ان خزانوں (زمین کی پیداوار اور معاشی معاملات) کو میری تحویل میں دے دو۔ میں ان کی حفاظت کروں گا۔ اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ یہ کس طرح کیا جاتا ہے۔

غور کیجئے۔ جب حضرت یوسف عزیز کے محلات میں پہنچے تھے اور وہاں کا نظم و نسق ان کی تحویل میں دے دیا گیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَ لِنُعَلِّمَهُۥ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاٰحَادِيْثِ ۗ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖۙ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۲/۵۵)

جس شخص نے یوسف کو خریدا تھا وہ (اُسے اپنے گھر لے آیا اور) اپنی بیوی سے کہنے لگا کہ (اس لڑکے کے ساتھ عام غلاموں کا سا برتاؤ نہ کرنا بلکہ) اسے عزت کے ساتھ رکھنا (کیونکہ اس کے چہرے بَشَر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی اچھے گھرانے کا لڑکا ہے۔ اس لیے) ہو سکتا ہے کہ یہ ہمارے لیے کسی فائدے کا موجب بن جائے یا ہم اسے اپنا بیٹا ہی بنا لیں۔

اس طرح ہم نے سرزمینِ مصر میں یوسف کے پاؤں جمادیے اور ایسا انتظام کر دیا کہ اس کی اچھی طرح سے تعلیم و تربیت ہو جائے اور اس میں معاملہ فہمی اور واقعات سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اللہ اپنی اسکیموں کو کامیاب بنا کر رہتا ہے لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں کہ ایسا کیوں اور کس طرح

ہو رہا ہے۔

یعنی اس ممکن سے غرض یہ تھی کہ حضرت یوسف کے لیے معاملات فہمی اور حسن تدبیر کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ اس عملی تعلیم کا یہ نتیجہ تھا کہ آج حضرت یوسف اتنے بڑے انتظام کو سنبھالنے کے قابل ہو گئے۔ یہاں پہنچ کر فرمایا:

﴿۱۲/۵۶﴾ وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ ۖ يَتَّبِعُوا مِنْهَا حَيْثُ

يَشَاءُ ۖ طُ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۷﴾

اس طرح ہم نے یوسف کو، مملکت مصر میں، صاحب اختیار بنا دیا۔ ایسا صاحب اختیار کہ وہ اس کے نظم و نسق کو جس طرح چاہتا چلا تا۔ ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق، لوگوں کو اپنی رحمت سے نوازتے ہیں۔ اور وہ قانونِ مشیت یہ ہے کہ جو شخص حسن کارنامہ انداز سے زندگی بسر کرے، ہم اس کی محنت ضائع نہیں کرتے۔ اُسے اُس کا اجر مل کر رہتا ہے۔

تَمَكَّنَ فِي الْأَرْضِ — اور ایسا ممکن کہ آپ کے اختیارات میں کوئی دخل انداز نہ ہو۔ جہاں چاہیں اپنا حکم چلائیں۔ دُنیا میں حسن عمل اور نظہیر فکر و نظر کی اس سے بڑی جزا اور کیا ہو سکتی ہے۔ باقی رہی اس دُنیا سے اگلی منزل، سو وہاں کے مناصب و مدارج کے کیا کہنے:

﴿۱۲/۵۷﴾ وَلَا جِزَاءَ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿۵۷﴾

حسن عمل کے ایسے خوشگوار نتائج اسی دنیا تک محدود نہیں رہتے، یہ آخرت کی زندگی میں بھی مسلسل ساتھ جاتے ہیں اور وہاں ان کی کیفیت، اس دنیا کی خوشگوار یوں سے بھی زیادہ اچھی ہوتی ہے۔

جو لوگ بھی قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں اور تخریبی روش سے بچ کر، ان کے مطابق زندگی بسر کریں، انہیں یہ سب کامنیاں نصیب ہو جاتی ہیں۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حضرت یوسف نے زمین سے متعلق انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور انہیں اس کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ملک کو قحط سے دوچار ہونے کا خطرہ لاحق ہے۔ اس کی روک تھام (بلکہ ملک کے معاشی نظام) کے سلسلہ میں انہوں نے کیا تدابیر اختیار کی تھیں، قرآن کریم میں ان کا ذکر نہیں آیا۔ تو آیت میں

سے جس طرح اور جس مقصد کے لیے حضرت موسیٰ کو فرعون کے عملات میں پہنچایا گیا تھا۔ (مطالب الفرقان جلد پنجم ص ۳۴۲)

البتہ اس کی تفصیل دی گئی ہے۔ تو آت کے بیانات یقینی نہیں سمجھے جاسکتے کیونکہ اس میں تحریف ہو چکی ہے لیکن اُن ارضی انتظامات کے سلسلہ میں اس میں جو کچھ آیا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت یوسف نے اس ضمن میں کس قسم کی تدابیر اختیار کی تھیں۔ کتاب پیدائش۔ باب ۴۴ میں ہے،

اور وہاں تمام زمین پر کہیں روٹی نہ تھی، اس لیے کہ کال ایسا سخت تھا کہ مصر کی سرزمین اور کنعان کی زمین کال کے سبب سے تباہ ہو گئی تھی۔ حضرت یوسف نے ساری نقدی جو ملک

**نظام یوسفی**

مصر اور کنعان کی سرزمین میں موجود تھی، اُس غلہ کے بدلے میں جو لوگوں نے مول لیا، جمع کی اور یوسف نے اُس نقدی کو فرعون کے گھر لایا۔ اور جب ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں نقدی کم ہوئی تو سارے مصریوں نے آکر یوسف سے کہا کہ ہم کو روٹی دے کہ ہم تیرے ہوتے ہوئے کیوں مریں؟ کیونکہ نقدی چمک گئی۔ یوسف نے کہا کہ اپنے چوپائے دو اگر نقدی چمک گئی کہ میں تمہارے چوپایوں کے بدلے تمہیں روٹی دوں گا۔ وہ اپنے چوپائے یوسف کے پاس لائے اور یوسف نے گھوڑوں اور بھیڑ بکری اور گائے بیل کے گلوں اور گدھوں کے بدلے اُن کو روٹیاں دیں۔ اور اُس نے ان کے سب چوپایوں کے بدلے میں انہیں اس سال پالا۔ جب وہ سال گزر گیا، وہ دوسرے سال اس کے پاس آئے اور اُسے کہا کہ ہم اپنے خداوند سے نہیں چھپاتے کہ ہمارا نقد ختم ہو چکا۔ ہمارے خداوند نے ہمارے چوپاؤں کے گلے بھی لے لیے۔ سو ہمارے خداوند کی نگاہ میں ہمارے بندوں اور زمینوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہا پس ہم اپنی زمین سمیت تیری آنکھوں کے سامنے کیوں ہلاک ہوں؟ ہم کو اور ہماری زمین کو روٹی پر مول لے لو اور ہم اپنی زمین سمیت فرعون کی غلامی میں رہیں گے اور دانہ دے تاکہ ہم جنیں اور نہ مریں کہ زمین ویران نہ ہو جائے اور یوسف نے مصر کی ساری زمین فرعون کے لیے مول لی۔ کیونکہ مصریوں میں سے ہر شخص نے اپنی زمین بچی کہ کال نے ان کو پنٹ تنگ کیا تھا۔ سو زمین فرعون کی ہوئی۔ یہے لوگ سو اُس نے انہیں شہروں میں مصر کی اطراف کی ایک حد سے دوسری حد تک بسایا۔ اُس نے صرف کاہنوں کی زمین مول نہ لی کیونکہ وہ کاہن فرعون کی دی ہوئی جاگیر رکھتے تھے۔ اور اپنی جاگیر جو فرعون نے انہیں دی تھی کھاتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی زمینوں کو نہ بیچارے یوسف نے لوگوں سے کہا کہ دیکھو! میں نے آج کے دن تم کو اور تمہاری زمین کو فرعون کے لیے مول لیا۔ لویہ بیچ تمہارے لیے ہے۔ کھیت بوؤ اور جب یہ زیادہ ہو تو یہ ہوگا کہ تم پانچواں حصہ فرعون کو دو گے اور چار حصے کھیت میں بیچ بونے

اور تمہاری خوراک اور ان کی جو تمہارے گھرانے کے ہیں اور تمہارے بچوں کی خوراک کے لیے ہوں گے۔ وہ بولے کہ تو نے ہماری جانیں بچائیں۔ ہم اپنے خداوند کے حضور میں موردِ رحم ہوں اور ہم فرعون کے خادم ہوں گے اور یوسفؑ نے ساری مصر کی زمین کے لیے یہ آئین بنایا جو آج کے دن تک مقرر ہے کہ فرعون پانچواں حصہ لے گا، مگر کاہنوں کی زمین فرعون کی نہ ہوئی۔

اقتباس بالا سے ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ نے جب علتِ مرض پر غور کیا تو انہوں نے دیکھا کہ ملک کی معاشی بدحالی کا سبب یہ ہے کہ زمین پر بڑے بڑے زمیندار قابض ہیں۔ انہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے جس سے وہ زمیندار مجبور ہو گئے کہ زمینیں حکومت کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ اس طرح تمام مزرعہ زمینیں انفرادی ملکیت سے نکل کر حکومت کی ملکیت میں آ گئیں۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے اس زمین کو کاشت کاروں میں تقسیم کر دیا اور انہیں آسانیاں بہم پہنچائیں تاکہ وہ خود کاشت کر سکیں۔ اب یہ کاشت کار اپنی محنت کے ما حاصل کے آپ مالک تھے زمیندار کاشت کار کی محنت کے ما حاصل میں شریک نہیں تھے۔ تفصیل کے لیے میری کتاب ”نظامِ ربوبیت“ دیکھئے۔

اس کے بعد قحط سالی شروع ہوئی تو مصر کے ارد گرد کے علاقوں کے لوگ بھی غلہ لینے کے لیے اسی چشمہ فیض کی طرف آنے شروع ہوئے۔ حضرت یعقوبؑ کا قبیلہ بھی اسی مصیبت میں گرفتار ہوا تو برادرانِ یوسفؑ غلہ لینے آئے۔ حضرت یوسفؑ نے انہیں پہچان لیا لیکن چونکہ یہ بات ان کے بھائیوں کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ یوسفؑ اس مقام بلند پر فائز ہوگا، اس لیے انہوں نے آپ کو نہ پہچانا۔

﴿۱۲﴾ ۵۸ وَجَاءَ إِخْوَتُهُ يُوسُفَ فَمَا خَبَا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ

لَهُ مُنْكَرُونَ ﴿۵۸﴾

اس واقعہ پر کئی سال گزر گئے۔ اس کے بعد ملک میں قحط پڑا تو دور و نزدیک سے لوگ غلہ لینے کے لیے دارالسلطنت میں آنے لگے۔ اس سلسلہ میں یوسفؑ کے بھائی بھی آئے۔ یوسفؑ نے انہیں پہچان لیا لیکن وہ اُسے نہ پہچان سکے۔ اس لیے کہ یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ یوسفؑ اس مقام پر فائز ہوگا۔

ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اُن سے ”اُن کے گھر کے تمام حالات کرید کرید کر پوچھے ہوں گے اور اس طرح باتوں باتوں میں یہ بھی اُن سے کہلوایا ہوگا کہ ان کا ایک سوتیلا بھائی اور بھی ہے جو باپ کے پاس ہے۔ چنانچہ وہ واپس جانے لگے تو آپ نے اُن سے کہا کہ اب لوٹ کر آنا تو اپنے سوتیلے بھائی (سن یا مین) کو بھی ساتھ لانا۔

﴿۱۲/۵۹﴾ وَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَّازِهِمْ قَالَ اِنتُونِي بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اٰيٰتِكُمْ اَلَا تَرَوْنَ اَنِيْ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۵۹﴾  
 ﴿۶۰﴾ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ﴿۶۰﴾

جب یوسفؑ نے اُن کے لیے غلہ وغیرہ لدا دیا تو جاتے وقت اُن سے کہا کہ اب کے جو آؤ تو اپنے ساتھ اپنے اس بھائی کو بھی لیتے آنا (جس کے متعلق تم نے کہا ہے کہ وہ باپ کی طرف سے تمہارا بھائی ہے۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ (میں کوئی مستبد حاکم نہیں جو کسی پر ظلم و زیادتی کروں گا)۔ میں باپ تول بھی پورا دیتا ہوں اور باہر سے آنے والوں کی مہمان نوازی بھی کرتا ہوں۔ (اس لیے تمہارے باپ کو جس کے متعلق تم نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ وہ اُس بیٹے کو باہر بھیجنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ اُسے یہاں بھیجنے پر کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے) اگر تم اُسے میرے پاس نہ لائے تو ذرا تمہیں غلہ مل سکے گا اور نہ ہی تم میرے قریب آسکو گے۔

انہوں نے کہا:

﴿۱۲/۶۱﴾ قَالُوْا سَنُرٰوِدُّعِنْدَهٗ اٰبَاہٖ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

انہوں نے کہا ہم پوری کوشش کریں گے کہ ہمارا باپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرے اور ہمیں یقین ہے کہ ہم اس باب میں کامیاب ہو جائیں گے اور اپنے بھائی کو اپنے ساتھ لے کر حاضرِ قدمت ہوں گے۔  
 حضرت یوسفؑ نے ان کے دوبارہ آنے کے امکان کو مزید پختہ کرنے کے لیے اُن کی پونجی بھی اُن کی بوریوں میں رکھوا دی۔

﴿۱۲/۶۲﴾ وَقَالَ لِغُلٰمِيْہٖ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِیْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّہُمْ یَعْرِفُوْنَہَا

اِذَا انْقَلَبُوْا اِلٰی اٰہْلِہُمْ لَعَلَّہُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۶۲﴾

یوسف نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ ان لوگوں کی رقم جس کے عوض انہوں نے غلہ خریدا ہے (میری طرف سے) ان کی بوریوں میں اس طرح رکھ دو کہ جب یہ گھر پہنچ کر اپنا سامان کھولیں تو ایہ رقم ان کے سامنے آجائے اور یہ پہچان لیں کہ یہ انہی کی رقم ہے اور اس طرح یہ دوبارہ غلہ لینے کے لیے آجائیں۔

انہوں نے واپس جا کر حضرت یعقوب سے ”امیر مصر“ (یعنی حضرت یوسف) کی شرط بیان کی :

﴿۱۲﴾ فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَىٰ أَبِيهِمْ قَالُوا يَا أَبَانَا مَنَعَنَا الْكَيْلُ فَأَرْسِلْ مَعَنَا

أَخَانَا نَكْتَلُ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿۱۳﴾

چنانچہ جب وہ لوٹ کر اپنے باپ کے پاس گئے تو انہوں نے (دیگر واقعات بیان کرنے کے بعد) کہا کہ ہم سے کہا گیا ہے کہ ہمیں دوبارہ غلہ اسی صورت میں ملے گا کہ تم اپنے بھائی کو بھی ساتھ لاؤ (اگر ایسا نہ کیا تو، غلہ ملنا تو ایک طرف، تم میرے قریب تک نہیں پھٹک سکو گے، لہذا آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیں تاکہ ہم غلہ لاسکیں۔ اور ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم اس کی پوری پوری حفاظت کریں گے۔

اس پر حضرت یعقوب نے فرمایا:

﴿۱۲﴾ قَالَ هَلْ أَمْنَكُمُ عَلَيْهِ الْإِكْمَا أَمْنَكُمُ عَلَىٰ أَخِيهِ مِنْ قَبْلُ

فَاللَّهُ خَيْرٌ حِفْظًا وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّحِيمِينَ ﴿۱۳﴾

اس پر حضرت یعقوب نے کہا کہ کیا میں اس کے بارے میں بھی تم پر اسی طرح اعتبار کروں جس طرح اس سے پہلے، اس کے بھائی (یوسف) کے بارے میں تم پر اعتبار کیا تھا؟ اس لیے میں اسے تمہاری حفاظت میں نہیں دے سکتا، یہ اللہ ہی کی حفاظت میں رہے گا کیونکہ وہی سب سے بہتر محافظ اور سامانِ رحمت مہیا کرنے والا ہے۔

اس کے بعد جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو اس میں اپنی پونجی موجود پائی تو اس پر انہوں نے حضرت یوسف کی توقع کے مطابق، باپ سے مزید اصرار شروع کر دیا۔

﴿۱۲﴾ وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ قَالُوا يَا بَانَا مَا نَبغِي هَذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا وَنَمِيرُ أَهْلَنَا وَنَحْفَظُ أَخَانَا

## وَنَزِدَاكَ كَيْلَ بَعِيرٍ ذَٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيرٌ ﴿۶۵﴾

پھر جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ غلے کے ساتھ، ان کی رقم بھی واپس کر دی گئی ہے۔ اس پر انہوں نے اپنے باپ کا کہا کہ ہمیں اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے کہ ہمیں غلہ بھی مل جائے اور قیمت بھی ٹوٹا دی جائے۔ (اب آپ سوچئے کہ اگر ہم محض اس لیے غلہ لینے نہ جا سکتے کہ آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ نہیں بھیجنا چاہتے تو اس سے کس قدر نقصان ہوگا؛ لہذا ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور اپنے گھرانے کے لیے غلہ لے آئیں۔ ہم اس کی پوری پوری حفاظت کریں گے۔) اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہم اس کے حصہ کا ایک اُونٹ کا بوجھ اور بھی لاسکیں گے۔ جو غلہ ہم لائے ہیں وہ بہت تھوڑا ہے۔  
یونہی ختم ہو جائے گا۔

بالآخر حضرت یعقوبؑ نے ان سے اللہ کے نام پر عہد لیا کہ وہ بن یامین کو بخیریت واپس لے آئیں گے اور اس کے بعد اُسے جانے کی اجازت دی۔

﴿۱۲﴾ قَالَ لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتَّى تُؤْتُوا مَوْثِقًا مِنَ اللَّهِ لَتَأْتُنَّنِي

بِهِ إِلَّا أَنْ يُحَاطَ بِكُمْ فَلَمَّا آتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللَّهُ عَلَىٰ مَا

## نَقُولُ وَعَكِيْلٌ ﴿۶۶﴾

باپ نے کہا کہ (اب جو تم مجھے اس طرح مجبور کر رہے ہو تو میں اسے تمہارے ساتھ بھیج دیتا ہوں لیکن اس شرط پر کہ تم اللہ کو درمیان میں رکھ کر میرے ساتھ اقرار کرو کہ تم اسے میرے پاس ضرور واپس لے آؤ گے، بجز اس کے کہ تم خود ہی کہیں گے کہ تمہاری طرف سے اس طرح بالکل بے بس ہو جاؤ) جب انہوں نے اس بات کا عہد دے دیا تو اس نے کہا کہ ہم نے جو باہمی قول و اقرار کیا ہے، اللہ اس پر نگہبان ہو۔

تورات میں ہے کہ جب حضرت یوسفؑ کے بھائی پہلی مرتبہ مصر گئے ہیں تو ان پر جاسوسی کا شبہ گزرا تھا حضرت یعقوبؑ کے دل میں یہ کھٹکا تھا کہ مبادا ان پر دوبارہ کچھ ایسا ہی شبہ گزر جائے اور یہ گھبر لیے جائیں اور ان کے ساتھ بن یامین بھی مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔ اس لیے انہوں نے احتیاطاً ان سے کہا کہ مصر میں داخل ہونا تو ایک جھٹکے کی صورت میں نہ جانا، الگ الگ دروازوں سے شہر میں داخل ہونا۔

﴿۱۲﴾ قَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ وَاَدْخُلُوا مِنْ اَبْوَابٍ

مُتَّفَرِّقَةً ۭ وَ مَا أُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا

لِلَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿۶۵﴾

جب وہ جانے لگے تو باپ نے ان سے کہا کہ (دیکھو بیٹا!) جب تم اُس شہر میں جاؤ تو سب کے سب ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا، الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا۔ اگٹھے داخل ہوئے تو اجنبیوں کا ایک جتھہ دیکھ کر شہر والوں کی نظر میں خواہ مخواہ تمہاری طرف اٹھنے لگ جائیں گی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ یہ میرے دل میں یونہی ایک خیال سا آ گیا ہے جس کی بنا پر میں نے یہ بات احتیاطاً تم سے کہہ دی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ اس کے بعد تم ہر خطرہ سے مامون ہو جاؤ گے اور تمہیں کسی احتیاط اور انتظام کی ضرورت نہیں ہے گی، میری یہ احتیاطی تدبیر تمہیں کسی چیز سے بے نیاز نہیں کر سکتی جو (وقت اور موقع کے لحاظ سے) قانونِ خداوندی کے مطابق کرنی چاہیے۔ یاد رکھو! امن اور خطرہ، نفع اور نقصان سب خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کے سوا کسی اور کو اس کا اختیار نہیں۔ میرا بھروسہ بھی اسی پر ہے (اور تمہیں بھی اسی پر اعتنا کرنا چاہیے۔ اور ایک میں اور تم ہی کیا، ہر بھروسہ کرنے والے کو اس پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

اس کے بعد ہے:

﴿۱۲﴾ وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمُ ۚ مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ

مِّنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةٌ فِي نَفْسٍ يَعْقُوبَ قَضَاهَا ۚ وَ

إِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۶۶﴾

چنانچہ ان بھائیوں کا قافلہ اسی طرح شہر میں داخل ہوا جس طرح باپ نے کہا تھا۔ لیکن (جیسا کہ ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا) یہ تدبیر اس واقعہ کو روک نہیں سکتی تھی جو قانونِ خداوندی کی رُو سے یہاں پیش آنے والا تھا (اور جس کی رُو سے بن یامین کو یہاں روک لیا جانا تھا)۔ یہ تدبیر احتیاط محض ایک خیال کا نتیجہ تھی جو یعقوب کے دل میں پیدا ہوا اور جس کی خُش کو اُس نے اس طرح دور کر لیا۔ یہ خیال بھی علم و دانش پر مبنی تھا (یونہی تو ہم پرستی نہیں تھا) اس لیے کہ یعقوب کو ہم نے علم و فراست عطا کر رکھی تھی۔ وہ علم و فراست جس سے اکثر لوگ محروم ہوتے ہیں۔



جب یہ قافلہ حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچا تو آپ نے اپنے بھائی (بن یامین) کو بتا دیا کہ میں تیرا بھائی ہوں۔  
تمکین نہ ہو۔

﴿۱۲﴾ وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ أُوِيَ إِلَيْهِ أَخَاهُ قَالَ إِنِّي أَنَا خُوكَ

فَلَا تَبْتَسِ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۶۹﴾

جب یہ لوگ یوسفؑ کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس ٹھہرایا اور اُسے بتا دیا کہ میں تیرا  
بھائی (یوسف) ہوں اور ساتھ ہی اس کی بھی تلقین کر دی کہ دو سکر بھائیوں نے میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا  
اس کی وجہ سے تم رنجیدہ خاطر نہ ہونا۔

حضرت یوسفؑ ہزار دل سے چاہتے ہوں گے کہ بن یامین اُن کے پاس رہ جائے لیکن یہ نہیں ہو سکتا تھا  
تا وقتیکہ اُسے یا تو یونہی روک لیتے یا بھائیوں پر اس راز کا انکشاف کر دیتے کہ وہ کون ہیں؟ اول الذکر فرج القلم  
تھا، اس لیے کہ قانونِ مملکت اس کی اجازت نہیں دیتا تھا اور استبدادِ آپ کی ذات سے ناممکن تھا۔ دوسری  
طرف بھائیوں پر اس راز کا انکشاف ابھی قبل از وقت تھا۔ اس لیے آپ نے مجبوراً دل پر پتھر رکھ کر اُن کے ساتھ  
بھائی کو بھی الوداع کہہ دیا۔ حضرت یوسفؑ نے اُن کی واپسی کا سامان مہیا کر دیا۔ جب یہ سامان سفر تیار ہو رہا تھا  
تو اُن بھائیوں میں سے ایک نے چپکے سے حضرت یوسفؑ کا شاہی کٹورا بن یامین کی لوری میں رکھ دیا۔ نیت یہ ہوگی  
کہ اگر کسی کی نگاہ نہ پڑی تو کٹورا گھر پہنچ جائے گا اور اگر پتہ چل گیا تو بن یامین بدنام ہوگا اور باپ کی نظروں سے  
گر جائے گا۔

اس کے بعد قافلہ روانہ ہو گیا۔ جب محلات کے کارندوں نے مختلف چیزوں کا جائزہ لیا تو شاہی کٹورا کو وہاں نہ  
پایا۔ چونکہ یہ کنعانی قافلہ وہاں ٹھہرا تھا اس لیے اُن کا لامحالہ انہیں پر شبہ گزرا۔ وہ اُن کے پیچھے گئے اور انہیں آواز  
دے کر ٹھہرایا اور پوچھا کہ کیا تم پیالہ لے آئے ہو؟

﴿۱۲﴾ فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَّازِهِمْ جَعَلَ السَّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ

أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيبُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ﴿۷۰﴾ قَالُوا وَأَقْبَلُوا

عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقَدُونَ ﴿۷۱﴾ قَالُوا نَفَقْدُ صَوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ

## جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ ﴿۴۱﴾

جب یوسف نے ان کا (واپسی کا) سامان تیار کر دیا تو (اُن بھائیوں میں سے ایک نے) شاہی کٹورا بنیامین کی بوری میں رکھ دیا کہ اگر پتہ نہ چلا تو کٹورا گھر پہنچ جائے گا اور اگر پتہ چل گیا تو بنیامین بدنام ہوگا جب اُن کی روانگی کے بعد یوسف کے آدمیوں نے دیکھا کہ کٹورا گم ہے تو اُن میں سے ایک پکارنے والے نے

پکارا کہ اوقانہ والوا اھٹھرو۔ تم چور ہو۔ (۱۲/۲۵، ۱۲/۲۶، ۱۲/۲۷)

وہ یوسف کے آدمیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ تمہارا کیا گم ہو گیا ہے (جو ہمیں چور ٹھہرانے ہو)!

انہوں نے کہا کہ شاہی کٹورا گم ہو گیا ہے۔ جو شخص اُسے ڈھونڈ نکالے اُسے ایک بار شتر انعام ملے گا (ان

کارندوں کے سردار نے کہا کہ) اس کا میں ضامن ہوں (کہ یہ انعام ضرور ملے گا)

ہم نے جو یہ لکھا ہے کہ برادرانِ یوسف میں سے ایک نے یہ کٹورا بنیامین کی بوری میں رکھ دیا تھا تو اس کی دلیل یہ ہے کہ اگے چل کر جب حضرت یوسف نے اپنے متعلق بھائیوں کو بتایا کہ وہ یوسف ہیں تو اُن سے کہا کہ۔ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَ اٰخِيهِ (۱۲/۲۶) تمہیں معلوم ہے کہ تم نے یوسف اور اُس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا؟۔ بن یامین کے ساتھ اُنہوں نے خاص طور پر کیا کیا تھا، اس کا ذکر اس قصے میں نہیں، بجز اس مقام کے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ بن یامین کی بوری میں یہ کٹورا انہی بھائیوں میں سے کسی نے رکھا تھا اور یہی وہ سازش تھی جس کی طرف حضرت یوسف نے اشارہ کیا تھا۔

بہر حال شاہی کارندوں نے اُن سے پوچھ گچھ شروع کی اور اُنہوں نے قسمیں کھانی شروع کر دیں کہ ہم چور نہیں ہم تو ایک مرتبہ پہلے بھی یہاں آچکے ہیں۔ تم نے دیکھ لیا تھا کہ ہم نے کسی قسم کی کوئی خرابی نہیں کی تھی۔

﴿۱۲/۲۶﴾ قَالُوا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا

## سَارِقِينَ ﴿۴۲﴾

یوسف کے بھائیوں نے کہا کہ خدا شاہد ہے کہ ہم یہاں اس لیے نہیں آئے کہ کسی قسم کی شرارت پیدا کریں یا قانون شکنی کریں (ہم یہاں پہلے بھی آچکے ہیں۔ اس لیے) تم ہمارے متعلق جانتے ہو کہ ہمارا اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں۔ یقین مانئے! ہم چور نہیں ہیں۔

شاہی کارندوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ یونہی سہی۔ لیکن یہ بتاؤ کہ اگر تلاشی لینے پر پیالہ تمہارے پاس نکل

آیا تو اس کی کیا سزا؟

﴿۱۲/۴۳﴾ قَالُوا فَمَا جَزَاءُكَ إِنْ كُنْتُمْ كَذِبِينَ ﴿۴۳﴾

شاہی کارندوں نے کہا کہ اگر تم جھوٹے نکلے تو اس کی کیا سزا؟ انہوں نے جواب دیا کہ سزا واضح ہے۔ جو چور ہو وہ اپنے جرم کی پاداش میں اپنی سزا آپ بن جائے۔ یعنی اُسے روک لیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں کا یہی دستور ہے۔

﴿۱۲/۴۴﴾ قَالُوا جَزَاءُكَ مَنْ وَجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاءُكَ كَذَلِكَ

نَجَزِي الظَّالِمِينَ ﴿۴۴﴾

(اُن میں سے جنہیں معلوم تھا کہ کٹورا کس کی بوری میں ہے ۱۲) کہا کہ جس کی بوری میں کٹورہ نکلے، وہ اس کے بدلے میں دھر لیا جائے۔ ہم اپنے ہاں مجرموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ کارندوں کے سردار نے جس نے پہلے کہا تھا کہ جو پیالہ لے آئے اُسے انعام دیا جائے گا اور اس کا میں ضامن ہوں، تلاشی یعنی شروع کر دی اور پیالہ بن یاہین کی بوری سے برآمد ہو گیا۔

﴿۱۲/۴۵﴾ فَبَدَأَ بِأَوْعِيَّتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ أَخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ

وِعَاءِ أَخِيهِ.....

تب شاہی کارندوں نے بوریوں کی تلاشی لینا شروع کی۔ پہلے اور بھائیوں کی بوریاں دیکھیں (تو ان میں کٹورہ نہ ملا)۔ آخر میں یوسف کے بھائی کی بوری دیکھی تو اس میں سے کٹورا نکل آیا۔

یہاں تک دیکھئے کہ ہوا کیا ہے؟ حضرت یوسف چاہتے تھے کہ اپنے بھائی (بن یاہین) کو اپنے پاس رکھ لیں لیکن اُن وجوہات کی بنا پر جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، وہ ایسا کر نہیں سکتے تھے۔ برادران یوسف میں سے ایک نے بنیاہین کی بوری میں کٹورا رکھ دیا۔ کٹورہ حاصل کرنے یا بن یاہین کو بدنام کرنے کی غرض سے۔ جب کٹورہ کی تلاش ہوئی تو برادران یوسف نے خود ہی کہہ دیا کہ جس کے پاس چوری کا کٹورہ نکلے گا وہ ماخوذ ہو جائے گا، اور اپنی سزا بھگتے کے لیے یہاں رہ جائے گا۔ کٹورا بنیاہین کی بوری سے نکلا اور اس طرح اس کے یہاں رکنے کی صورت پیدا ہو گئی۔

قرآن کریم میں اشارۃً یا کنایۃً بھی ایسا نہیں کہا گیا کہ اُس کوٹورے کے چھپانے اور برآمد کرانے میں حضرت یوسف کا ہاتھ تھا یا اُن کی اسکیم تھی۔ لیکن جنہیں حضرات انبیاء کرام کو مطعون کرنا مقصود ہو وہ ایسے افسانے تراش لیتے ہیں۔ تورات، کتاب پیدائش۔ باب ۳۶ میں ہے کہ حضرت یوسف نے وہ پیالہ خود ہی بن یا مین کی بوری میں رکھوا دیا اور جب قافلہ روانہ ہو چکا تو خود ہی اپنے کارندوں کو تعاقب میں بھیج دیا کہ اُن کی تلاشی لیں اور چور کو پکڑ کر لے آئیں۔

لیکن تورات پر کیا افسوس کہ وہ تو ہے ہی محرف، اور یہودیوں کا کیا گلہ کہ وہ تو اپنے انبیاء کی طرف ایسے ایسے افسانے منسوب کر دیتے ہیں جن کے تصور تک سے حیا کی آنکھیں زمین میں گڑ جائیں۔ افسوس تو اپنے ہاں کے مفسرین پر آتا ہے کہ وہ بھی اس باب میں یہودیوں سے کم نہیں ہے

زگل فروش ننا لم کہ از اہل بازار است  
تپاک گرمی رفتار باغبانم سوخت

تفسیر ابن کثیر ہمارے ہاں کی مستند تفسیر ہے۔ اس میں اس واقعہ کے ضمن میں پہلے کہا گیا ہے کہ حضرت یوسف نے بنیا مین سے کہہ دیا تھا کہ:

”میں کوشش میں ہوں کہ کسی نہ کسی طرح تمہیں اپنے پاس روک لوں۔“

اس ”کوشش“ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”جب آپ اپنے بھائیوں کو حسب عادت ایک ایک اونٹ غلے کا دینے لگے اور ان کا سامان لڈنے لگا

تو اپنے چالاک ملازموں سے چپکے سے اشارہ کر دیا کہ چاندی کا شاہی کٹورا بن یا مین کے اسباب میں چپکے سے رکھ دیں

..... پس آپ کے ملازمین نے ہوشیاری سے وہ پیالہ آپ کے بھائی بن یا مین کی خورجی میں رکھ دیا۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ کس طرح کٹورا بن یا مین کی خورجی سے برآمد کرایا گیا اور انہیں روک لیا۔ اور اس پر

تبصرہ یوں کیا ہے کہ:

یہ تھی وہ ترکیب جو جناب باری تعالیٰ نے اپنی حکمت اور حضرت یوسف اور بن یا مین کی مصلحت کے لیے

حضرت یوسف کو سکھائی تھی۔ (تفسیر ابن کثیر اور ترجمہ تیسرا پارہ ص ۵۷)

غور فرمائیے۔ ان حضرات کی تفسیر کی رو سے (معاذ اللہ) خدا ایک فریب کارانہ اسکیم تجویز کر کے اپنے

نبی کو سکھاتا ہے اور نبی اس پر عمل کر کے اپنا مطلب حاصل کر لیتا ہے اور اس کے بعد یہ صاحب ارشاد

فرماتے ہیں:

خدا جس کے درجے بڑھانا چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے۔ (معاذ اللہ۔ استغفر اللہ)

یہ ہے آپ کے جلیل القدر ائمہ مفسرین کے فہم اسلامی کی مثال۔ انہیں نہ خدا کی عظمت کا کوئی احساس ہے، نہ حضرات انبیاء کرام کی عصمت کا کوئی اندازہ۔ نہ انہیں اقدارِ خداوندی کا کوئی علم ہے، نہ عالمگیر ضابطہ اخلاق کا ادراک، بلکہ ان پر نہیں کہ ان کے علم و فہم کی سطح ہی ایسی تھی۔ پوچھئے ان حضرات سے جو ان تفسیروں کو سینے سے لگائے اور سر پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ انہیں پڑھتے بھی ہیں اور پڑھاتے بھی۔ اور اس تعلیم کی رو سے علامہ قرار پاتے ہیں۔ جہاں تک حضرت یوسف کا تعلق ہے قرآن نے چار لفظوں میں ان کے علم و مرتبت کی شہادت دیدی۔ فرمایا:

نَرَفَعُ دَرَجَاتٍ مِّنْ نَّشَأٍ ط (۱۲)

اس سے واضح ہے کہ حضرت یوسف نے جو کچھ کیا تھا اس سے ان کے درجات بلند ہوئے تھے۔ اس بنیادی حقیقت کو سامنے رکھ کر واقعہ کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ حضرت یوسف بنیائین کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ مملکت کا قانون ان کے راستے میں حائل تھا۔ وہ اگر قانون شکنی کرتے (کھلے بندوں یا کسی معنی طریق سے) تو وہ اپنے اس مقام بلند سے نیچے گر جاتے جس پر وہ مملکت میں فائز تھے۔ وہ اگر فریب کارانہ طریق سے اپنی مطلب براری کرتے تو مملکت کے پیمانوں کے علاوہ میزانِ خداوندی میں بھی ان کا وزن کم ہو جاتا۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ انہوں نے ضبط نفس سے کام لیا۔ اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جس سے وہ اپنے مقام بلند سے گر جاتے۔ اس ضبط نفس سے ان کی عظمتِ کردار اور بڑھ گئی۔ خدا کا قانون مشیت ایسا ہی ہے کہ جو خدا کی عاید کردہ پابندی کی پاسداری کرتا ہے اس کا مقام بلند ہو جاتا ہے۔

نَرَفَعُ دَرَجَاتٍ مِّنْ نَّشَأٍ ط (۱۲)

حضرت یوسف کے ارادے یا عملِ دخل کے بغیر جو کچھ ہو گیا اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔ كَذٰلِكَ كُنَّا لِيُوسُفَ . . . . . (۱۲) اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح ہم نے (یعنی خدا نے) یوسف کے لیے ایک تدبیر کر دی۔ اور اس سے کہا یہ جاتا ہے کہ یہ سب کچھ (معاذ اللہ) خدا نے کیا تھا۔ ایسا کہنا قرآن کریم کے اسلوب بیان سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات ایسے ہیں جن میں خدا نے کسی عمل (دایات، کو اپنی نظر منسوب کیلئے لیکن اس سے مراد یہ نہیں کہ خدا نے خود ایسا کیا تھا۔ وہ ایک مثالیں دیکھئے،

۱۔ ہم بچوں کو بولنا سکھاتے ہیں۔ لیکن قرآن میں ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ ؕ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ط (۹۵) خدا

نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔ اسی طرح ہم بچوں (بلکہ ناخواندہ بڑوں) کو لکھنا سکھاتے ہیں لیکن ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ **الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ** (۹۶)۔ خدا وہ ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعے (لکھنا) سکھایا۔ ظاہر ہے کہ ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان میں گویائی (نطق)..... تحریر کی صلاحیت ودیعت کر دی ہے۔ ان صلاحیتوں سے کام لینا (دہ لینا) انسان کا اپنا کام ہے۔ خدا نے کسی کو خود بولنا سکھایا ہے نہ لکھنا۔

۲۔ سورۃ البقرہ میں ہے کہ جب کاتب کو دستاویز لکھنے کے لیے کہا جائے تو **وَلَا يَأْب كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ** (۲۸۲) کاتب کو اس سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ جس طرح اللہ نے اُسے سکھایا ہے اُسے چاہیے کہ اس طرح اس دستاویز کو لکھ دے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بھی مراد تحریر کی وہ صلاحیت ہے جسے خدا نے انسان میں ودیعت کر رکھا ہے۔ وہ خود کاتب کو لکھنا نہیں سکھاتا۔

۳۔ سورۃ مائدہ میں شکاری جانوروں کے متعلق ہے۔ **وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ يَعْلَمُونَهَا** (۵) **مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللَّهُ**..... (۵) جو کچھ تمہیں اللہ نے سکھایا ہے اُس کے مطابق تم شکار کر نیوالے جانوروں کو سدھاتے ہو۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ شکاریوں کو یہ نہیں سکھاتا کہ وہ شکار کرنے والے جانوروں کو کس طرح سدھائیں۔

۴۔ سورۃ یسین میں ہے۔ **وَآيَةٌ لَهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلِكِ الْمَشْحُونِ** (۳۶) اور یہ بات بھی ان کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی نشانی ہے کہ ہم ان کے بال بچوں کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کر دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ خود سوار ہوتے ہیں یا ان کے بڑے انہیں سوار کراتے ہیں۔ کیا قانونِ فطرت کے مطابق عمل کرنے کو خدا نے اپنی طرف منسوب نہیں کیا؟

۵۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی ضروریات کے لیے مختلف قسم کے اسباب اور سامان پیدا کیے ہیں جنہیں انسان اپنی منشاء کے مطابق استعمال میں لاتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اُسے بھی اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ مثلاً سورۃ نحل میں ہے۔ **وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا** (۱۶) اللہ تعالیٰ نے تمہارے گھروں کو تمہارے لیے جائے سکونت بنایا ہے۔ اس کے بعد ہے۔ **وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ جُلُودِ الْأَنْعَامِ بُيُوتًا**..... (۱۷) خدا نے مویشیوں کی کھالوں سے تمہارے لیے گھر بنائے۔

۶۔ ایک بات اصولاً سمجھ لینی چاہیے۔ خدا کا اٹل قانون یہ ہے کہ جو شخص (خاص مقدار سے زیادہ) سنکھیا کھائیگا وہ

ہلاک ہو جائے گا۔ وہ بھی کہتا ہے کہ جو شخص سناٹا کھائے گا وہ ہلاک ہو جائے گا اور کہا یہ کہ سناٹا کھانے والے کو ہم ہلاک کر دیتے ہیں۔ معروف آیت ہے خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ..... (۲۶) ”اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی“ اور اسی حقیقت کو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ (۲۳) جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ زنگ بن کر ان کے دلوں پر چپٹھ جاتا ہے (اور یوں ان پر مہر لگ جاتی ہے۔)

ان مقامات کی مزید تشریح کے لیے سابقہ جلدوں میں عنوان ”تقدیر“ دیکھیے۔ نیز لغات القرآن اور کتاب التقدير میں مَا يَشَاءُ اور مَنْ يَشَاءُ (قانون مشیت) کے موضوع۔

مندرجہ بالا مثالوں سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کام کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے تو اس کا بالضرور مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اُس کام کو اس نے خود کیا ہے۔ وہ کچھ کرتا انسان ہی ہے۔ کبھی قانونِ قدرت کی مطابقت، کبھی ان صلاحیتوں کے مطابق جو انسان میں ودیعت کی گئی ہیں اور کبھی ان اسباب و ذرائع کو استعمال میں لا کر جو اس کام کے لیے ضروری ہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ جب اللہ تعالیٰ نے کہا کہ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ (۲۶) تو اس سے یہ مراد نہیں کہ اللہ نے (کٹورا کی اسکیم) خود وضع کی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے اسباب و ذرائع پیدا ہو گئے جن کی رُو سے (حضرت) یوسف کی خواہش بھی پوری ہو گئی اور ان پر حرف بھی نہ آیا۔ آیت ۲۶ اور اس کا مفہوم یوں ہو گا:

﴿۲۶﴾ فَبَدَأَ بِأَوْعِيَّتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ أَخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِعَاءِ

أَخِيهِ ۖ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ ۖ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۖ تَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مِّنْ نَّشَأٍ ۖ وَفَوْقَ كُلِّ

ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ﴿۲۶﴾

تب شاہی کارندوں نے بوریوں کی تلاشی یعنی شرع کی۔ پہلے اور بھائیوں کی بوریاں دیکھیں (تو ان میں کٹورا نہ ملا) آخر میں یوسف کے بھائی کی بوری دیکھی تو اس میں سے کٹورا نکل آیا۔

(دیکھو! بات چلی کیسی تھی اور رُو کی کہاں جا کر! اس سوتیلے بھائی نے بنیائیں کی بوری میں کٹورا کس نیت

سے رکھا تھا، لیکن اس کا یہ فعل یوسفؑ کے لیے بنیامین کو اپنے پاس روک لینے کا موجب بن گیا، اس طرح ہم نے یوسفؑ کے لیے بنیامین کو روک لینے کی تدبیر پیدا کر دی، ورنہ شاہ مصر کے قانون کے مطابق وہ اپنے بھائی کو اپنے پاس نہیں روک سکتا تھا۔ اس کے لیے مشیت ہی کوئی تدبیر کر سکتی تھی (جس سے یوسفؑ کی دلی آرزو بھی پوری ہو جائے اور اسے کوئی ایسی بات بھی نہ کرنی پڑے جس سے وہ اپنے مقام بلند سے گر جائے، یوں ہم اپنے قانون مشیت کے مطابق بلندٹی مدارج عطا کر دیتے ہیں۔ یاد رکھو! خدا کا علم ہر صاحب علم کی علمی سطح سے بلند ہوتا ہے۔

(ضمناً) لغات القرآن میں دیکھئے۔ دین کے معنی قانون بھی ہیں۔ اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مَا كَانَ لِيَلْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ - بادشاہ کے قانون کے مطابق یوسفؑ اپنے بھائی کو روک نہیں سکتا تھا۔

اب معاملہ حضرت یوسفؑ کے سامنے آچکا تھا۔ وہ اس سے پہلے بنیامین کو اپنے متعلق بتا چکے تھے۔ اس لئے بنیامین کے لیے نہ تو اس الزام سے گھبرانے کی کوئی وجہ تھی اور نہ معاملے کے حضرت یوسفؑ کے سامنے پیش ہونے سے کوئی تشویش۔ حضرت یوسفؑ نے تو اس پر کوئی تبصرہ نہ کیا، لیکن برادران یوسفؑ کو بنیامین سے پہلے ہی دشمنی تھی (اس لیے کہ وہ یوسفؑ کے باپ کا چہیتا تھا)۔ اس لیے جوشِ حسد و عداوت میں بے اختیار پکار اُٹھے کہ اگر اس نے چوری کی ہے تو کچھ عجب نہیں، یہ ان کے ہاں کا معمول ہے۔ اس کا ایک بھائی تھا وہ بھی ایسا ہی تھا۔ اندازہ فرمائیے کہ حضرت یوسفؑ نے کس دل سے اس الزام کو سنا ہوگا، لیکن ابھی مصلحت کا تقاضا تھا کہ اپنے آپ کو ان پر ظاہر نہ کیا جائے۔ اس لیے سن کر پی گئے۔ اور کہا تو صرف اتنا کہ اپنے بھائی کو چور بنا کر تم اپنے متعلق بھی کچھ اچھا ظن پیدا نہیں کر رہے۔ تم بھی تو اسی خانوادہ کے نونہال ہو۔

﴿۱۲﴾ قَالُوا اِنْ يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهِ مِنْ قَبْلُ ۗ فَاَسْرَهَا  
يُوسُفَ فِي نَفْسِهِ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۗ قَالَ اَنْتُمْ شَرُّ مَكَانًا  
وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ ﴿۷۷﴾

اس پر یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا کہ اگر اس نے چوری کی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس کا ایک اور بھائی تھا۔ اس نے بھی اسی طرح پہلے چوری کی تھی۔ (لہذا، یہ بات ان کے ہاں عادتہٴ علیٰ آرہی ہے)۔



دائے بائیں قدر زبردست تھا یہ نشتر جو یوسفؑ کے دل کی گہرائیوں میں اُتار گیا؟ جی میں تو آیا ہو گا کہ ان کا سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دے لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔ اس لیے یوسفؑ نے اس بات کو دل میں رکھا۔ اور صرف اتنا کہا کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس کا یقینی علم تو خدا کو ہے، لیکن اگر واقعہ یہی ہے جو تم بیان کر رہے ہو، تو تم شریف لوگ نظر نہیں آتے۔ اس لیے کہ تم سوتیلے ہی سہی، ہو تو انہی چوروں کے بھائی! خاندان تو تمہارا بھی وہی ہے۔

قرآن کریم نے ان کے الزام کی تردید ایک لفظ میں کر دی جب کہا **فَأَسْرَهَا يَوْسُفُ فِي نَفْسِهِ**۔ یوں سمجھیے جیسے ہم کہیں کہ ”یوسفؑ اُسے پی گیا“ ادب لطیف و عمیق کی ایک خصوصیت ایمائیت (SUGGESTIVENESS) ہوتی ہے۔ یعنی بات کھلے کھلے الفاظ میں کہنے کی بجائے بلیغ اشارے میں کی جائے اور اسے قاری کے حُسنِ فہم پر چھوڑ دیا جائے کہ ”خائے دید و احوال حین گفت“۔ قرآن مجید میں یہ انداز بیان بھی پایا جاتا ہے اور اس کی ایک مثال **فَأَسْرَهَا يَوْسُفُ فِي نَفْسِهِ** ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود تھا کہ جو الزام برادرانِ یوسفؑ نے عاید کیا تھا وہ جھوٹا تھا لیکن یوسفؑ اسے (سہر دست) زبان پر نہیں لانا چاہتا تھا۔

قرآن نے تو قرینہ سے بتا دیا کہ الزام جھوٹا تھا۔ لیکن ہمارے مفسرین حضرات بھلا اسے کب مان سکتے ہیں۔ انہوں نے دھڑتے سے کہا کہ جو کچھ انہوں نے کہا تھا وہ سچ تھا۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے۔

وہ واقعہ یہ تھا کہ (یوسفؑ بچپن میں) اپنے نانا کا بت چُپکے سے اُٹھالائے تھے اور اُسے توڑ دیا تھا۔

اس کے بعد ہے کہ :

یہ بھی مروی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی ایک بڑی بہن تھی جن کے پاس اپنے والد حضرت اسحاق علیہ السلام کا ایک کمرپٹہ تھا جو خاندان کے بڑے آدمی کے پاس رہا کرتا تھا۔ حضرت یوسفؑ پیدا ہوتے ہی اپنی ان پھوپھی صاحبہ کی پرورش میں تھے۔ انہیں حضرت یوسفؑ سے کمال درجے کی محبت تھی۔ جب آپ کچھ بڑے ہوئے تو حضرت یعقوبؑ نے آپ کو لے جانا چاہا۔ بہن صاحبہ سے درخواست کی، لیکن بہن نے جدائی کو نا قابل برداشت بیان کر کے انکار کر دیا۔ اُدھر آپ کے والد صاحب حضرت یعقوبؑ کے شوق کی بھی انتہا نہ تھی۔ سر ہو گئے۔ آخر بہن صاحبہ نے فرمایا۔ اچھا کچھ دنوں رہنے دو، پھر لے جانا۔ اسی اثناء میں انہوں نے ایک دن وہی کمرپٹہ حضرت یوسفؑ کے کپڑوں کے نیچے چُپا دیا۔ پھر تلاش شروع کی۔ گھر بار چھان مارا۔ نہ ملا۔ شور مچا۔ آخر یہ پھٹری کہ گھر میں جو ہیں اُن کی تلاشیاں لی جائیں۔ لی گئیں۔ کسی کے پاس کچھ ہو تو

نکلے۔ آخر حضرت یوسفؑ کی تلاشی لی گئی۔ ان کے پاس سے برآمد ہوا۔ حضرت یعقوبؑ کو خبر دی گئی اور تکتا ہوا بیہیمہ کے قانون کے مطابق آپ اپنی بھوپھی کی تحویل میں کر دیئے گئے اور بھوپھی نے اس طرح اپنے شوق کو پورا کیا۔

اس بات کا طعنہ آج بجائی دے رہے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر۔ اردو ترجمہ، پارہ تیرہواں ص ۷۶)

یہ نقشہ کھینچنا جا رہا ہے خانوادہ نبوت کا۔! (استغفر اللہ)

سوال یہ ہے کہ جو کچھ یہ حضرات کہتے ہیں اس کی ان کے پاس دلیل یا اتھارٹی کیا ہوتی ہے؟ اس کی اتھارٹی ہوتی ہے۔ یہ بھی مروی ہے۔ یعنی روایات میں یوں آیا ہے۔ دین میں تحریف کی یہ سازش بڑی منظم ہے۔ منافقین نے جھوٹی روایات وضع کیں اور ان کا نام رکھا: رسول اللہ کی احادیث، جامعین احادیث (امام بخاری و غیرہ) نے انہیں اپنے مجموعوں میں داخل کر لیا اور اس لیے انہیں صحیح احادیث ہونے کا سند مل گئی۔ طبری نے انہی کی بنا پر تاریخ مرتب کی اور اس طرح انہیں دوہری سند حاصل ہو گئی۔ یعنی روایات میں یوں آیا ہے اور تاریخ نے یہ کہا ہے۔ اس کے بعد مفسرین نے اپنی تفسیروں میں اور مؤرخین نے اپنی تاریخ میں ”مروی ہے“ کہا کہ انہیں بلا غل و غش درج کر لیا۔ انہی کے مجموعہ کا نام ”اسلام“ ہے جو ہزار بارہ سو سال سے رائج چلا آ رہا ہے۔ اب ان روایات پر کسی قسم کی تنقید ہو سکتی ہے، کیونکہ انہیں احادیث رسول اللہؐ کہا جاتا ہے، نہ ان تفسیروں کو الگ کر کے قرآن مجید کو سمجھایا جا سکتا ہے، ایسا کرنا سلف صالحین کے مسلک کے خلاف ہو گا۔

اس اسلام کی وجہ سے ہم تو ڈوبے ہی تھے، حقیقی اسلام کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے۔

جب جذبات بغض و عناد ٹھنڈے ہوئے تو برادران یوسفؑ منت سماجت پر اتر آئے۔ پست کردار میں یہی

کیفیت ہوتی ہے۔ کذب تراشی اور نملق پیشگی۔ کہنے لگے۔

﴿۱۲﴾ قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ إِنَّ لَهُ أَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ أَحَدَنَا

مَكَانَهُ إِنَّ نَرِيكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۷۸﴾

انہوں نے کہا کہ اے عزیز مصر! اس (بن یامین) کا باپ بہت بوڑھا ہے (اور وہ اس سے بہت محبت کرتا

ہے)، آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجئے اور اسے چھوڑ دیجئے۔ ہم نے آپ کو بڑا ہی نیک انسان پایا

ہے۔ آپ بڑے ہمدرد ہیں (اس لیے ہمیں امید ہے کہ آپ ہماری اس درخواست کو ضرور قبول کر لیں گے)

حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ چور اپنی سزا آپ جھگٹے۔ اب ہم

اس کی جگہ کسی دوسرے کو کیسے روک لیں۔

﴿۱۲﴾ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ أَنْ نَأْخُذَ إِلَّا مَنْ وَجَدْنَا مَتَاعِنَا عِنْدَكَ ۗ

إِنَّا إِذَا لَظَلِمُونَ ﴿۷۹﴾

یوسف نے کہا۔ معاذ اللہ! بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اس شخص کو چھوڑ دیں جس سے چوری کا مال برآمد ہوا ہے اور اس کی جگہ ایک بے گناہ کو پکڑ لیں۔ اگر ہم ایسا کریں تو یہ صریح ظلم ہوگا۔

اسے نہ بھولینے کہ بن یامین کو علم تھا کہ روکنے والا یوسف ہے۔ اس لیے اس پر کوئی ظلم اور زیادتی نہیں ہو رہی تھی۔ جب وہ اپنی کوششوں میں مایوس ہو گئے تو الگ ہو کر مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

﴿۱۳﴾ فَلَمَّا اسْتَيْسَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا ۗ قَالَ كَبِيرُهُمْ أَلَمْ تَعْلَمُوا

أَنَّ أَبَاكُمْ قَدْ أَخَذَ عَلَيْكُمْ مَوْثِقًا مِنَ اللَّهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا

فَرَطْتُمْ فِي يُوسُفَ ۗ فَلَنْ أْبْرَحَ الْأَرْضَ حَتَّى يَأْذَنَ لِي الْبُ أَوْ

يُحْكَمَ اللَّهُ لِي ۗ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿۸۰﴾ اِرْجِعُوا إِلَىٰ آبَائِكُمْ فَقُولُوا

يَا أَبَانَا إِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۗ وَمَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلَّمْنَا وَمَا كُنَّا

لِلْغَيْبِ حَافِظِينَ ﴿۸۱﴾ وَسَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا وَالْعَيْرَ

الَّتِي أَقْبَلْنَا فِيهَا ۗ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿۸۲﴾

جب وہ یوسف کی طرف سے مایوس ہو گئے کہ وہ ان کی بات نہیں مانے گا، تو الگ بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے۔ ان میں سب سے بڑے بھائی نے کہا کہ تم جانتے ہو کہ تمہارے باپ نے تم سے (بن یامین کے بارے میں) اللہ کو درمیان رکھ کر حکم عہد لیا تھا۔ اور اس سے پہلے تم یوسف کے معاملہ میں بڑی زیادتی کر چکے ہو۔ اس لیے (کم از کم) میں تو یہیں رہوں گا (باپ کے سامنے ہرگز نہیں جاؤں گا) تا آنکہ خود باپ مجھے (وہاں آنے کی) اجازت دے۔ یا اللہ میرے لیے کوئی اور فیصلہ کر دے۔ وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

تم باپ کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ تمہارے (لاڈلے) بیٹے نے (پراسے ملک) میں جا کر چوری کی ہے! ہم نے بے شک تم سے اس کی نگرانی اور حفاظت کا عہد کیا تھا لیکن ہم انہی امور میں اس کی نگرانی کر سکتے تھے جو ہمارے علم میں واقع ہوتے۔ اس قسم کی باتوں میں جو اس نے ہم سے چھپا کر کرنی شروع کر دیں ہم اس کی کیا نگرانی کر سکتے تھے!

آپ اُن بسنی والوں سے پوچھ لیجئے جہاں یہ واقعہ ہوا ہے۔ یا اُن قافلہ والوں سے دریافت کر لیجئے جن کے ساتھ ہم آئے ہیں کہ ہم سچ کہتے ہیں یا جھوٹ بولتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پیشتر ذرا اس نشتر کو دیکھتے جائیے جو اس طعن آمیز فقرہ میں چھپا ہوا ہے کہ يَا بَنِي اِسْرٰٓءَ لَا يَأْتِيَنَّكَ سَرَقٌ ۗ اے باپ! تیرے بیٹے نے چوری کی ہے؛ دل میں بغض و عناد کے جذبات نہ ہوتے تو سیدھی طرح کہتے کہ ہمارے بھائی نے چوری کی ہے۔ یا بن یاسین نے چوری کی ہے۔ لیکن باپ کو جتا کر کہنا کہ یہ ہے آپ کے اس

بیٹے کی کرتوت جسے آپ یوں سینے سے لگائے رکھتے تھے۔ کس قدر کلیجے کو چھلنی کر دینے والا گھاؤ ہے! اور پھر شقاوتِ قلب دیکھئے۔ یہ

## قساوتِ قلبی کی ایک جھلک

نشتر کس وقت رگ جاں میں پیوست کیے جانے کی تجویز ہو رہی ہے؟ اس وقت جب ضعیف باپ پہلے ہی ایک بیٹے کے غم میں نیم سوختہ ہو رہا تھا اور اس کے بعد اب دوسرے بیٹے کے متعلق یہ خبر سنائی جانے والی تھی کہ وہ بھی تم سے جدا ہو گیا۔ یہ وقت تھا کہ اس خبر کو انتہائی ہمدردی کے پیرایہ میں بیان کیا جاتا۔ لیکن قرآن کریم نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ذنی الطبع لوگوں کی قساوتِ قلبی ایسے مواقع پر اور بھی زیادہ شدید ہو جاتی ہے۔

چنانچہ بھائیوں نے ایسا ہی کیا اور کنعان میں آکر یہ قیامت خیز خبر ان جگر شکاف الفاظ میں باپ کے گوش گزار کر دی حضرت یعقوب نے اس پر پھر وہی فقرہ دہرایا جو بھیرٹینے والا افسانہ سن کر بیٹوں سے کہا تھا۔

﴿۱۲﴾ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۗ عَسٰٓءَ

اللّٰهُ اَنْ يَّاتِيَنِي بِهِمْ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۴﴾

دچنانچہ اس مشورہ کے بعد وہ باپ کے پاس پہنچے۔ باپ نے جب یہ کچھ سنا تو کہا کہ (بہنیں، بن یاسین کبھی چوری نہیں کر سکتا) یہ سارا قصہ تمہارا خود وضع کردہ ہے جسے تمہارے دل نے تمہیں سبھا دیا ہے۔ (وٹر حقیقت کچھ اور ہے) میں اس پر بھی وہی کہوں گا جو اس سے پہلے یوسف کے معاملہ پر کہا تھا۔ (۱۲/۸۳) کہ میرے

لیے یہی بہتر ہے کہ میں صبر سے ہمت سے کام لوں (اور گھر کا شیرازہ بکھرنے نہ دوں) مجھے امید ہے کہ ایک دن اللہ ان سب کو مجھ سے ملا دے گا۔ یعنی یوسفؑ، بن یامین اور وہ بڑا لڑکا جو وہاں رہ پڑا تھا۔ اس لیے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے اور تمام معاملات کو حکمت اور تدبیر سے آخر تک پہنچانے والا ہے۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاتِيَنِيْ بِهَمٍّ جَمِيْعًاۙ پُر غُور كَيْفِيَّةٖ حضرت يعقوبؑ نے اس بات کو کبھی دل سے نہیں مانا تھا کہ حضرت یوسفؑ واقعی ہلاک ہو چکے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ وہ زندہ ہیں۔ اب جو بن یامین کے متعلق یہ سب کچھ سنا تو ان تمام واقعات پر غائر نگاہ ڈالنے سے آپ کی فراست نے بھانپ لیا کہ یہ کڑیاں کچھ غیر معمولی سی ہیں۔ اس سے آپ کی نگاہ دُور رس نے بن یامین کی گم گشتگی میں سب کے دوبارہ اکٹھے ہو جانے کی جھلک دیکھ لی (یعنی یوسفؑ، بن یامین اور وہ بڑا بیٹا جو باقیوں کے ساتھ نہیں آیا تھا) بن یامین کی جدائی نے پھیلے زخموں کو پھر سے تازہ کر دیا اور یوسفؑ کی یاد اور بھی شدت سے ستانے لگی۔ ہر چند انہیں امید کی جھلک نظر آچکی تھی لیکن فراق آخر فراق ہے۔ جب حتماً یوسی نہ ہو بلکہ یم درجا کا عالم ہو تو دردِ فراق کی شدت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ قرآن کریم نے اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

﴿۱۲/۸۴﴾ وَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَا سَفَىٰ عَلَىٰ يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنُهُ

مِنَ الْحَزَنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾

اُس نے بیٹوں کی طرف سے رخ پھیر لیا اور اس نے زخم نے اس کے دل میں یوسفؑ کی یاد تازہ کر دی تو اُس نے آہ بھر کر کہا، ”ہائے یوسفؑ کا دردِ فراق“ وہ اس صدمہ سے بیقرار رہتا تھا اور شدتِ غم کی وجہ سے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی رہتی تھیں۔

پھر اس آتشِ غم کی جگر سوزی کا اس سے اندازہ لگانے کے چارہ ساز تو ایک طرف، کوئی غمخوار بھی پاس نہ تھا بیٹے تھے تو ایسے کہ انہیں یوسفؑ اور بن یامین کے نام سے چڑھتی، خود بوڑھے ہو چکے تھے۔ ایسے میں بیٹوں کی ہر بات سُننی پڑتی ہوگی اور ان باتوں کا زخم، داغِ جدائی سے بھی زیادہ کرب انگیز ہوتا ہوگا۔

﴿۱۲/۸۵﴾ قَالُوْۤا تَاللّٰهِ تَفْتُوۡۤا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَصًاۙ

اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾

(باپ کا یہ حال دیکھ کر بیٹے)۔ بجائے اس کے کہ اس سے غمخواری اور غمگساری کریں، اکثر کہتے کہ، آپ اس قصے کو چھوڑیں گے بھی، یا ہر وقت ”یوسف یوسف“ پکارتے رہیں گے؟ اگر آپ یہی کچھ کرتے رہے تو خدا شاہد ہے، آپ اس غم میں گھل گھل کر مر جائیں گے۔ اور اگر مریں گے نہیں تو ازکارِ رفتہ ضرور ہو جائیں گے۔ حضرت یعقوبؑ یہ سب کچھ سُننے اور جواب میں کہتے تو فقط اتنا کہ میں تم سے تو کچھ نہیں کہتا۔ میں تو اپنا درد و غم چارہ سازِ حقیقی کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ کیا تمہیں اتنا بھی گوارا نہیں!

﴿۱۲﴾ قَالَ إِنَّمَا أَشْكُوا بَنِيَّ وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ وَاعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۸۸﴾ يَبْنِيَّ أَذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا مِنْ يُوسُفَ وَأَخِيهِ وَلَا تَأْيِسُوا مِنْ رَوْحِ اللَّهِ إِنَّهُ لَا يَأْتِيَنَّ مِنْ رَوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمَ الْكَافِرُونَ ﴿۸۹﴾

باپ اس کے جواب میں کہتا کہ (دیں تم لوگوں سے تو کچھ نہیں کہتا) میں تو اپنے غم و الم کا اظہار اپنے خدا کے سامنے کرتا ہوں۔ اس لیے کہ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے (اس لیے میری امیدوں کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے بیٹے مجھ سے ایک دن ضرور ملیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس انتظار کی مدت زیادہ طویل نہ ہو۔ لہذا) اسے میرے بچو! تم ایک بار پھر جاؤ، یوسفؑ کا کچھ سراغ لگاؤ اور بن یامین کا حال احوال دریافت کرو۔ رحمتِ خداوندی کی نسیب جہاں فرما سے کبھی مایوس نہ ہو۔ اس سے صرف وہ لوگ مایوس ہوتے ہیں جو اس کے اس قانون پر یقین نہیں رکھتے (کہ سعی و عمل اگر صحیح خطوط پر ہوں تو وہ کبھی بلا نتیجہ نہیں رہتے)۔

دیکھئے یہاں امیدوں کی دنیا کس طرح بیدار ہوتی نظر آ رہی ہے۔ بیٹے غلہ لینے کے لیے پھر مصر پہنچے۔ قحط زدگی سے ان کی حالت بڑی سقیم ہو چکی تھی۔ اس لیے بیع و شری کے معاملہ کی بجائے حضرت یوسفؑ سے بھیک کے طلبکار ہوئے۔

﴿۱۲﴾ فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجَبَةٍ فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا

## إِنَّ اللَّهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ ﴿۸۸﴾

دچنانچہ وہ پھر مصر گئے اور یوسفؑ سے کہا کہ اے عزیز! ہم پر اور ہمارے گھرانے پر بڑی سختی کے دن آ گئے ہیں، ہمارا منہ تو نہیں تھا کہ پھر آپ کے پاس آتے لیکن کیا کریں ہم سخت مجبور و لاچار ہو گئے ہیں۔ ہمارے پاس نہ غلہ رہا ہے اور نہ ہی غلہ خریدنے کے لیے پوری رقم ہے۔ بس، یہ حقیر سی پونجی ہے جسے لے کر ہم آگئے ہیں (اسے قبول کر لیجئے اور معاملہ خرید و فروخت کا نہ سمجھئے بلکہ) ہمیں بطور خیرات پورا غلہ دیجئے۔ اللہ خیرات کر نیکوں کو نیک بدلہ دیتا ہے۔

ذرا غور کیجئے۔ عزیز مصر (حضرت یوسفؑ) کی عاجز نوازیوں کی شہرت کتنی عام تھی کہ ان (اجنبیوں) نے اتنے وثوق سے کہہ دیا کہ ہماری بضاعت کی طرف نہ دیکھئے اپنے رحم و کرم کی طرف دیکھئے اور معاملہ خرید و فروخت کا نہ سمجھئے بلکہ صدقہ و خیرات کا خیال کیجئے۔ کیسا درد انگیز اور عبرت آموز تھا یہ منظر! یہ سنگ دل اور جفاکیش اس یوسفؑ سے بھیک کے سوالی ہیں جسے انہوں نے اس بے دردی سے کنوٹیشن میں ڈال دیا تھا۔ یہ سن کر حضرت یوسفؑ کا بھی جی بھرا آیا اور انہوں نے کہا:

﴿۱۲﴾ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ

## جَاهِلُونَ ﴿۸۹﴾

دیہ سن کر یوسفؑ کا جی بھرا آیا اور اب مزید توقف کی ضرورت نہ سمجھی۔ ان سے کہا، کیا تمہیں یاد ہے کہ تم نے اپنی جہالت اور حماقت سے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ (۱۲) کیا کیا تھا؟

إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ — پر نگاہ ڈالیے۔ سیرت یوسفی کی زیبائیاں چھلک کر باہر آرہی ہیں۔ ایک یہ بھائی تھے کہ بن یامین تو ایک طرف، اس کے بھائی کے متعلق بھی چوری کا الزام لگانے سے نہ جھجکے۔ حتیٰ کہ بوڑھے باپ سے بھی طعن آمیز نشتر کے بغیر بات نہ کی۔ اور انہی کے بھائی حضرت یوسفؑ ہیں کہ ایسے شقی القلب بھائیوں کو ان کی شقاوت قلبی کی یاد دلائی تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ تم سے یہ کچھ نادانی اور جہالت سے ہو گیا تھا۔

حضرت یوسفؑ نے اپنی کشادہ نگہی سے الزام کی سختی کو اس قدر نرم کر دیا لیکن اس کے باوجود ذرا تصور میں لائیے کہ یہ معلوم کر کے کہ سامنے یوسفؑ

سامنے حضرت یوسفؑ ہیں

کھڑا ہے، بھائیوں کے قلب و دماغ کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی؟ قرآن کریم نے اس اضطراری کیفیت کو ایک عجیب انداز سے بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے کہ جب بھائیوں نے یوسفؑ کے مُنہ سے یہ الفاظ سُنے تو بوکھلا ہٹ میں بول اُٹھے:

﴿۱۲﴾ قَالُوا ءَاِنَّكَ لَيُوسُفُ ط

ہیں! کیا تم یوسفؑ ہو؟ واقعی یوسف!

حضرت یوسفؑ نے فرمایا:

قَالَ اَنَا يُّوسُفُ وَهَذَا اَخِي قَدْ مَنَّ اللهُ عَلَيْنَا ط اِنَّهُ مَن

يَتَّقِي وَيَصْبِرُ فَاِنَّ اللهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۰﴾

اس نے کہا۔ ہاں! میں یوسفؑ ہوں اور یہ میرا بھائی (بن یا مین) ہے۔ تمہنے تو ہماری ہلاکت کے لیے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، لیکن ہمارے خدا نے ہم پر بڑا کرم کیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بھی غلط راہوں سے بچتا ہوا، صحیح روش پر گامزن رہتا ہے اور اس راستے پر جس قدر مشکلات آئیں، پامردی سے ان کا مقابلہ کرتا ہے، تو وہ اس قسم کی حسن کاراۓ زندگی بسر کرنے والوں کی محنت کبھی رائیگاں نہیں جانے دیتا۔

غور کیجئے، لسان یوسفی نے دو لفظوں میں کتنی بڑی حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ مَن يَتَّقِي وَيَصْبِرُ۔ جو کوئی زندگی کی تباہ کن روش سے بچتا اور قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتا ہے اور پھر ہجومِ مشکلات میں ثابت قدم رہتا ہے، اس پر اللہ کی نوازشات کی گہر باری ہوتی ہے۔ اُس اللہ کی جو مخلص انسانوں کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دیتا۔ اس کے بعد برادرانِ یوسفؑ پر جو کچھ گزری ہوگی اس کا اندازہ بیان میں نہیں، تصور ہی میں آسکتا ہے انہوں نے شرم و ندامت سے گر دن جھکالی اور کہا:

﴿۱۳﴾ قَالُوا تَاللهِ لَقَدْ اٰثَرْنَا وَ اِنَّ كُنَّا لَخٰطِيْبِيْنَ ﴿۹۱﴾

اے سُن کر ان کے سر شرم اور ندامت سے جھک گئے اور انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم فی الواقعہ اللہ نے

تمہیں ہم پر فضیلت دی ہے۔ اور ہم بڑے ہی خطا کار ہیں۔

غور فرمائیے۔ وہ بھائی جنہوں نے حضرت یوسفؑ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا تھا جو آج تک دُنیا میں بطور ضربِ المثل مشہور

لہ "برادرانِ یوسفؑ" ظلم و تعدی، فریب کاری اور کذب تراشی کے لیے ضربِ المثل بن چکے ہیں۔



ہے۔ آج اسی بھائی کے سامنے مجرموں کی حیثیت سے سر جھکاٹے کھڑے ہیں۔ یہ وقت تھا کہ ان سے پورا پورا انتقام لیا جاتا۔ لیکن جنہیں اللہ نے وسعتِ ظرف عطا فرمائی ہو، وہ ذاتی انتقام نہیں لیا کرتے۔ ان کی دوستی اور دشمنی عضو اور انتقام، اقدارِ خداوندی کے تابع ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ نے فرمایا:

﴿۱۲﴾ قَالَ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ

أَرْحَمُ الرَّحِيمِينَ ﴿۹۶﴾

یوسفؑ نے کہا۔ جاؤ! اب میں تم پر کوئی سزائش نہیں کرتا۔ تم نے جو کچھ میرے خلاف کیا، میں اُسے معاف کرتا ہوں۔ لیکن اس سے جو کچھ تم نے اپنی ذات کے خلاف کیا ہے اُس کو کون معاف کر سکتا ہے؟ اس کی معافی کی تو ایک ہی شکل ہے کہ تم پھر سے قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر کے خدا کی حفاظت میں آ جاؤ۔ جرائم سے تمہاری ذات میں جو کمی واقع ہو گئی ہے وہ اسے پورا کر کے اس کی نشوونما کر دے گا۔ وہ سب سے بہتر نشوونما کرنے والا ہے۔

اللہ اکبر! جہاں یوسفؑ کا مہرِ عالم تاب نصف النہار پر نظر آ رہا ہے۔ اس کے بعد آپ نے بھائیوں سے کہا کہ اب تم یوں کرو کہ:

﴿۱۳﴾ اذْهَبُوا بِقَمِيصِي هَذَا فَاَلْقُوهُ عَلَىٰ وَجْهِ اَبِي يَأْتِ بِصِرَاطٍ

وَآتُونِي بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِينَ ﴿۹۷﴾

(واپس گھر جاؤ اور) یہ میری قمیص اپنے ساتھ لے جاؤ (جو میری وجاہت اور منصب کی محسوس نشانی ہے) جب تم اسے ابا جان کے سامنے پیش کر دے تو وہ ساری بات سمجھ جائیں گے اور جو کچھ تم کہو گے اس کا یقین کر لیں گے۔ پھر تم اپنے تمام اہل خاندان کو لے کر یہاں آ جانا۔

یہی بھائی اس سے پیشتر باپ کے پاس ایک کڑتے لائے تھے جسے دیکھ کر روتے روتے باپ کی آنکھیں سفید پیر ہن یوسفؑ | ہو گئی تھیں۔ آج وہی بھائی اسی یوسفؑ کا ایک اور کڑتے لے کر اسی باپ کے پاس جاتے ہیں جس کڑتے سے بوڑھے باپ کی متاعِ گم گشتہ واپس مل رہی ہے۔ قافلہ مبصر سے روانہ ہوا اور مختلف منازل طے کرتا اس بستی کے قریب آپہنچا جہاں حضرت یعقوبؑ اور ان کا گھرانہ آباد تھا۔ یہاں سے باقی قافلہ آگے چلا گیا اور بردران یوسفؑ کے اونٹ الگ ہو گئے (وَأَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ)

قافلہ کی آمد کا چرچا عام ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت یعقوبؑ قافلہ کا انتظار کس شدت سے کر رہے ہوں گے۔ ایسا انتظار کہ دل کی ساری حسرتیں سمٹ کر آنکھ کے تِل میں آگئی ہوں گی۔ ان کے دل اور دماغ کی تمام قوتیں ایک نقطہ پر مرکوز ہو چکی ہوں گی۔

قرآن کریم نے حضرت یعقوبؑ کی وجد و مسرت کی اس والہانہ کیفیت کو عجب شمیم یوسفی کی عطر بیزیاں دلاؤ نیز پیرا یہ میں بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہے :

﴿۱۲﴾ **وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ**

**لَوْلَا أَن تَفِنْدُونَّ ﴿۹۴﴾**

جب یوسفؑ کے بھائیوں کا قافلہ روانہ ہوا تو یعقوبؑ نے لوگوں سے کہنا شروع کر دیا کہ اگر تم لوگ یہ نہ سمجھو کہ بڑھاپے کی وجہ سے میری عقل ماری گئی ہے تو مجھے یوسفؑ اور اس کی عظمت و اقتدار کی مہک آ رہی ہے۔

سُننے والوں کی نگاہیں بھلا وہ کچھ کب دیکھ سکتی تھیں جو قلبِ یعقوبؑ کو محسوس اور دیدہ یعقوبؑ کو نظر آ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اب وحی کی طرف سے بھی کچھ اشارہ مل گیا ہو جیسا کہ (۱۲) سے مترشح ہوتا ہے۔ لیکن سُننے والے اسے (معاذ اللہ) خبط ہی کہتے تھے۔

﴿۱۲﴾ **قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالٍ الْقَدِيمِ ﴿۹۵﴾**

سُننے والوں نے کہا کہ بخدا! تم ابھی تک اپنے اُس پُرانے خبط میں مبتلا ہو۔ (یوسفؑ کا نام و نشان تک بھی گم ہو چکا ہے اور تمہیں اس کی عظمت و اقتدار کی مہک آ رہی ہے!)

انہی میں وہ بیٹا جس کے پاس کُرتہ تھا، اس مژدہ جانفز کو لے کر حضرت یعقوبؑ کے پاس آ پہنچا۔

﴿۱۲﴾ **فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَىٰ وَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا ﴿۹۶﴾**

**قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۹۶﴾**

چنانچہ وہ قافلہ کنعان پہنچ گیا اور خوش خبری دینے والے نے یوسفؑ کا کُرتہ یعقوبؑ کے سامنے پیش کیا تو اُسے یقین آ گیا کہ فی الواقعہ یوسفؑ زندہ بھی ہے اور اس قدر شان و شوکت کا مالک بھی! اس نے لوگوں سے

کہا کہ کیا میں تم سے نہیں کہا کرتا تھا کہ مجھے اللہ کی طرف سے وہ علم دیا گیا ہے جو تمہیں نہیں دیا گیا۔ اس مقام پر کہا اِنِّیْ اَعْلَمُ مِنْ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اس میں وحی کا اشارہ بھی شامل تھا، اگرچہ ایک نبی کی ذاتی فراست و بصیرت بھی کچھ کم حقیقت آشنا نہیں ہوتی۔ باپ کی اس کیفیت کے ساتھ بیٹوں کی حالت کا بھی اندازہ لگائیے۔ باپ کے سامنے اُن کی نگاہیں اُوپر کو نہیں اُٹھ سکتی تھیں۔ اُنہوں نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے کہا:

﴿۱۲/۹۷﴾ قَالُوْا يَاۡۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا اِنَّا كُنَّا خٰطِیِّیْنَ ﴿۹۷﴾

بیٹوں نے باپ سے کہا کہ ہم بڑے خطا وار ہیں۔ (ہم اس قابل تو نہیں کہ ہمیں معاف کیا جائے لیکن ہماری پھر بھی آپ سے درخواست ہے کہ، آپ ہمارے لیے معافی طلب کریں۔

حضرت یعقوبؑ نے فرمایا:

﴿۱۲/۹۸﴾ قَالَ سَوْفَ اسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَبِّیْ ط اِنَّهُ هُوَ الْعَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۹۸﴾

یعقوبؑ نے کہا۔ میں تمہارے لیے اپنے رب سے سامانِ حفاظت طلب کروں گا۔ اس لیے کہ اس کے قانون

مکانات میں رجرائم سے تائب ہو جانے والوں کے لیے، حفاظت و مرحمت کی گنجائش ہے۔

اس کے بعد یہ تمام گھرانہ شاداں و فرعاں جانبِ مصر روانہ ہوا حضرت یوسفؑ نے شہر سے باہر اُن کا استقبال کیا۔

﴿۱۲/۹۹﴾ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰی یُوْسُفَ اُوْیِ اِلَیْهِ اَبُوْیْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا

مِصْرَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ ﴿۹۹﴾

جب وہ یوسفؑ کے پاس پہنچے تو اُس نے اپنے والدین کو خاص اپنے پاس ٹھہرایا اور باقی اہلِ خاندان سے بھی کہا کہ

اب تم مصر میں، اِن شَاءَ اللّٰهُ، آرام سے رہو گے (یعنی چونکہ یہ سب کچھ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہو

رہا ہے اس لیے تم آرام سے رہو گے۔ امن و مشروط ہے قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے)۔

حضرت یوسفؑ نے جشنِ مسرت کے طور پر دربار منعقد کیا۔ ماں باپ کیلئے

مسند بچائی، اہل دربار تعظیم بجالائے۔ عزت و وقار اور عظمت و اجلال کا

عزّت و تکریم کی مسندیں

یہ وہ منظر تھا جسے آج سے بہت عرصہ پہلے حضرت یوسف نے اپنے خواب میں دیکھا تھا۔ وہ آج یوں پورا ہوا:

﴿۱۲﴾ وَرَفَعَ أَبُو يَهُدَى عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا وَقَالَ يَا بَنِي

هَذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا وَقَدْ أَحْسَنَ

بِي إِذْ أَخْرَجْتَنِي مِنَ السَّبْحِ وَجَاءَ بِكُمْ مِنَ الْبَدْوِ مِنْ بَعْدِ

أَنْ تَزْعُمَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِمَا

يَشَاءُ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿۱۰﴾

اُس نے اپنے ماں باپ کو عزت و تکریم کی بلند مسندوں پر بیٹھایا اور تمام متعلقین، اہل کار اور خدام یوسف کی وجہ سے ان کی تعظیم بجالائے۔

اُس وقت یوسف نے کہا: ابا جان! یہ ہے میرے اُس خواب کی تعبیر جو میں نے اتنا عرصہ پہلے دیکھا تھا۔ میرے نشوونما دینے والے نے خواب کو حقیقت بنا کر دکھا دیا۔ اس کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے قید خانے سے نکال کر (اس مقام بلند تک پہنچا دیا)، اور مخالفت کی اس خلیج کو پاٹ کر جو شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان حائل کر دی تھی، آپ سب کو صحرا سے یہاں منتقل کر دیا کہ سب عزت اور آرام کی زندگی بسر کریں، حقیقت یہ ہے کہ میرا نشوونما دینے والا، اپنی اسکیموں کو بڑے ہی لطیف انداز سے برفٹے کار لانا اور تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ اس کی ہر بات علم و حکمت پر مبنی ہوتی ہے۔

ان نوازشات بے پایاں کے احساس سے حضرت یوسف کی گردن اس محسن حقیقی کے حضور جھک گئی جس کی ذرہ نوازیوں کے صدقے یہ سب کچھ دیکھنے میں آیا تھا اور اس کی بارگاہ میں عرض کیا:

﴿۱۲﴾ رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمَلِكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ

فَأَطَّرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنْتَ وَلِي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحَقَنِي بِالصَّالِحِينَ ﴿۱۱﴾

ان تمام گزشتہ واقعات کی یاد سے یوسف کے دل میں تشکر و امتنان کے جذبات موجزن ہو گئے۔ اور

اس نے بحضور رب العزت عرض کیا کہ (اے میرے نشوونما دینے والے! تیرا کتنا احسان ہے کہ تو نے مجھے اس قدر اختیارات و اقتدارات کا مالک بنا دیا۔ مجھے تدبیر امور اور عاقبت اندیشی کا علم و سلیقہ عطا فرما دیا۔ اے کائنات کے پیدا کرنے والے! تو ہی حال اور مستقبل، دنیا اور آخرت، میں میرا کارساز و رفیق ہے۔ مجھے توفیق عطا فرما کہ میری ساری زندگی تیرے قوانین کی اطاعت میں گزرے اور میرا شمار ان نیک بخت لوگوں میں ہو جن کے سب کام سنور گئے ہوں!

غور فرمائیے۔ دنیا کی حکومت اور شوکت کے ساتھ ساتھ دعا کیا مانگی جا رہی ہے؟ یہ کہ جب دنیا سے جاؤں تو ایک عبدِ مسلم کی حیثیت سے جاؤں اور عاقبت میں تیرے صالح بندوں کے زمرہ میں شریک ہوں! یہ ہے ایک عبدِ مومن کی دین و دنیا کی آرزوؤں کا منتہی! کیسا خوش بخت ہے وہ انسان اور کیسی طالعند ہے وہ قوم جس کو وہ مبداء فیض، دین و دنیا کی سرفرازیاں عطا فرمادے۔ لیکن یہ سب کچھ عطا ہوتا ہے ایمان و عمل صالح کے نتیجہ میں، نہ کہ صرف خاص قسم کے نام رکھ لینے اور رسمی دعائیں مانگ لینے سے!



یہ ہے حسن عمل کی وہ سرگزشتِ زریں جسے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضور نبی اکرم پر نازل فرمایا:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ اِلَيْكَ ۗ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ  
 اَجْمَعُوْا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَ مَا اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ  
 بِسُوْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَ مَا سَأَلْتَهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ  
 لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴﴾

اے رسول! یہ وہ تاریخی سرگزشتیں ہیں جو تیرے علم میں نہیں تھیں اور جنہیں ہم نے تمہیں وحی کے ذریعے بتایا ہے۔ تم برادرانِ یوسف کے پاس کھڑے نہیں تھے جب وہ اپنی سازش پر تنفق ہو گئے تھے اور وہ یوسف کے خلاف خفیہ تدبیریں کر رہے تھے۔ (اس لیے تمہیں ان واقعات کا علم کیسے ہو سکتا تھا)۔

(تمہارے رسول ہونے کی یہ بھی ایک واضح شہادت ہے، لیکن اس کے باوجود) بہت سے لوگ اس پر ایمان نہیں لائیں گے خواہ تم کتنا ہی کیوں نہ چاہو۔

حالانکہ تو ان سے اس کے معاوضے میں کچھ نہیں مانگتا۔ بلا مزد و معاوضہ ان کی بھلائی کے لیے اس قدر کوشش کر رہا ہے۔

یہ داستان شیریں ختم ہو گئی۔ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے اس کے چند ایک اہم مقامات پر ننگہ بازگشت کی ضرورت ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو ”تاویل الاحادیث“ کا علم عطا فرمایا تھا۔ چونکہ حضرت یوسفؑ نے خوابوں کی تعبیر بتائی تھی اس لیے عام طور سے سمجھ لیا گیا کہ تاویل الاحادیث سے مراد خوابوں کی تعبیر کا علم ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائیگا۔

## تَاوِيلُ الْاِحَادِيثِ

خوابوں کی تعبیر کا علم بھی تاویل الاحادیث کے اندر شامل ہو سکتا ہے، لیکن تاویل الاحادیث سے مراد فقط تعبیر علم المنام نہیں۔ تاویل کے معنی نتیجہ اور مالِ کار کے بھی ہیں اور احادیث کے معنی ہیں باتیں۔ لہذا تاویل الاحادیث کے معنی ہوئے کسی بات سے یہ معلوم کر لینا کہ اس بات کا صحیح صحیح مطلب کیا ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کو معاملہ فہمی کہتے ہیں۔ یعنی کوئی معاملہ سامنے آئے، اُس کے سیاق و سباق اور متعلقات و تضمنات پر غور کر کے اس نتیجہ پر پہنچ جانا کہ اس کا مالِ انجام کیا ہوگا؟ غور کیجئے۔ دنیا میں ایک عام انسان اور ایک صاحبِ تدبیر و فراست میں کیا فرق ہوتا ہے؟ معاملات و واقعات ہر ایک کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتے ہیں۔ ایک عام ذہنی سطح کا انسان وہی کچھ دیکھتا ہے جو اس کے پیش نظر ہوتا ہے۔ لیکن ایک دیدہ ور کی نگاہیں ہواؤں کے رُخ سے طوفان کی آمد کا اندازہ کر لیتی ہیں۔ قوموں کی زندگی، ان کے مفکرین کی دیدہ وری اور مالِ اندیشی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ وہ مفکرین جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ

دو صد انا دریں محفل سخن گفت

سخن نازک نراز برگ سخن گفت

و لے بامن بگو آں دیدہ ور کیست

کہ خارے دید و احوال چسمن گفت (اقبال)

حضرت یوسفؑ کنعان کے گلہ بانوں کے ایک قبیلہ میں پیدا ہوئے۔ ہر چند قبیلہ کی سرداری ان کے گھرانے میں تھی، لیکن ظاہر ہے کہ انہیں وہاں حضرتیت کی سیاستِ مدن اور عمرانیات و معاشیات کے مہمات و معاملات سے متعلق نہ کوئی تعلیم مل سکتی تھی، نہ تربیت کے سامان موجود تھے۔ بدوی اور حضری زندگی کا فرق چھپا ہوا نہیں۔ اس لیے اس قسم کا ایک دہقانی بچہ جب ایک غلام کی حیثیت سے شہر میں آئے تو اس کی زندگی ایک غلامِ گھر کے ملازم سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک طرف بلند پایہ فراست عطا فرمائی اور اس کے ساتھ ایسے مواقع بہم پہنچائے

جن میں آپ نے عملی طور پر اہم معاملات کے نظم و نسق کا سلیقہ سیکھ لیا۔ یعنی عزیز مصر نے آپ کو اپنے کاروبار کا مختار اور معتمد علیہ بنالیا اور اس طرح آپ کو ان امور کا عملی تجربہ ہو گیا جو تمدنی زندگی کی خصوصیات میں سے تھے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مشیت کی طرف سے اس کا انتظام اس لیے کیا گیا تھا کہ یوسف کو تاویل الاحادیث کا علم سکھا دیا جائے۔ خوابوں کی تعبیر کا علم سکھانے کے لیے تمکن فی الارض کی ضرورت نہیں تھی۔

وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ زَوْجًا مِّنَّا مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ (۱۲)

اس طرح ہم نے سرزمین مصر میں یوسف کے پاؤں جمادیئے اور ایسا انتظام کر دیا کہ اس کی اچھی طرح سے تعلیم و تربیت ہو جائے اور اس میں معاملہ فہمی اور واقعات سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اللہ اپنی اسکیموں کو کامیاب بنا کر رہتا ہے لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں کہ ایسا کیوں اور کس طرح ہو رہا ہے۔

اسی حدود و فراست اور عملی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ جب حضرت یوسف کو حکومت و مملکت کے اختیارات تفویض کیے گئے تو آپ نے اس حسن تدبیر سے ان امور کا انتظام کیا کہ سب کی گردنیں آپ کے سامنے جھک گئیں! اللہ تعالیٰ کی اس توازش کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اس کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے مملکت عطا فرمائی اور اس کے ساتھ تاویل الاحادیث کا علم بھی دے دیا۔

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ فَاطِرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ قَدِ اتَّوَلَّيْتَنِي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ بِحَسَنِ تَوْفِيقِي مُسْلِمًا وَ الْحَقِّقِي بِالصَّالِحِينَ (۱۲)

ان تمام گزشتہ واقعات کی یاد سے، یوسف کے دل میں تشکر و امتنان کے جذبات موجزن ہو گئے، اور اس نے بھنور رب العزت عرض کیا کہ، اے میرے نشوونما دینے والے! تیرا کتنا بڑا احسان ہے کہ تو نے مجھے اس قدر اختیارات و اقتدارات کا مالک بنا دیا۔ مجھے تدبیر امور اور عاقبت اندیشی کا علم و سلیقہ عطا فرما دیا۔

اے کائنات کے پیدا کرنے والے! تو ہی حال اور مستقبل، دنیا اور آخرت میں میرا کارساز و رفیق ہے، مجھے تو رفیق عطا فرما کہ میری ساری زندگی تیرے قوانین کی اطاعت میں گزرے اور میرا شمار ان خوش بخت لوگوں میں ہو جن کے سب کام سنور گئے ہوں۔!

لہذا اسی طرح حضرت موسیٰ کو بھی بچپن ہی میں فرعون کے محللات میں پہنچا دیا گیا تھا تاکہ وہ وہاں کی اس داخلی سیاست کا مشاہدہ کر سکیں جس سے انہوں نے بعد میں دوچار ہونا تھا۔

ان مقامات سے تاویل الاحادیث کا مفہوم واضح ہے۔ یعنی پیش نظر احوال و کوائف سے استنباط نتائج کی صلاحیت۔  
کہ خارے دید و احوال چمن گفت

۷۷

## ۲۔ خوابوں کی دنیا

قصہ حضرت یوسف میں خوابوں کے تذکرہ کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ خواب کی حقیقت کیا ہے؟ یہ مسئلہ اُس وقت سے ارباب فکر و نظر کی توجہات کا مرکز بنا چلا آ رہا ہے جب سے انسان نے سوچنا شروع کیا۔ عصر حاضر میں تجزیہ نفس کے ماہرین (بالخصوص فرائڈ اور اس کے مکتب فکر) نے اس مسئلہ کو خاص طور پر اپنے غور و فکر اور تحقیق و تفتیش کا موضوع بنایا ہے جن کی عملی کاوشوں کی بنا پر اس چیتان کے کئی ایک گوشوں پر روشنی پڑ چکی ہے۔ چونکہ یہ علم ہتوز اپنے عہد طفولیت میں ہے اس لیے یہ روشنی ابھی دھندلی سی ہے۔ لیکن بایں ہمہ اس موضوع کے کچھ نہ کچھ خط و خال سامنے ضرور آچکے ہیں۔ اس علم کی رُو سے انسان میں نفس شعوریہ (CONSCIOUS MIND) کے علاوہ نفس غیر شعوریہ (UNCONSCIOUS MIND) بھی ہے۔ انسانی زندگی میں بہت سے احوال و کوائف ایسے ہونے ہیں جنہیں نفس شعوریہ کچھ وقت تک یاد رکھتا ہے لیکن اس کے بعد یا تو ان واقعات کو بیکسر بھلا دیتا ہے یا ان کے خصوصی احاسات اور تاثرات کے نقوش اپنی لوح سے محو کر دیتا ہے۔ لیکن نفس غیر شعوریہ ان واقعات کے اہم حصص اور ان کے خصوصی تاثرات کو اپنی گہرہ میں باندھ کر رکھ لیتا ہے۔ یہ تاثرات نفس شعوریہ کے ساتھ متضاد مہوتے رہتے ہیں اور اس طرح انسان کے نظامِ عصبی کو غیر محسوس طور پر متاثر کرنے رہتے ہیں۔ ان سے اس قسم کے عوارضات لاحق ہو جاتے ہیں جن کا کوئی طبعی سبب (PHYSICAL CAUSE) سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ حصہ ایک جدا گانہ بحث سے تعلق رکھتا ہے بحث زیرِ نظر کے لیے اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ نفس نیم یا غیر شعوریہ اس وقت اپنا عمل شروع کرتا ہے جب نفس شعوریہ کی فعالیت (ACTIVITY) معطل ہوتی ہے (مثلاً حالتِ نشہ میں یا ہلکے سے غش یا ہسٹریا وغیرہ کے دورے میں)۔ لیکن نفس غیر شعوریہ کو اپنی کار فرمائی کے لیے ان ہنگامی مواقع سے بھی زیادہ فرصت کا زمانہ اس وقت ملتا ہے جب انسان سو رہا ہو۔ اس وقت نفس شعوریہ کی حرکت معطل ہوتی ہے اور نظامِ جسمانی میں کسی قسم کا انتشار و اضطراب بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے نفس نیم یا غیر شعوریہ اپنے ”جادو“ کے الیم کو کھولتا ہے اور پھر بھولے ہوئے افسانوں کی مختلف

۷۸ نفس انسانی سے متعلق بحث سابقہ جلدوں میں آچکی ہے۔ انڈکس دیکھیے۔



تصویریں ذہن کے پردہ سیمیں پر لاتا ہے۔ واقعات میں ترتیب اور ان کے تناجج و عواقب میں ربط و ضبط نفس شعور کا منصب ہے۔ اس لیے نیم یا غیر شعور یہ نفس جن تاثرات یا واقعات کے ٹکڑے سامنے لاتا ہے، ان میں کوئی باہمی ربط یا ترتیب نہیں ہوتی۔ بنا بریں، اس کی پیش کردہ فلم عجب بے ربطی کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض اوقات ایسے ٹکڑے بھی سامنے آجاتے ہیں جو اچھے خاصے مربوط ہوتے ہیں، اسی کا نام خواب ہے۔ ان تاثرات میں جنہیں نفس شعور یہ بھلا دیتا ہے اور نفس نیم یا غیر شعور یہ اپنے اسٹور میں جمع رکھتا ہے، ہزاروں خوں گشتہ آرزوئیں، سینکڑوں پامال شدہ تمنائیں، بیسیوں ایسی لپجائی ہوئی نکاحاں جو حسرت بن کر دل کی گہرائیوں میں جا چھپی ہوں، خوابیدہ ہوتی ہیں۔ جب نفس شعور یہ کی دنیا سوتی ہے تو یہ خوابیدہ حسرتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ لیکن بے ربطی مضمون سے طلسم ہو شرابا کا سا افسانہ بن کر سامنے آتی ہیں اور جب نفس شعور یہ کی آنکھ کھلتی ہے تو اس افسانے کے بعض ٹکڑے کسی بھولے ہوئے واقعہ کی دھندلی سی یادوں تازہ کر دیتے ہیں جیسے مر مر میں گر دین ڈوبی ہوئی وادی کہسار کے اُس پار، رات کے ستارے میں دُور سے ہنسی کی آواز دل کے نرم و نازک گوشوں میں میٹھا میٹھا درد پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر خواب کا افسانہ، اس کی بے ربطی ہی کی نذر ہو جاتا ہے۔ علم تجزیہ نفس کے ماہرین، خوابوں کے ان بے ربط ٹکڑوں سے نفس نیم یا غیر شعور یہ کی تہ میں چھپے ہوئے رازوں کی ٹوہ لگاتے ہیں۔ اس کے لیے انہیں بڑی صبر آزمائش کرنا پڑتی ہے۔ وہ خواب دیکھنے والے کی سابقہ زندگی کے احوال و کوائف معلوم کرتے ہیں۔ وہ ان نیم کش تیروں کی انیاں تلاش کرتے ہیں جو دل کے اندر ٹوٹ کر رہ گئی ہوں۔ وہ ایسی پھانسیوں کی ٹوہ لگاتے ہیں جو رگ جان میں ڈوب کر پھر نہ اُبھری ہوں۔ اس طرح وہ خواب دیکھنے والے کے خیالات کی رُو اور ذہن کی افتاد کا مطالعہ کرتے ہیں، اور اس سے بعض اہم نتائج پر پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ قیاسی ہوتا ہے، حتیٰ طور پر وہ بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ محقق اپنے قیاسات سے خواب کے معاملات کو آنے والے واقعات سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ مستقبل کے واقعات خواب یا اس کی تعبیر کے مطابق نکل آتے ہیں لیکن یہ محض اتفاقی امور ہیں۔ انہیں حقائق سے کچھ واسطہ نہیں۔ مثلاً ہوتا کیا ہے؟ آپ کی شدید تمنا ہے کہ آپ کا مستقبل فلاں سانچے

لہ بیداری کے وقت جو کچھ خواب کے متعلق یاد رہتا ہے وہ سب کچھ وہی نہیں ہوتا جو نفس غیر شعور یہ حالت خواب میں سامنے لاتا ہے۔ جو کچھ خواب میں سامنے آتا ہے، علم تجزیہ نفس کی رُو سے اُسے (LATENT CONTENT) کہا جاتا ہے اور حالت بیداری میں جو کچھ یاد رہتا ہے اُسے (MANIFEST CONTENT) کہتے ہیں۔ اس (MANIFEST CONTENT) سے (LATENT CONTENT) کا سراغ لگانا خواب کی تعبیر کہلاتا ہے۔

میں ڈھلے لیکن حالات اور واقعات آپ کو اس طرف جانے نہیں دیتے۔ آپ کا نفس شعوریہ حالات اور واقعات کے مطابق کام کرتا ہے لیکن جو بھی آپ سوتے ہیں، نفسِ نیم یا غیر شعوریہ آپ کی نمناکی سوئی ہوئی دنیا کو بیدار کر دیتا ہے اور وہ ایک حسین خواب کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ جب آپ جاگتے ہیں تو پھر اپنے احوال و ظروف کے مطابق مصروفِ کار ہو جاتے ہیں۔ اب آخر میں دو صورتوں میں سے ایک صورت پیدا ہوگی۔ یا تو آپ کا مستقبل آپ کی آرزوؤں کے خلاف عام احوال و ظروف کے قالب میں ڈھل جائے گا۔ اس صورت میں آپ کے خواب جو آپ کے مستقبل کو آپ کی تمناؤں کے رنگ میں پیش کیا کرتے تھے، محض واہمہ بن کر رہ جائیں گے۔ لیکن اگر ایسا ہو گیا کہ آپ نے احوال و ظروف کے علی الرغم، اپنے مستقبل کو اپنی خواہشات کے مطابق منسحل کر لیا تو اس صورت میں آپ کے خواب "حرف بحرف سچ ہو کر" سامنے آجائیں گے۔ اس وقت آپ کہہ اٹھیں گے کہ مجھے پہلے ہی خواب میں اشارہ ہو گیا تھا کہ میرا مستقبل کیا بننے والا ہے۔ اس طرح آپ کے خواب "پیش گوئی" (PROPHETIC) ہو جائیں گے۔ یہ صرف ایک مثال ہے۔ اس پر دیگر واقعات کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔ اور (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) بہت سی باتیں تو اتفاقی امور (COINCIDENCE) سے متعلق ہوتی ہیں۔

یہ ہے خواب کی حقیقت جو اس وقت تک کی علمی تحقیق کی رُو سے سامنے آئی ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، علم تجزیہ نفس اور اس کے تضمنات ہنوز اپنے ابتدائی مراحل میں ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ جو کچھ اس وقت تک سامنے آیا ہے، وہی حقیقت ہے۔

لیکن بہر کیف علمی تحقیقات کی رُو سے، جو کچھ سامنے آیا ہے وہ یہی ہے۔ اس تحقیق کی رُو سے، خواب انسان کے اپنے ہی گم گشت خیالات و تصورات اور دہلی ہوئی تمناؤں اور آرزوؤں کی صداٹے بازگشت ہوتے ہیں۔ انہیں کسی اور دنیا سے تعلق نہیں ہوتا۔ اس لیے جس قسم کے خیالات و تصورات ہوں گے اسی قسم کے خوابوں کی دنیا ہوگی۔ جن لوگوں کے خیالات و تصورات اور تمناؤں اور مقاصد کثافتوں سے پاکیزہ ہوں گے، ان کے خواب بھی آئینے کی طرح مصفا ہوں گے۔ جن کے فکر و نظر کی تطہیر ہو چکی ہوگی ان کے خوابوں کی دنیا میں بھی کوثر و سلسبیل کی آبشاریں نغمہ بار ہوں گی۔ حضراتِ انبیاء کرام خیالات و تصورات کی پاکیزگی و رفعت میں انسانی امکان کی بلند ترین سطح پر ہوتے تھے، اس لیے جیسی ان کے قلب و نگاہ کی دنیا، ویسے ان کے خواب!

اب رہا خواب کی تعبیر کا سوال، سو جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اس کا تعلق انسانی فراست سے ہے۔ جو مختلف احوال و ظروف کی روشنی میں قیاسی نتیجہ پر پہنچا دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تعبیرات محض ظنی اور قیاسی ہوتی

ہیں۔ اس میں نبی اور غیر نبی کا فرق نہیں ہوتا۔ کیونکہ نبی بھی اس باب میں جو کچھ کہے گا وہ اس کی ذاتی (بشری) فراست پر مبنی ہوگا۔ وحی پر مبنی نہیں ہوگا۔

اس تمہید کو سامنے رکھ کر قصہ حضرت یوسف کے خوابوں پر غور کیجئے۔ پہلا خواب خود حضرت یوسف کا ہے۔ ہر چند وہ ان کے (قریب قریب) بچپن کا زمانہ ہے، لیکن خانوادہ نبوت کا چشمہ و چراغ اور خود بھی ہونے والا نبی، اس لیے آپ کا خواب بھی انہی بلند خیالات کا آئینہ دار تھا، جن کی آماجگاہ آپ کا قلب و دماغ تھا شمس و قمر اور روشن ستارے سجدہ ریز! یہ تھا خواب، اور اس کی تعبیر بتانے والے حضرت یعقوب، جنہیں بیٹے کا طالع بلند اس کی سیرت کی پیشانی میں درخشاں نظر آ رہا تھا۔

دوسرا خواب قید خانہ کے ساتھیوں کا تھا۔ اس کی تعبیر کے سلسلہ میں کہا جاسکتا ہے کہ کچھ وقت تک ساتھ رہنے سے فراست یوسفی نے بھانپ لیا ہوگا کہ ان میں ایک بے گناہ ہے اور دوسرا واقعی مجرم۔ خود ان کے خیالات کی رو کا پچھل لینا بھی مشکل نہ تھا، اس لیے ان کے خوابوں کی تعبیر چنداں دشوار نہ تھی۔ یہ درحقیقت آپ کی صلاحیتِ تاویل الاحادیث ہی کا ایک مظاہرہ تھا۔ یعنی اس میں معاملہ فہمی کو زیادہ دخل تھا۔ لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک طرف قرآن نے اس تعبیر کا ذکر ایسے انداز میں کیا ہے جس سے سوچ کا رخ اس طرف جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا علم آپ کو بذریعہ وحی عطا کر دیا تھا۔ آپ نے تعبیر بتانے کے بعد فرمایا: **قُضِيَ الْأَمْرَ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتَلِينَ** جس بات کے بارے میں تم سوال کرتے ہو وہ فیصل ہو چکی ہے۔ اور فیصلہ وہ ہے جو میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ دوسری طرف قرآن نے اگلی آیت میں کہا ہے: **وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا (۱۲) ان میں سے جس کے متعلق اس نے اندازہ لگایا تھا (ظَنَّ) کہ وہ چھوٹ جلتے گا، اس سے کہا:....** ”یہاں کہا گیا ہے کہ خواب کی یہ تعبیر حضرت یوسف کا ظن تھی۔ ظن کے معنی کے متعلق امام راغب نے لکھا ہے کہ کسی چیز کی علامات سے انسان جس نتیجہ پر پہنچے، اُسے ظن کہتے ہیں اور یہ صرف قیاس اور اندازہ ہوتا ہے، یقینی بات نہیں ہوتی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تعبیر آپ کی اپنی فراست کا نتیجہ تھی۔ وحی کی صورت میں اسے ظن نہیں کہا جاسکتا تھا۔ وحی تو یقین ہوتا ہے بلکہ یقین کی بھی

لہ بعض اذفات طبیعت کے اثر سے بھی خواب مرتب ہو جاتے ہیں۔ مثلاً سوتے میں پیاس لگے تو انسان خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ آگ میں جھلس رہا ہے، یا پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں پڑا ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ پیاس سے اُس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں۔ اس قسم کے خواب محض مزاج کے اثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں جنہیں **اضغاث احوال** (پریشان خیالی) کہا جاتا ہے۔ یہ طب کی دنیا سے متعلق ہے۔

انتہائی شکل۔

تیسرا خواب بادشاہ کا ہے۔ حضرت (یوسفؑ) جیسے دیدہ و راضی صاحب فراست کے لیے، جو اس ملک کے حالات کا یقیناً گہری نظر سے مشاہدہ اور مطالعہ کر رہے ہوں گے، یہ اندازہ لگانا کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ ملک کی زرعی معیشت کس طرف جا رہی ہے۔ اس کا آئینہ دار بادشاہ کا خواب تھا۔ اس میں قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ اس کی تعبیر اور تدبیر کی بنیاد وحی کا علم تھا۔



یہاں تک داستان حضرت یوسفؑ سے متعلق خوابوں کا ذکر تھا۔ لیکن قرآن کریم میں دو اور اہم خوابوں کا ذکر بھی آیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بر محل ہو گا اگر ان کا ذکر بھی اس مقام پر کر دیا جائے۔ ان میں ایک خواب ذبح حضرت اسمعیلؑ کے متعلق، حضرت ابراہیمؑ کا ہے اور دوسرا خواب دصلح حدیبیہ کے متعلق، نبی اکرمؐ کا۔ حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں ذبح کر رہے ہیں۔ انہوں نے اسے خدا کے حکم پر محمول کر لیا اور بیٹے کو ذبح کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس مقام پر خود خدا نے ان سے کہا کہ یہ تو محض تمہارا خواب تھا جسے تم نے حقیقت سمجھ لیا۔ یہ خدا کا حکم نہیں تھا۔ تفصیل اس کی مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۲۵ میں گزر چکی ہے۔

دوسرا خواب نبی اکرمؐ کا صلح حدیبیہ سے متعلق تھا۔ آپ ہجرت فرما کر مکہ سے مدینہ تشریف لے آئے۔ یہاں آپ کے مشن کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن چونکہ نظامِ خداوندی کا مرکز کعبہ تھا، اس لیے اس کی تولیت کی آرزو آپ کے دل میں بڑی شدت سے بنیاب رہتی تھی۔ انڈکس میں آپ قبلہ کا عنوان دیکھئے۔ یہ حقیقت واضح طور پر آپ کے سامنے آجائے گی۔ اسی شدتِ آرزو کا نتیجہ تھا کہ آپ نے مکہ میں خواب میں دیکھا کہ آپ مع صحابہؓ مکہ میں داخل ہو کر کعبہ کا طواف کر رہے ہیں۔

اس وقت تک مسلمانوں پر حج فرض نہیں ہوا تھا، لیکن زمانہ قبل از اسلام میں عرب حج بھی کیا کرتے تھے۔ اور عمرہ بھی۔ چنانچہ آپ نے اپنے خواب کی بنا پر عمرہ کے ارادے سے مکہ کا قصد فرمایا اور شدتِ شوق میں صحابہؓ کی قریب ڈیڑھ ہزار کی جماعت آپ کے ہم رکاب ہو گئی۔ ابھی آپ مکہ سے ایک منزل دور حدیبیہ کے مقام پر تھے کہ قریش نے پیغام بھیج دیا کہ وہ آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے، آپ اگلے سال آنیے چنانچہ اس کے مطابق قریش کے ساتھ معاہدہ بھی ہو گیا اور حضورؐ مدینہ واپس تشریف لے گئے۔ اس سے صحابہؓ کے دل میں

کھٹک پیدا ہوئی کہ جب آپ نے اپنے خواب کی بنا پر یہ عزم فرمایا تھا تو پھر اس میں کامیابی کیوں نہ ہوئی (روایت میں یہ بھی ہے کہ) حضرت عمرؓ نے آپ سے براہ راست دریافت کیا کہ کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم کعبہ کا طواف کریں گے۔ آپ نے فرمایا: لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ اس سال کریں گے۔ (سیرت النبیؐ شبلی نعمانی حصہ اول ص ۴۲) قریش نے آپ کے خواب اور اس ناکامی کا (معاذ اللہ) مضحکہ اڑایا۔ قرآن کے الفاظ میں وَقَدْ جَعَلْنَا السُّرِّيَّاتِ الْبَيْتِ آيَاتٍ لِّلنَّاسِ (۱۲۱) یہ خواب لوگوں کے لیے فتنہ کا موجب بن گیا۔ دو سال بعد جب مکہ فتح ہوا اور حضور فاتح و منصور اس میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُوْلَهُ السُّرِّيَّاتِ الْبَيْتِ الْحَقِّ (۱۲۲) خدا نے رسولؐ کا خواب سچ کر دکھایا، ہم نے اس مقام پر ان واقعات کا تفصیلی تذکرہ نہیں کیا۔ کیونکہ اس وقت زیر بحث صرف خوابوں کا ذکر ہے۔ (ان موضوعات تفصیلات اپنے مقام پر آئیں گی۔)

مندرجہ بالا تصریحات سے واضح ہے کہ :

- ۱۔ حضورؐ کا خواب اس شدتِ آرزو کا آئینہ دار تھا جو توبیتِ کعبہ کے لیے آپ کے دل میں موجزن رہتی تھی۔
  - ۲۔ اس خواب کی بنا پر آپ نے عمرہ کا عزم بھی کر لیا لیکن وہ ناکام رہا۔
  - ۳۔ خواب کی تعبیر میں آپ سے اجتہادی غلطی ہوئی جو آپ نے (حضرت عمرؓ کے سوال کے جواب میں) فرمایا کہ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم اسی سال مکہ میں داخل ہوں گے۔
- ان تصریحات سے واضح ہے کہ رسولؐ اللہ کے خواب میں بھی وحی کا دخل نہیں تھا۔



جو کچھ سابقہ صفحات میں لکھا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ خواب انسان کے اپنے ہی خیالات و تصورات کا پریشان سا عکس ہوتے ہیں۔ کسی اور دنیا سے ان کا کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ لہذا، خوابوں کی دنیا کو ایک مستقل عالم قرار دے کر اس پر حقائق کی بنیاد رکھ دینا، افسانہ طرازی سے زیادہ کچھ نہیں۔ حقائق کا تعلق علم سے ہے۔ عام انسان کسب و ہنر سے علم حاصل کرتا ہے جو یقینی بھی ہوتا ہے اور ظنی بھی۔ یکسر یقینی علم وحی کی رو سے حاصل ہوتا ہے۔ خوابوں کا ان دونوں اقسام کے علم سے تعلق نہیں ہوتا۔ نہ کسی کا خواب کسی دوسرے (یا خود خواب دیکھنے والے) کے لیے حجت ہو سکتا ہے اور نہ اس کی تعبیر کوئی خدائی سند اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ لیکن حقائق سے منہ موڑ لینے کے مسلمانوں کے ہاں جس طرح اوہام پرستی کے سینکڑوں اور دروازے کھل گئے، ان میں خوابوں کی توہم پرستی بھی

شامل ہوگئی کہ فلاں بزرگ خواب میں آکر یہ ارشاد فرما گئے ہیں۔ اب اس کی تعمیل آیت خداوندی سے بھی زیادہ مقدم ہے۔ مقدم ہی نہیں بلکہ اگر ان کا وہ ارشاد حکم شریعت کے صریحاً خلاف بھی جاتا ہے تو بھی یہ کہہ کر اس کو ترجیح دی جاتی ہے کہ شریعت ظواہر پرستی ہے اور وہ بزرگ حقیقت شناس ہیں۔ اس لیے ان کے ارشاد میں ایک ایسا راز پنہاں ہے جسے ظاہر میں آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ اسی پر بس نہیں، قیامت یہ ہے کہ قرآن حکیم کی تفسیر بھی علم المنام کی رُو سے کی جاتی ہے۔ مثلاً قرآن کریم کی کسی آیت کا واضح مفہوم اگر ان کے مفید مطلب نہیں تو وہ کہیں گے اس میں فلاں فلاں لفظ کے متعلق تعبیر نامہ میں لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہوتی ہے (اور تعبیر ناموں میں ایک ایک لفظ کے متعلق میں مفہوم درج ہوتے ہیں تاکہ ہر ایک اپنے اپنے مطلب کے مطابق تعبیر لے لے)۔ لہذا قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم ہے۔ یعنی ان لوگوں کے نزدیک قرآن کریم (معاذ اللہ، معاذ اللہ) اللہ کے خوابوں کا مجموعہ ہے جس کی تفسیر نہیں، بلکہ تعبیر (تعبیر المنام و خوابوں کے تعبیر نامہ) کی رُو سے کی جائے گی۔ مَا قَدَّرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهِ حَقَائِقَ كِتَابِ تَفْسِيرِ اَيْسَةِ نَلَيَاتٍ وَ غَرَافَاتٍ كِي رُو سِے ! اور اس پر دعویٰ یہ کہ اس "قرآن فہمی" کا سرچشمہ خاص علم الہی ہے۔

خامہ انگشت بندناں کہ اسے کیا کہئے!

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھیے۔ اللہ تعالیٰ نے (نبی اکرم کے بعد) وحی کا دروازہ بند کر دیا تو ان لوگوں نے اس کے درپے کھول لیے۔ ان میں ایک درپے خواب بھی ہیں۔ (جنہیں مبشرات کہا جاتا ہے) اور مبشرات کو نبوت کا چالیسواں حصہ قرار دیا جاتا ہے۔ کاذب مدعیان نبوت اپنے دعویٰ کی بنیاد خوابوں پر رکھتے ہیں۔ غور فرمائیے مسلمان کتاب اللہ کے سرچشمہ نور و ہدایت کو چھوڑ کر جہل اور ادبام کی کیسی کیسی تاریکیوں میں ٹھوکرین کھاتا پھرتا ہے۔

گزشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرت یوسفؑ کا کنبہ مصر میں آیا تو آپ نے اپنے ماں باپ کے لیے مسند بچھوائی اور اہل دربار بطور ظہار تعظیم کو نش بجالائے۔

سجدہ

وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوا لَهُ سُجَّدًا ۚ (۱۲)

لے تفصیل ان امور کی میری کتاب "تصوف کی حقیقت" میں ملے گی۔

اس نے اپنے ماں باپ کو عزت و تکریم کی بند مسندوں پر بٹھایا اور تمام متعلقین، اہل کار اور خدام یوسف کی وجہ سے ان کی تعظیم بجالائے۔

لفظ سجدہ کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم ص ۱۰۱ پر بتایا جا چکا ہے کہ اس سے مفہوم پیشانی کو زمین پر رکھ دینا نہیں بلکہ اطاعت شعاری کا طریق اظہار ہے جو صرف اللہ کے لیے مختص ہے اور حق بھی یہ ہے کہ انسان کی گردن اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے جھکنی نہیں چاہیے۔ اس لیے قصہ حضرت یوسف میں سجدہ سے مراد یہ نہیں کہ اہل دربار (یا ان کے بھائیوں) نے سچے سچ زمین پر پیشانی رکھ دی بلکہ اس سے مراد تعظیم ہے۔ اور اگر اس سے مراد وہی سجدہ ہے جس سے انسان اپنا ماتھا زمین پر رکھ دیتا ہے تو اس صورت میں ”لے“ میں ضمیر کا مرجع خدا لینا ہوگا۔ یعنی اس شوکت و جلال کو دیکھ کر حضرت یوسف کے ماں باپ اور بھائی سب خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔ لیکن زبان کے قاعدہ کی رو سے ”رَفَعَ“ کے فاعل (حضرت یوسف) کو لے کی ضمیر کا مرجع قرار دینا زیادہ مناسب ہے۔ اس لیے (اس اعتبار سے) اس آیت کا مفہوم وہی درست ہوگا جو پہلے بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اہل دربار (اور حضرت یوسف کے بھائی) ادباً اور تعظیماً آپ کے سامنے جھک گئے۔ یا اگر ”لے“ کے معنی یہ لیے جائیں کہ حضرت یوسف کی خاطر، تو اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ جب حضرت یوسف کے والدین اور آپ کے بھائیوں نے آپ کی اس قدر عظمت و شوکت دیکھی تو اس کے لیے خدا کے حضور سجدہ تشکر ادا کیا۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ مسلمان کے لیے خدا کے سوا کسی اور کے سامنے تعظیم ہی کے لیے کیوں نہ ہو، سجدہ ریز ہونا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ عبد مومن ایک خدا کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو کر ساری دنیا کی چوکھٹوں سے سرفرازانہ بے نیاز گزر جاتا ہے۔

نہ تو قرآن کریم نے اس کی تصریح کی ہے کہ شاہ مصر آپ پر ایمان لے آیا تھا یا نہیں اور نہ ہی تاریخ اس واقعہ پر کوئی روشنی ڈالتی ہے۔ اس لیے اس کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ حضرت یوسف خدا کے رسول تھے۔ ان کا مقصد فقط اتنا ہی نہ تھا کہ اپنی برتیت ثابت کرنا اور قید خانہ سے نکل آئیں اور اس کے بعد بادشاہ کی حکومت میں شریک ہو کر نظام مملکت کی اصلاح کریں۔ رسول کے ذمہ خدا کا پیغام پہنچانا اور اس کے مطابق نظام زندگی قائم کرنا ہوتا ہے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ بادشاہ آپ کی رسالت پر ایمان لے آیا ہوگا۔ حالات بھی اس کے موید ہیں۔ بادشاہ نے آپ کے بند کیے کیڑ کا خود مشاہدہ کر لیا۔ ملک کے انتظام میں۔

فراست و تدبیر نکھر کر اس کے سامنے آگئے۔ جب یہ سب کچھ اس کے سامنے آگیا تو حضرت یوسفؑ کی صداقت پر ایمان لانے میں کون سا امر مانع ہو سکتا تھا؟ پھر حضرت یوسفؑ اخیر عمر تک اس ملک میں رہے اور وہیں متمکن فی الارض ہوئے۔ اگر وہ آپ کی دعوت کا انکار کرتا تو نہ آپ وہاں رہنا گوارا کرتے نہ وہ آپ کو وہاں رہنے دیتا۔ ان قرائن سے بھی ظاہر ہے کہ نظام مملکت حضرت یوسفؑ کے تجویز فرمودہ خطوط پر منسکل ہوا ہوگا۔ اگرچہ نسبت کی رو سے اسے "بادشاہ کا قانون" ہی کہا جاتا تھا۔ حضرت یوسفؑ کو وہاں کس قسم کے اختیارات حاصل تھے؟ اس کے لیے قرآن کریم کے ان الفاظ پر بھروسہ فرمائیے جہاں ارشاد ہے کہ وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَّبِعُوا مِنْهَا حَيْثُ شَاءَ وَرَدَّهُمْ عَلَيْهِمْ اس طرح ہم نے یوسفؑ کو مصوب میں متمکن کر دیا کہ وہ جس طرح چاہے وہاں کے نظم و نسق کو چلائے۔ یعنی آپ کے اختیارات اس قدر وسیع تھے۔ بائبل میں اس موقع پر لکھا ہے کہ بادشاہ نے حضرت یوسفؑ کو کل اختیارات دے رکھے تھے۔ خود حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمَلِكِ (۱۲) "میرے اللہ نے مجھے حکومت عطا فرمائی" اس سے بھی ظاہر ہے کہ آخر الامر حکومت آپ ہی کی قائم ہوئی۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ (معاذ اللہ) کسی طاغوتی نظام کے مدد و معاون نہ تھے، بلکہ آپ نے اس طاغوتی نظام کو خدائی نظام میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس باب میں سب سے عظیم اور محکم شہادت تو یہ ہے کہ جو شخص قید خانہ میں یہ اعلان کرتا ہے کہ اِنْ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ (۱۲) "حق حکومت خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں" اور اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا رَاٰیَا۟ (۱۲) "اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو" کیا ایک ثانیہ کے لیے بھی باور کیا جاسکتا ہے کہ اس نے باطل کے نظام... کی محکومیت اختیار کر لی ہوگی۔

سورۃ مومن کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوم بھی حضرت یوسفؑ پر ایمان لے آئی تھی اگرچہ سب کی سب نہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کے قصہ کے ضمن میں (جن کی بعثت حضرت یوسفؑ سے قریب چار سو سال بعد ہوئی) دربار فرعون کا مرد مومن اپنی قوم سے کہتا ہے:

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِّمَّا جَاءَكُمْ بِهِ ۖ  
حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ نَّبْعَثَ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِهِ رُسُلًا ۖ ... (۱۲)

اور دیکھو! اس سے پہلے یوسفؑ بھی تمہاری طرف خدا کے واضح قوانین لے کر آیا تھا لیکن تم نے ان قوانین کے بارے میں بھی شک کرنا نہ چھوڑا۔ چنانچہ جب وہ فوت ہو گیا (تو تم خوش ہو گئے۔ چلو یہ قصہ ختم ہوا)۔ اب اس کے بعد اللہ کسی رسول کو ہماری طرف نہیں بھیجے گا (اور کوئی ہمیں روکنے ٹوکنے والا نہیں ہوگا)۔



یہاں سے یہ واضح ہے کہ حضرت یوسف نے اپنا پیغام (رسالت) قوم مصر تک پہنچایا تھا۔ اب سوال یہ باقی رہتا ہے کہ آیا اسے پوری کی پوری قوم نے رد کر دیا یا تسلیم بھی ہوا اور رد بھی ہوا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ حقیقت کہ حضرت یوسف ۳۰ عمر بھر مصر میں رہے اور ممتاز حیثیت سے رہے، اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ان کے پیغام کو تسلیم کیا گیا تھا ورنہ یہ ممکن تھا کہ پوری قوم کی مخالفت کے باوجود آپ ایک ممتاز حیثیت سے دہاں رہ سکتے اور نہ ہی یہ کہ آپ بحیثیت رسول، اپنی تبلیغ سے باز رہتے۔ اس لیے اس حقیقت اور دربار فرعون کے مرد مومن کی محولہ صدر تقریر کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچا جاسکتا ہے کہ آپ کا پیغام تسلیم بھی کیا گیا اور اس کی بابت شک بھی کیا گیا اور یہ بھی کہ بادشاہ اور اس کا آئین حکومت حضرت یوسف کی منشاء کے مطابق تھا۔ اس کے لیے اس عظیم شہادت کو ایک بار پھر سامنے لائیے جو ابھی ابھی پیش کی جا چکی ہے یعنی **إِن الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ**۔ (۱۲)



**نبوت اور وراثت** قرآن کریم سے واضح ہے کہ حضرت ابراہیم کے بعد ان کے بیٹے حضرت اسحاقؑ بھی نبی تھے۔ پھر ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت یعقوبؑ اور ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت یوسفؑ بھی۔ اس سے سطح میں نگاہیں اس طرف جاسکتی ہیں کہ خاندان حضرت ابراہیمؑ میں نبوت وراثتاً منتقل ہوتی رہی تھی، یہ صحیح نہیں۔ آپ انڈکس میں نبوت اور وحی کے عنوانات دیکھئے، یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ نبوت کا ورثہ میں بل جانا تو ایک طرف، یہ کسی کو کسب و ہنر سے بھی نہیں بل سکتی تھی۔ اسلام میں تو حکومت بھی وراثتاً نہیں مل سکتی۔ چہ جائیکہ نبوت وراثتاً بل جائے۔ نبوت خالصتہً موهبتِ خداوندی تھی۔ ہونے والے نبی کو تو وحی ملنے سے ایک دن پہلے تک بھی اس کا علم نہیں ہوتا تھا کہ وہ نبوت سے سرفراز ہونے والے ہیں چہ جائیکہ نبوت وراثتاً بل جائے۔ نبوت انتخابِ خداوندی کا نتیجہ ہوتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اگر کوئی شخصیت اس مقصد کے لیے معیارِ خداوندی پر پوری اُترتی تھی تو اسے اس لیے مسترد نہیں کر دیا جاتا تھا کہ وہ کسی نبی کا بیٹا ہے۔

لیکن ہمارے یہاں جس طرح بادشاہت وراثتاً منتقل ہوتی ہے، اسی طرح "پیری مریدی" بھی۔ بادشاہ کا بیٹا د پہلے ولی عہد اور اس کے بعد بادشاہ۔ اسی طرح حضرت صاحبِ پیر (پیر جی) کا بیٹا (پہلے خلیفہ اس کے بعد) خود پیر اور یہ سلسلہ صدیوں تک چلتا ہے۔ یہی کیفیت ذاتوں، برادر یوں، گوتوں کی ہے۔ سید کا بیٹا سید۔ راجپوت کا بیٹا راجپوت، حتیٰ کہ ناموں کے ساتھ قاضی اور مفتی! یعنی کسی زلمے میں ان کے اسلاف میں سے کوئی قاضی یا مفتی ہوگا۔ اس کی اولاد پیدا کئی قاضی اور مفتی بن گئی!

یہ وہ نسل پرستی ہے جسے مثلے کے لیے اسلام آیا تھا!



مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں اس عظیم مقصد کو بھی چند الفاظ میں سمیٹ کر بیان کر دیا جائے جس کے لیے قرآن کریم نے اس داستان کو اس تابندگی سے پیش کیا ہے۔

مساعدا حالات اور موافق ماحول میں راست بازی اور دیانتداری کی زندگی بسر کرنا چنداں وقت طلب نہیں ہوتا لیکن مشکل وہاں آپٹنی ہے جہاں ماحول نامساعدا اور حالات مخالف ہوں۔ ایسے وقت میں حق و صداقت کو ہاتھ سے نہ جانے دینا یقیناً من عزم الامور ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کے صحیح کیریچر اور بلندٹی سیرت کا اندازہ بھی ایسے ہی ناموافق حالات میں لگایا جاسکتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ چاروں طرف مکر و فریب کے جال بچھ رہے ہیں۔ جھوٹ اور طمع کاری کو ہر طرف فروغ حاصل ہے۔ جو جس قدر زیادہ زمانہ ساز اور فریب کار ہے، اتنا ہی کامیاب و کامران ہے۔ صداقت اور راست اطواری کا ہر طرف گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ اس طرز زندگی سے قدم قدم پر مصائب و تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی دوڑ میں مسابقت، تصنع اور فریب کاری سے حاصل ہو رہی ہے۔ سچے اصولوں پر کار بند رہنے سے ناکامی ہی ناکامی نظر آتی ہے۔ آپ اس دوریہ پر ٹھٹک کر جک جلتے ہیں۔ ذہنی کشمکش آپ کو کچھ فیصلہ نہیں کرنے دیتی۔ کامیابیوں کا لالچ آپ کو بھی یہ فریب دیتا ہے کہ جن حربوں سے دوسرے لوگ کام نکال رہے ہیں، وہی مجھے بھی استعمال کرنے چاہئیں۔ دوسری طرف اصول پرستی ہے کہ وہ اس فریب کارانہ روش میں ہر مقام پر عنان گیر ہوتی ہے۔ ان حالات میں وہ لوگ جن کے سامنے نصب العین فقط حصول مفاد ہوتا ہے، (خواہ اس کے لیے کسی قسم کے ذرائع بھی کیوں نہ استعمال کرنے پڑیں)، اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جو کچھ اور لوگ کر رہے ہیں ہمیں بھی وہی کرنا چاہیے۔ نفس کا فریب یہ خوش آئند دلیل پیش کر کے "اطمینان" دلا دیتا ہے کہ ایک فرد کی اصول پرستی سولے اس کے کہ اس کی اپنی تباہی کا موجب بن جائے، اور کیا نتیجہ پیدا کر سکتی ہے۔ عوام ہی نہیں (بلکہ تنہا عقل کے زور پر مسائل حیات کو حل کرنے والے نظام میں) بڑے بڑے مفکرین بھی اسی نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ یورپ کا فلسفہ اخلاق کا بہت بڑا علمبردار "ہربرٹ اسپنسر" (HERBERT SPENCER) لکھتا ہے:-

مثالی زندگی بسر کرنے والے انسان کے لیے دوسری قسم کے انسانوں کے اندر مثالی زندگی بسر کرنا ممکن نہیں۔  
ان فریب کار لوگوں میں جن کا کوئی اصول نہ ہو، خالص سچائی اور صاف دلی، یقیناً ہلاکت کا موجب ہوتی ہے۔

ایسی روش زندگی پر جو عام مروجہ مسالک زندگی کے خلاف ہو، کامیابی کے ساتھ قائم نہیں رہا جاسکتا۔ یہ چیسینڈ  
آخر کار اس انسان کی اپنی یا اس کی نسل کی یادوں کی موٹ کا باعث ہوتی ہے۔

(THE PRINCIPLES OF ETHICS PART II P. 106)

ان لوگوں کے ایسے ہی فیصلے ہونے چاہئیں۔ لیکن جن کے سامنے حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے وہ ناموافق  
حالات اور نامساعد احوال و ظروف کے طوفان میں حق و صداقت کی چٹان بن کر کھڑے رہتے ہیں اور پھر دنیا دکھتی  
ہے کہ آخر الامر (ان کے اپنے سامنے یا ان کے بعد) ماحول کو ان کی روش کے تابع ہونا پڑتا ہے۔ ان کی حیاتِ طیبہ  
کا ایک ایک لمحہ اس حقیقتِ کبریٰ کا آئینہ دار ہوتا ہے کہ

حدیثِ بے خبران ہے تو بازمانہ بساز

زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ ستیزا

حضرت یوسفؑ کی داستانِ زرین اسی حقیقت کی پرودہ کشائی کرتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک فرد کا  
حسن کردار، باطل کے نظام کو الٹ کر حق کا نظام قائم نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے ایک جماعت کی ضرورت ہوتی  
ہے۔ لیکن اس فرد کا مثالی کردار اس قسم کی جماعت پیدا کرنے کے لیے بڑا ممد و معاون ہوتا ہے۔ یہ اس کے لیے  
(FIRST CRYSTAL) بن جاتا ہے!

اس قصے میں دوسری چیز ہمارے سامنے یہ آتی ہے کہ عالم اسباب میں اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے پروگرام کو  
اسباب و علل کی کرپوں سے ہی ظہور میں لاتا ہے۔ کنعان کے ایک ”چرواہے“ کو ان بلندیوں تک پہنچانے میں  
جہاں ”چاند اور ستارے“ اس کے سامنے جھکیں، اندھے کنوؤں، مصر کے بازاروں اور قید و بند کی مصیبتوں سے  
گزرنا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ بلندیاں ملتی ہی اس استحکامِ خودی کے نتیجے میں ہیں جن کا مظاہرہ ان نامساعد  
میں ہوتا ہے۔

— — — — —

سورۃ یوسفؑ، آیت (۱۲) تک پہلے آچکی ہے۔ آخری تین آیتوں میں کہا گیا تھا کہ ان واقعات کو حضورؐ پر  
بذریعہ وحی منکشف کیا گیا تھا، لہذا یہ یقینی ہیں۔ ان میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے باوجود اکثر  
لوگ اس پر ایمان نہیں لاتے۔ حالانکہ (اے رسول!) تم اس کے لیے ان سے اجر نہیں مانگتے۔ لیکن اس سے  
افسردہ خاطر ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس لیے کہ یہ قرآن اسی قوم کے لیے نہیں کہ اگر انہوں نے اسے نہ مانا تو یہ بیکار

رہ جائے گا۔ یہ قیامت تک نوع انسانی کے لیے ضابطہ ہدایت ہے۔ اگر یہ اسے قبول نہیں کرتے تو اور قومیں اسے اختیار کر لیں گی۔ نوع انسان کو آخر الامر آنا اسی کی طرف ہے۔

(جیسا کہ معلوم ہے) قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ یہ قانونِ مکافاتِ عمل کی نتیجہ خیزی کے سلسلہ میں اقوام سابقہ کی روش و نظامِ زندگی کے عواقب اور خارجی کائنات میں قوانینِ خداوندی کی کار فرمائی کو بطور دلائل اور ثبوت پیش کرتا ہے۔ داستانِ حضرت یوسفؑ کے خاتمہ پر کہا کہ اگر یہ لوگ اس قسم کے تاریخی شواہد پر غور و فکر نہیں کرتے تو اس میں تعجب اور تأسف کی کون سی بات ہے۔ ان کی حالت تو یہ ہے کہ :

﴿۱۲﴾ **وَكَأَيِّن مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا  
وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ ﴿۱۰۵﴾**

(قرآن کی تعلیم تو پھر بھی ایک نظری دعوت ہے جو حروف و الفاظ کی شکل میں ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ ان کی تو یہ حالت ہے کہ کائنات میں قوانینِ خداوندی کی کار فرمائی کی کتنی کتنی بڑی محسوس شہادات ہیں، جن سے یہ منہ پھیرے گزر جاتے ہیں اور غور و فکر سے کام نہیں لیتے۔)

دنیا میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو سرے سے خدا ہی کو نہیں مانتے، لیکن اکثریت ان کی ہے جو خدا کو مانتے تو ہیں لیکن اس کے ساتھ انسانوں کی اطاعت اور محکومیت بھی اختیار کیے رہتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کے متعلق کہا کہ :

﴿۱۲﴾ **وَعَالِيَوْمِئِذٍ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ ﴿۱۰۶﴾**

(ان میں کچھ تو ایسے ہیں کہ قوانینِ خداوندی سے یکسر انکار کرتے ہیں۔ اور اکثر ایسے ہیں کہ وہ خدا کے قانون کو مانتے تو ہیں لیکن اس کے ساتھ اور قوتوں کو بھی صاحبِ اقتدار و اختیار تسلیم کرتے ہیں اور اس طرح مومن کہلانے کے باوجود مشرک کے مشرک رہتے ہیں۔)

اس آیت کی تشریح 'مطالب الفرقان' جلد پنجم ص ۱۱۰ میں گزر چکی ہے۔ زیر نظر سورہ (یوسف) میں ایمانِ بائبہ کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ **إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ** — حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ **أَمْ سَرَّ** **أَلَّا تُعْبَدُوا إِلَّا إِيَّاهُ** ... (۱۲) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت، اختیار نہ کی جائے **وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا** (۱۱) اس میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے۔

انڈس میں 'مشرک' کے عنوان کو دیکھئے۔ واضح ہو جائے گا کہ زیر نظر آیت (۱۲) خود ہمارے متعلق ہے۔ یہ ہم ہی

ہیں جو خدا پر ایمان کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اور انسانوں کی محکومیت بھی اختیار کرتے ہیں۔ حاضر و موجود حکمرانوں کو چھوڑیے، مذہب کی دنیا میں ساری کی ساری اطاعت شخصیتوں (اسلاف) کی ہوتی ہے خواہ ان کا نام کچھ ہی رکھ لیا جائے۔ یاد رکھیے! دین کے معاملہ میں جہاں کتاب اللہ کو نہیں بلکہ کسی انسان کو اتھارٹی تسلیم کر لیا جائے تو یہ مشرک ہوگا۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو جتنا کوئی شخص زیادہ مذہب پرست ہوگا اتنا ہی زیادہ مشرک ہوگا۔ سیکولرزم کفر ہے لیکن اس قسم کی مذہبیت مشرک ہے۔ یہی آئیہ زیر نظر میں کہا گیا ہے۔

قوانین خداوندی سے انکار اور سرکشی، حق و باطل کی آمیزش (مشرک) کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے (۱۲) انڈکس میں اقوام سابقہ کا عنوان دیکھیے۔ اس مقام پر اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی جب فرمایا کہ:

﴿۱۲﴾ اَفَاٰمِنُوْا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ

السَّاعَةُ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۳﴾

کیا یہ لوگ اس سے بالکل مطمئن ہو چکے ہیں کہ خدا کے قانونِ مکانات کی رو سے آنے والی تباہیوں میں سے ان پر کوئی ایسی تباہی نہیں آئے گی جو ان پر ہر طرف سے چھا جائے! یاد دہ آنے والا انقلاب اس طرح اچانک آ جائے کہ انہیں اس کے آنے کا احساس تک نہ ہو۔

اگلی آیت میں دین کی اصل و اساس کو چند لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ قرآن اپنے ہر دعویٰ کو علم و بصیرت کی رو سے پیش کرتا اور دلیل و برہان کی رو سے منواتا ہے۔ وہ فریقِ مخالف سے بھی اس کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ اس ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا جو زبردستی لایا جائے۔ یعنی جن دعاوی کو علم و عقل کی رو سے تسلیم نہ کیا جائے وہ اسے ایمان ہی نہیں قرار دیتا۔ آپ انڈکس میں علم، عقل، بصیرت وغیرہ عنوانات دیکھیے۔ یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی۔ چونکہ دین کی اس بنیادی حقیقت کے متعلق سابقہ جلدوں میں بڑی تفصیل و تشریح کے ساتھ لکھا جا چکا ہے اس لیے اس مقام پر کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ یہاں قرآنی دعوت پر علم و عقل کی رو سے غور و فکر نہ کرنے والوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

﴿۱۳﴾ قُلْ هٰذِهِ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنْ

اتَّبَعَنِيْ ۗ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَاَنَا مِنَ الْمَشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾

ان سے کہو میری راہ تو بالکل (صاف اور سیدھی) ہے اور وہ یہ کہ میں تمہیں خدا کی طرف دلائل و براہین کی رُو سے، علی وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور جو میرے متبعین ہوں گے وہ بھی ایسا ہی کریں گے۔ خدا اس سے بہت بلند ہے کہ (اسے کائنات کے چلانے کے لیے اور قوتوں کی بھی ضرورت ہو۔) اس لیے میں ان میں سے نہیں ہوں جو قانونِ خداوندی کو بھی تسلیم کریں اور اس کے ساتھ اور قوتوں کو بھی اختیار و اقتدار کی مالک سمجھیں۔ (اور یوں، مومن کہلاتے ہوئے مشرک کے مشرک رہیں)۔

علم و بصیرت کی رُو سے دین کو پیش کرنا اور دلیل و برہان کی رُو سے اُسے ماننا۔ یہ ہے ارشادِ خداوندی۔ اور یہ ہے سنتِ رسول اللہ۔ اور اسی کو جماعتِ مومنین کا شیوہ اور طریق بتایا گیا۔ دین کی دعوت پیش کرنے میں جو شخص اس طریق کو اختیار نہیں کرتا وہ ارشادِ خداوندی سے سرکشی برتتا اور سنتِ رسول اللہ کی مخالفت کرتا ہے۔

دین کے اس بنیادی اصول کی روشنی میں آپ غور فرمائیے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ صدرِ اول میں اسلام، بزرگِ شمشیر پھیلا گیا تھا اور یہ کہ جو شخص اسلام چھوڑنا چاہے (مُرتد) اُسے نسل کہ دیا جائے گا۔ یہ کس طرح دین کی بنیادی حقیقت کے خلاف ہے۔ انڈیکس میں "مردودِ ازم" کا عنوان دیکھئے۔ نیز جنگ، قتال اور جہاد کے عنوانات اس کے بعد مخالفین کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ رسول انہی جیسا انسان کیوں ہے۔ فرمایا:

﴿۱۲﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رَجَالًا نُوحِيَ إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى ۖ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۱۹﴾

(اور یہ جو ان کا اعتراض ہے کہ ایک انسان کس طرح سے رسول ہو سکتا ہے، تو ان سے کہو کہ) مجھ سے پہلے بھی خدا نے کسی رسول کو نہیں بھیجا۔ بجز اس کے کہ وہ وہاں کی بستی کے رہنے والوں میں سے ایک آدمی تھا۔ (پہلے زچہ) کیا یہ لوگ (جو اس قسم کی کٹ مچتیاں کرتے ہیں) دنیا میں چلے پھرے نہیں جو دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنہوں نے ان سے پہلے (اس قسم کی روش اختیار کی تھی)؟ اگر یہ لوگ (آنکھیں کھول کر تاریخی شواہد کا

مطالعہ کرتے اور عقل و فکر سے کام لیتے، تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ (حق و باطل کی کشمکش میں) آخر الامر کامیابی اور تمکین انہی کو حاصل ہو جو تحریمی کارروائیوں سے بچتے ہوئے قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ (لہذا، ان سے کہو کہ حق و باطل کا فیصلہ اس سے نہیں ہوتا کہ رسول، دوسرے انسانوں جیسا انسان ہوتا ہے یا، تمہارے تصور کے مطابق، فوق البشر؛ اس کا فیصلہ اس سے ہوتا ہے کہ جو قانون وہ پیش کرتا ہے اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اور اس کی خلاف ورزی کے عواقب کیا؟ اس کی مشہادت تاریخی سرگزشتیں بھی ہم پہنچا سکتی ہیں)۔

آپ عنوان ”رسول“ کے تحت دیکھیں گے کہ یہ اعتراض ہر رسول کے خلاف کیا جاتا تھا اور اس کا جواب یہ دیا جاتا تھا کہ رسول فوق البشر نہیں ہوتے۔

اس آیت میں اور اس کے علاوہ دو مقامات پر اور (۱۱۳؛ ۱۱۲) میں رسولوں کو رجالات کہا گیا ہے۔ یعنی مرد۔ اگرچہ عربی زبان میں رجالات کا لفظ ان معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جن معنوں میں ہم ”لوگ“، یا ”اشخاص“ کے الفاظ بولتے ہیں (دیکھئے لغات القرآن)؛ لیکن یہ واقعہ ہے کہ تمام رسول مرد ہی تھے۔ اس سے وہ لوگ جنہوں نے اس پر اڈھا رکھا رکھا ہے کہ کسی نہ کسی طرح عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں کمتر ثابت کیا جائے، یہ دلیل بھی لاتے ہیں کہ کوئی عورت نبی نہیں تھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ عورت، مرد کے مقابلہ میں فروتر ہے۔

نبوت اگر اس شخص کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے وحی عطا ہوتی تھی، تو عورتوں کی طرف بھی وحی ہو جاتی۔ لیکن نبی کا فریضہ رسالت بھی تھا اور اس فریضہ کا مفہوم تھا دنیا جہان کی سرکش طاغوتی قوتوں کا مقابلہ کر کے انقلاب عظیم برپا کرنا۔ اگر عورت کے ذمے یہ فریضہ عاید کر دیا جاتا تو فطرت کی طرف سے جو مخصوص وظائف اس کے سپرد کیے گئے تھے، وہ انہیں سرانجام نہ دے سکتی۔ یہ تقسیم عمل ہے جس کے یہ معنی نہیں کہ عورتیں عورت ہونے کی جہت سے مردوں سے کم تر ہیں۔ انڈکس میں عنوان ”عورت“ دیکھئے۔

اس کے بعد قرآن اس کشمکش کا ذکر کرتا ہے جس سے رسول کو دوچار ہونا پڑتا تھا۔ رسالت کا اولین مرحلہ یہ تھا کہ رسول اپنی قوم کے لوگوں تک اپنی دعوت پہنچاتا اور انہیں اسے قبول کرنے پر آمادہ کرتا۔ اس میں اسے اکثر بہت کم کامیابی ہوتی، حتیٰ کہ ایک ایسا مقام آجاتا جہاں یہ نظر آتا کہ جن سعادت مند اشخاص نے اس کی دعوت کو قبول کرنا تھا وہ کرچکے ہیں۔ باقی مخالفین اُسے قبول نہیں کریں گے۔ ان کے اس دعوت کے قبول کھرنے کے راستے میں ایک بات

نے جیسے اہل تصوف کے ہاں عورتیں بھی ”ولی“ ہوتی ہیں (مثلاً رابعہ بریج)

یہ بھی حائل ہوتی کہ رسول جو ان سے کہتا کہ اگر انہوں نے اپنی غلط روش کو نہ چھوڑا تو اس کا نتیجہ تباہی ہوگا تو وہ اصرار کرتے کہ اس تباہی کو جلدی لاؤ۔ لیکن اسے خدا کے مقرر کردہ قانونِ مہلت کی رُو سے اپنے وقت پر آنا ہوتا تھا۔ اس پر وہ خیال کر لیتے کہ تباہی کی وعید محض دھمکی ہے، و حقیقت ایسا نہیں ہوگا (سابقہ جلدوں میں یہ حقیقت بار بار سامنے آچکی ہے) اس کے بعد فیصلہ کن مرحلہ آتا جس میں حق کے مخالفین کو شکست ہوتی (یا وہ تباہ ہو جاتے) اور جماعتِ مؤمنین کامران و کامیاب ہو جاتی (اس سلسلہ میں مطالبہ الفرقان جلد سوم ۲۹۵ء تا آخر دیکھئے جہاں ان مراحل کی تفصیل بیان کی گئی ہے) فرمایا کہ اس کشمکش میں ایسے مراحل آتے کہ:

﴿۱۲﴾ حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِّبُوا جَاءَهُمْ  
نَصْرًا مِّنْ فَتْحِيٍّ مِّنْ تَشَاءٍ وَلَا يَرِدُ بِالسِّنَاعِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ﴿۱۱۰﴾

لیکن یہ تاریخی شہادتیں یہ بھی بتائیں گی کہ حق و باطل کی اس کشمکش کا فیصلہ یونہی جھٹ سے نہیں ہو جاتا، اس کے لیے بڑا لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ چنانچہ اقوام سابقہ کے سلسلہ میں بعض اوقات یہ عرصہ اتنا لمبا ہو جاتا تھا کہ رسول دل برداشتہ ہو جاتے تھے کہ اب یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے اور لوگ اپنے دل میں سمجھ لیتے تھے کہ انہیں تباہی اور بربادی کے جس عذاب سے ڈرایا جاتا ہے، وہ خالی دھمکیاں ہیں۔ تو اُس وقت ہمارے رسولوں کی طرف تباہی نصرت آتی تھی سو ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق (رسول اور اس کی جماعت کو) تباہی سے محفوظ رکھتے تھے، اور مجرمین سے وہ عذاب ٹلا نہیں کرتا تھا۔

(سو جس طرح، اقوام سابقہ کے ساتھ ہوا، اسی طرح ان لوگوں کے ساتھ ہوگا)

اور آخر میں ان جملہ حقائق کو ایک آیت میں سمٹا کر رکھ دیا۔

﴿۱۲﴾ لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ  
وَلَكِن تَصَدِّقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى  
وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۱۱۱﴾

ہم اقوام سابقہ کے جو احوال و کوائف بیان کرتے ہیں، ان میں ان لوگوں کے لیے سامانِ عبرت و معظمت ہے جو عقل و فکر سے کام لیں۔ (اس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ قرآن کوئی من گھڑت کتاب نہیں۔ یہ ان تمام دعوائی کو سچ کر دکھائے گا،



جو اس سے پہلے، انبیاء سابقہ کی وساطت سے کیے گئے تھے۔ اس میں وہ تمام اصول و قوانین دے دیئے گئے ہیں جن کی نوع انسان کو صحیح زندگی بسر کرنے کے لیے ضرورت تھی۔ ان اصول و قوانین کو اس طرح نکھارا اور اُبھارا کہ بیان کیا گیا ہے کہ ان میں کسی قسم کا التباس نہیں رہا۔

یہ وہ ضابطہ ہے جو ہر اُس قوم کو، جو اس کی صداقت پر یقین رکھے، سفرِ حیات میں راہ نمائی کا کام دے گا اور اس کے لیے سامانِ نشوونما فراہم کرے گا۔

(یہ ہے تمام نوعِ انسان کے لیے خدا کی طرف سے آخری اور مکمل ضابطہ حیات)

اس از نکاز پر سورۃ یوسف اختتام پذیر ہوتی ہے۔



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

تیرہواں پارہ ————— تیرہویں سورۃ



## باب دوم سُورَةُ الرَّعْدِ

# لَسَبَّحُكَ رَبِّكَ الْعَظِيمُ

- قرآنِ کریم اور سائنسی حقائق۔
- نظامِ کائنات اور اجرامِ فلکی۔
- کائنات میں نظامِ ربوبیت سے
- حیاتِ آخرت پر استدلال۔
- قوموں کی زندگی میں موت و حیاتِ نو
- کے اصول۔
- قرآن، علومِ سائنس کا نصاب نہیں،
- انسانی رہنمائی کا ضابطہ ہے۔
- قوموں کے احوال میں تبدیلی، تغیرِ نفس
- کے بغیر ممکن نہیں۔
- مسئلہ خیر و شر۔
- بقا اسی کے لیے ہے جو نوعِ انسان کے لیے
- منفعت بخش ہے (قانون بقا للافضل)۔
- دنیا اور آخرت کی خوشگوار یوں کا تقابل۔
- اُمتِ واحدہ کی تشکیل کا عملی پروگرام۔
- نظامِ صلوة اور نظامِ انفاق کا قیام۔
- قرآن اپنے دعاوی کو دلائل و براہین کی رو سے
- پیش کرتا ہے جبکہ عجب پرستی کا تقاضا معجزہ طلبی
- ہوتا ہے۔ دین کو زبردستی منوانا مقصودِ
- ربّانی نہیں۔
- اطمینانِ قلب، خدا کے قانون کی مطابقت
- سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔
- جنت اور جہنم کی حقیقت بسطِ حقائق کا
- تمثیلی اندازِ بیان۔
- رسولوں کی بشریت۔
- خدا کا قانونِ محو و ثبات۔
- رسولوں کا فریضہ، خدا کے پیغام کو انسانوں تک
- پہنچا دینا ہے۔ نتائج اس کے قانونِ حساب
- کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔
- قرآن انسانی دُنیا میں جو انقلاب لانا چاہتا ہے
- اُسے روکا نہیں جاسکتا۔

## باب دوم

## سُورَةُ الرَّعْدِ

## تیرہویں سُورۃ

آپ مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں کو دیکھئے۔ قرآن کریم نے تسخیر کائنات کے متعلق بڑی کثرت، تفصیل اور تکرار سے بیان کیا ہے (انڈکس میں کائنات اور ملائکہ کے عنوانات بالخصوص دیکھئے) اس سے دو اہم مقصد پیش نظر تھے۔ ایک تو یہ کہ انسان نے اپنے عہد طفولیت میں مظاہر فطرت کو الوہیاتی مقام دے رکھا تھا۔ وہ انہیں دیوی دیوتا قرار دے کر ان کی پرستش کرتا تھا۔ عربوں کے ہاں بھی یہ عقاید بڑی شدت سے موجود تھے (دیکھئے ۱۹-۲۳)۔ قرآن نے انسان کے ان جہالت آمیز عقاید کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ فطرت کی ان قوتوں کو الوہیاتی اقتدار حاصل نہیں۔ یہ سب خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہیں، اس لیے خود خدا نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ معین قوانین کے مطابق یہ قوتیں مصروف عمل ہیں۔ ان کے سمجھنے کی صلاحیت انسان میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ جو قوم ان قوانین کا علم حاصل کرے گی وہ ان قوتوں کو مسخر کر لے گی۔ اس سے آدم مسجود ملائکہ بن جائے گا۔ دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم باب اول ص ۶۔ رعد (بادل کی گرج) بھی انہی ملائکہ میں شامل ہے جیسا کہ سابقہ حوالہ میں بتایا گیا ہے۔ ایک حدیث میں بھی کہا گیا ہے کہ رعد "ملک من الملائکہ" (ملائکہ میں سے ایک ملک) ہے۔ غالباً اس کی اس اہمیت کے پیش نظر اس سورۃ کا نام سُورَةُ الرَّعْدِ رکھا گیا ہے۔ رعد کا لفظ ایک تو اسی سورۃ کی آیت نمبر ۱۲ میں آیا ہے اور دوسرے سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۱۹، (۲۱) میں۔ یوں تو علوم سائنس کے متعلق مطالب الفرقان میں جتنے جتنے مختلف مقامات پر لکھا جا چکا ہے لیکن جلد ششم، سورۃ الاعراف کے آخری حصہ میں اس موضوع پر تفصیل سے آیا ہے۔ اسے ایک نظر پھر دیکھ لیجئے۔

ان تصریحات کے پیش نظر موجودہ سورۃ (الرعد) میں مظاہر و قوای فطرت کے متعلق جو کچھ آئے گا اس کے

متعلق کسی تفصیلی گفتگو کی ضرورت نہیں ہوگی۔ وہاں صرف حوالہ دے کر آگے بڑھ جایا جائے گا۔ اس سورت کی پہلی آیت ہے:

﴿۱۳﴾ الْمَرَاقِدُ تِلْكَ آيَةُ الْكِتَابِ وَالَّذِي أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ

الْحَقُّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۱﴾

خدا نے عظیم و حکیم و رحیم کا ارشاد ہے کہ یہ کتاب خداوندی (قرآن) کی آیات ہیں یعنی اُس صابٹر خداوندی کے قوانین جو تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے، تجھ پر بذریعہ وحی نازل کیا جاتا ہے اور جو کبیر سبھی برحقیت ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس کے باوجود اس کی صداقت پر ایمان نہیں لاتے۔

اس کے فوری بعد نظام کائنات کا ذکر آگیا:

﴿۱۴﴾ اللَّهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَىٰ

الْعَرْشِ وَسَحَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ

الْأُمُورَ يُقَدِّرُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ بَلِقَاءَ رَبِّكُمْ تُؤْتُونَ ﴿۲﴾

یہ اُس خدا کی طرف سے ہے جس نے اتنے بڑے بڑے اجرام فلکی کو، فضا کی بلندیوں میں معلق کر رکھا ہے اور جیسا کہ تم دیکھتے ہو، کوئی ستون انہیں تھامے ہوئے نہیں۔ (یہ صرف اس کا قانون کشش و جذب ہے جس کے سہارے یہ قائم ہیں) اس لیے کہ کائنات کا مرکزی کنٹرول خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح اس نے سورج اور چاند، سب کو اپنے قانون کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھا ہے۔ ان میں سے ہر ایک، ایک مدت معینہ کے لیے اپنے اپنے راستے پر چلا جا رہا ہے۔

جس خدا کا ہمہ گیر قانون خارجی کائنات میں یوں تدابیر الامور کرتا ہے، وہی خدا، اپنے اُس قانون کو جس کے مطابق

انسان کو زندگی بسر کرنی چاہیے، کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تمہیں اس حقیقت کا یقین ہو جائے کہ تمہیں بھی

اسی قانون کا سامنا کرنا ہے۔ تم اس سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے۔

رَفَعَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا میں ایک عظیم سائنٹیفک حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اتنے اتنے

بڑے عظیم الجثہ گروں کا فضا میں معلق اور مصروف گردش رہنا بڑا عجیب العقول واقعہ ہے۔ تمہاری نگاہ ان ستونوں کو تلاش

کر رہی ہوگی جن کے سہارے یہ کمرے قائم ہیں۔ کہا کہ وہ ستون تو ہیں لیکن غیر مرئی۔ تم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ یہ ستون کشش و

جذبِ باہمی ہے جس سے یہ کمرے معلق ہیں لیکن کشش و جذب غیر محسوس اور غیر مرئی قوت ہے۔ یہی الفاظ (۱۴) میں بھی

آئے ہیں۔

دوسرا قابل غور نکتہ یہ ہے کہ مَلَّحٌ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى۔ یہ تمام مظاہر فطرت ایک مدت معینہ کے لیے رواں دواں ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ یہ کائنات نہ ازلی ہے (کیونکہ مخلوق ہے) نہ ابدی۔ (۳۱)

يُدَبِّرُ الْأُمْرَ کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ سلسلہ کائنات مشین کی طرح (AUTOMATICALLY) خود بخود نہیں چلا جا رہا۔ اس کا خالق اس کے پیچھے ہے۔ اس کی تدابیر کے مطابق یہ سرگرم عمل ہے۔

اس کے بعد بنیادی نکتہ لفظ الفاظ میں واضح کر دیا کہ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاءِ رَبِّكُمْ تُوقِنُونَ۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآن کریم سائنس کی کتاب نہیں جس میں قوانین و مظاہر فطرت کی سرگرمیوں کا ذکر ہے اور بس۔ کہا کہ یہ ذکر ایک عظیم مقصد کی طرف لے جانے کے لیے ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ جس طرح نظام فطرت ایک ضابطہ قوانین کے مطابق نتیجہ خیز ہوتا ہے اسی طرح خود انسان کے اعمال بھی خدا کے قانون مکانات کے مطابق نتائج مرتب کرتے ہیں۔ قوانین فطرت کے تذکرہ سے مراد تمہاری توجہ قانون مکانات کی طرف منتقل کرانا ہے۔

نظام فطرت اور قانون مکانات عمل کے باہمی تعلق کے سلسلہ میں مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۹۲ پر گفتگو ہو چکی ہے۔ اس قانون کی ابتداء نظام ربوبیت سے ہوتی ہے جو ساری کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔

﴿۱۳﴾ وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْتَشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۳﴾ وَفِي الْأَرْضِ قِطْعٌ مِّنْجَبْرَاتٍ وَجَنَّتْ مِّنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخِيلٌ صِنَوَانٌ وَغَيْرُ صِنَوَانٍ يُسْقَىٰ بِمَاءٍ وَاحِدٍ وَنُفِضَ لِبَعْضِهَا عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ ط إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۴﴾

تم غور کر دو کہ اس کا قانون ربوبیت، کائنات میں کس طرح کار فرما ہے۔ اس نے (زمین کے گول ہونے کے باوجود) اس کی سطح کو اس طرح پھیلا دیا ہے کہ تم اس پر آسانی سے رہ سکو اور اس میں پہاڑ بنا دیئے اور ان کے پھاؤں

کا سلسلہ جاری کر دیا اور اس میں ہر اک پھل کے جوڑے، دو دو قسم کے، پیدا کر دیئے اور زمین کی گردش کا ایسا قاعدہ مقرر کر دیا کہ اس سے رات کی تاریکی، دن کی روشنی کو ڈھانپ لیتی ہے۔ ان تمام امور میں، ان لوگوں کے لیے، جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں، ہمارے قانون کی ہمہ گیری کی، کتنی بڑی نشانیاں ہیں۔

پھر اس پر بھی غور کرو کہ زمین کے مختلف قطعات، ایک دوسرے سے ملحق ہوتے ہیں (لیکن ان میں کسی میں انگوٹے کے بارغ ہیں، کسی میں کھیتیاں ہیں۔ کہیں کھجور کے درخت ہیں۔ ان میں سے بعض ایک ہی جڑ سے پھوٹ کر الگ الگ ہو جاتے ہیں اور بعض الگ الگ جڑوں سے اُگتے ہیں۔ یہ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں لیکن مختلف درختوں کے پھل، خوبیوں کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں (ایک میں ایک خوبی ہے تو دوسرے میں دوسری) اس طرح ایک کو دوسرے پر برتری حاصل ہوتی ہے۔

ان امور میں بھی ان لوگوں کے لیے، جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں، ہمارے نظام ربوبیت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

مختلف درخت ایک ہی زمین سے اُگتے ہیں۔ ان کا (SOIL) ایک جیسا ہوتا ہے۔ وہ سیراب بھی ایک ہی جیسے پانی سے کیے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے پھل مختلف ہوتے ہیں۔ ثمرات کا یہ فرق بیج کی وجہ سے ہوتا ہے جس قسم کا بیج، اُسی قسم کا پھل! اسی طرح انسانی زندگی کے ثمرات بھی ان اعمال کے مطابق ہوتے ہیں جو انسان سے سرزد ہوتے ہیں جس قسم کے کسی کے اعمال اُسی قسم کی اُس کی زندگی۔

(ضمناً، یہاں پر مَدَّ الْأَرْضِ کہا ہے۔ یعنی زمین کو گول ہونے کے باوجود اس طرح پھیلا دیا ہے کہ اس پر انسان بنتے ہیں اور ان کی نشوونما کے لیے فصلیں بھی اُگتی ہیں۔ دوسری جگہ کہا ہے اَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وہ تمہیں اپنے ساتھ لیے گھوم رہی ہے۔ یہی وہ گردش ہے جو (علاوہ دیگر امور) رات اور دن کے اختلاف کا موجب ہے۔ (يُغِيثِي الْكَلِيلَ النَّهَارَ) اس نام نظام میں بھی ایک عظیم مقصد کی نشانیاں (آیات) ہیں۔ لیکن یہ آیات انہی کو نظر آ سکتی ہیں جو عقل و فکر سے کام لیں۔ (لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ)۔ (لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ)

ان آیات میں سب سے بڑی آیت یہ ہے کہ ایک ایسی گھٹی سے جس میں زندگی کی کوئی رمت نظر نہیں آتی، لہلہاتے پودے کی نمود ہوتی ہے۔ جوشوونما پا کر مکمل درخت بن جاتا اور ثمر بار ہو جاتا ہے۔ اس سے انسان کی حیاتِ آخرت پر تیساس کیا جاسکتا ہے۔

﴿۱۳﴾ وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ؕ اِذَا كُنَّا تُرَابًا اِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؕ

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ الْأَعْلَىٰ فِي أَعْيُنِهِمْ  
وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٥﴾

خدا کے قانونِ تخلیق و نشوونما کی اس قدر گونا گوں نشانیوں کے باوجود، اسے مخاطب! اگر تو کوئی تعجب انگیز بات سُننا چاہے تو وہ، ان لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ "جب ہم گل سڑ کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا اس کے بعد ہم ایک نئے انداز سے پھر پیدا ہوں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ (جو سمجھتے ہیں کہ انسان کی زندگی بس اس طبعی جسم کی زندگی ہے اس سے آگے کچھ نہیں) خدا کے قانونِ تخلیق و ربوبیت سے انکار کرتے ہیں (اس لیے کہ "ربوبیت" کے معنی ہی کسی شے کو اس کی تکمیل کے آخری نقطہ تک پہنچانا ہے۔ اور انسان کی تکمیل کا آخری نقطہ اس کی موت نہیں) ایسا کہنے والے وہ لوگ ہیں جو دجہالت اور تقلید کی زنجیروں میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ان کی نگاہ دور تک جا ہی نہیں سکتی۔ وہ وسعتِ نظر اور کشادگیِ علم سے کام لے ہی نہیں سکتے۔ یہ لوگ زندگی کی وسعتوں سے انکار کر کے، کسی اور کا نقصان نہیں کرتے بلکہ اپنے مستقبل کی کھیتوں کو اس طرح جلا کر رکھ کا ڈھیر بنا لیتے ہیں کہ ان میں نشوونما کا امکان ہی نہیں رہتا۔

یہاں حیاتِ آخرت سے انکار کو خدا کے قانونِ ربوبیت سے انکار کے مترادف قرار دیا ہے۔ قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں زمینِ مرثیہ کو حیاتِ تازہ "عطا کرنا"، قانونِ ربوبیت کی کار فرمائی قرار دی گئی ہے۔ یہی قانونِ ربوبیت انسان کی حیاتِ نو کے سلسلہ میں کار فرما ہوتا ہے۔ قوموں کی زندگی میں موت و حیاتِ نو کا سلسلہ اس دنیا میں بھی جاری رہتا ہے اور اُغروی زندگی میں بھی۔ دنیاوی زندگی میں اس کشمکش کے متعلق فرمایا:

﴿١٤﴾ وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ

الْمَثَلُ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِلنَّاسِ عَلَى ظُلْمِهِمْ وَإِنَّ

رَبَّكَ لَشَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٥﴾

(ان کی اسی تنگ نظری کا نتیجہ ہے کہ یہ، بگاڑنے اس کے کہ اس کا انتظار کریں کہ تمہاری جدوجہد کے حسین و خوشگوار نتائج سامنے آجائیں، تم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ جس نباہی کے متعلق تم ان سے کہتے ہو وہ جلدی سے آجائے۔ انہیں

اس کا علم نہیں کہ ان سے پہلے قوموں کی تباہی کی ایسی سرگزشتیں گزر چکی ہیں جو دنیا میں کہاوتیں بن گئی ہیں۔

اس باب میں تیرے نشوونما میں دلے کا قانون یہ ہے کہ لوگوں کے ظلم اور زیادتی کے باوجود (عمل اور اس کے



نتیجہ میں مہلت کا وقفہ رکھا جائے تاکہ جو لوگ اس دوران میں غلط روش کو چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار کر لیں (آئیوولی تباہی سے اُن کی حفاظت ہو جائے) لیکن جو لوگ اس مہلت کے وقفہ سے فائدہ نہیں اٹھانے وہ تباہ و برباد ہو جاتے ہیں) حقیقت یہ ہے کہ خدا کا قانونِ مکانات اعمال کا پیچھا کرنے میں بڑا سخت گیر واقع ہوا ہے۔

قرآنی تعلیم کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ اُس نے عجوبہ پسندی اور کرشمہ بینی کے خوگر انسانی ذہن کو طلسماتی تخیلات سے نکال کر اس پر قانونِ اسباب و علل (CAUSE AND EFFECT) کی اہمیت اور ہمہ گیری مگرسم کی ہے۔ انسانی دنیا کا یہ عجیب العقول انقلاب ہے۔ آج انسانی تہذیب و تمدن کی جو ہوش رُبانڈرت کاریاں ہماری نگاہ کو خیرہ کرتی ہیں وہ سب اسی قرآنی انقلاب کا صدقہ ہیں۔ یہی وہ انقلاب تھا جسے دورِ جاہلیت کا عربی ذہن آسانی سے قبول نہیں کر رہا تھا۔ حضور نبی اکرمؐ انہیں قانون کی تعلیم دیتے تھے اور وہ معجزات طلب کرتے تھے۔

﴿۱۳﴾ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ إِنَّمَا

أَنْتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿۱۳﴾

یہ لوگ جو اس ضابطہ قوانین کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے، درحقیقت "قانون" کی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ اسی لیے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ رسول کوئی محسوس معجزہ کیوں نہیں دکھاتا؟ حالانکہ تیرا کام صرف یہ ہے کہ تو انہیں خدا کے اس قانون سے آگاہ کر دے کہ اگر تم غلط روش پر قائم رہے تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ پھر ایک بات اور بھی ہے۔ اگر تیری دعوت اسی قوم مخاطب تک محدود ہوتی تو معاملہ کچھ مختلف ہوتا۔ لیکن تجھے تو ہر دم موجودہ اور آنے والی قوم کے لیے راہ نما بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس لیے تیرا منصب یہی ہے کہ تو خدا کے عالمگیر، غیر متبدل قوانین پیش کرے جو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہوں اور جن پر غور و فکر سے ہر قوم راہنما حاصل کر سکے۔

"لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ" حضور کے آخری نبی ہونے کی ایک اور دلیل ہے۔ حضور کی پیش فرمودہ راہنمائی ہر قوم کیلئے ہے، جو مکمل بھی ہے اور محفوظ بھی۔ اس لیے کسی قوم کے لیے بھی کسی اور نبی کی ضرورت نہیں۔

آیت (۱۳) میں کہا گیا ہے کہ عمل اور اُس کے محسوس نتیجہ کے ظہور میں آنے میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ یعنی عمل کا بیج مختلف مراحل میں سے گزر کر ثمر بار ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت مختلف مثالوں سے کر دی۔ فرمایا۔

﴿۱۳﴾ اللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنثَىٰ وَمَا تَغِيصُ الْأَرْحَامُ وَمَا

## تَزَادُ ۛ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَ ۛ بِمِقْدَارٍ ۝۹ عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرِ الْمُتَعَالِ ۝۹

دیہ جو اوپر کہا گیا ہے کہ عمل اور اس کے نتیجے میں ایک وقفہ ہوتا ہے تو اس کی بین مثال ان کے سامنے ہے کہ کس طرح حمل قرار پانے سے بچہ پیدا ہونے تک کا عرصہ ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ علم خداوندی کے مطابق ہوتا ہے جو جانتا ہے کہ مادہ کے پیٹ میں کیا ہے اور رحم کے اندر اس میں کون کونسی چیزیں کم ہوتی رہتی ہیں اور کون کون سی بڑھتی ہیں۔ نیز کونسا بچہ تکمیل تک پہنچتا ہے اور کون سا ناقص رہ جاتا ہے۔ یہ سب ان اندازوں کے مطابق ہوتا ہے جو خدا نے مقرر کر رکھے ہیں۔

اُس خدا کے اندازوں کے مطابق جو جانتا ہے کہ کسی شے کی موجودہ حالت کیا ہے اور مستقبل میں وہ کن مراحل سے گزرنے والی ہے۔ (اس کے کون کون سے جوہر مشہور ہو چکے ہیں اور کون کون سے ہنوز پوشیدہ ہیں)۔ اس کا قانون بڑی قوتوں کا مالک اور بلند ترین مقام پر متمکن ہے۔ ایسے بلند ترین مقام پر کہ اس تک کسی کا ہاتھ ہی نہیں پہنچ سکتا۔ جو اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکے۔ وہ ہر ایک کی دسترس سے باہر ہے۔

آیت (۵۹) کے آخر میں کہا گیا ہے کہ ”عِنْدَ ۛ بِمِقْدَارٍ“ اس سے ایک اہم نکتہ کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ خدا کے علم غیب کے متعلق اندکس کی طرف مراجعت کیجئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن امور کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان کا علم خدا کو ہے، کیا اس سے مراد یہ ہے کہ ان کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں، یا انسان بھی ان کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد خیم (صفحات ۳۸-۳۹) پر بحث ہو چکی ہے۔ وہاں (اور غیب سے متعلق دیگر مقامات میں) یہ بتایا گیا ہے کہ جن امور کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قوانین مقرر کر دیئے ہیں ان کا علم انسان بھی حاصل کر سکتا ہے لیکن جو امور کسی طبعی قانون کے تابع نہیں ان کا علم انسان حاصل نہیں کر سکتا۔ آیت (۱۱) میں جو کہا تھا کہ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَ ۛ بِمِقْدَارٍ۔ تو اس سے مراد وہی امور ہیں جن کے لیے قوانین مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ کائنات کے غیب و شہود کے متعلق مطالب الفرقان۔ جلد دوم (صفحہ ۹) دیکھئے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، قرآن کریم میں قوانین فطرت اور مظاہر کائنات کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اُس سے مقصد یہ نہیں کہ قرآن علوم شمس کا کوئی نصاب ہے۔ وہ انسانی راہ نمائی کا ضابطہ ہے اس لیے ان امور سے مقصد ان قوانین کی تائید میں شہادات پیش کرنا ہے جن کا تعلق انسانی زندگی سے ہے۔ مندرجہ بالا آیات میں قوانین فطرت سے متعلق گفتگو کرنے کے بعد فرمایا:

﴿۱۳﴾ سَوَاءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ أَسْرَأَ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ

بِالْئِيلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ ﴿۱۰﴾

اس کے قانون کی نگاہ اس قدر باریک بین ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی بات کو چھپائے یا اسے ظاہر کر دے، یا کوئی شخص دن کی روشنی میں کھلے بندوں چلے یارات کی تاریکی میں (ادھر ادھر کچھ کرنا پھرے) اس کے نزدیک سب یکساں ہے۔

انسانی اعمال کو محفوظ رکھنے کے متعلق قرآن حکیم میں بے شمار مقامات پر تصریحات آئی ہیں (اندکس میں مکافات عمل کا عنوان دیکھئے) مندرجہ بالا آیات میں کہا کہ انسان کے ہر عمل کا خدا کو علم ہوتا ہے۔ اگلی آیت کے پہلے حصہ میں ان اعمال کے محفوظ رکھے جانے کا (گویا) عملی طریق بتایا گیا ہے۔

﴿۱۳﴾ لَهُ مَعْقِبَتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ

اس کے قانون مکافات کی کارسزائی کے لیے، ہر انسان کے آگے اور پیچھے ایسی قوتیں متعین ہیں جو اس کے ہر عمل کا پیچھا کر کے، اسے اس کے نتیجہ تک پہنچاتی ہے (۱۳) اور انسان کا ہر عمل محفوظ ہو جاتا ہے اور نتیجہ خیز ہو کر رہتا ہے۔

انسانی اعمال و حقیقت محسوس مظاہر ہوتے ہیں اُس کے خیالات، نفسیاتی میلانات و رجحانات، اس کی آرزوؤں، تمناؤں، اُس کے مقاصد اور اہداف کے مطالب الفرقان جلد ششم میں زیر آیت (۱۳) تفصیل سے لکھا گیا ہے کہ فرد ہو یا قوم اُن کی زندگی کا مدار اُن کی ذہنیت اور نفسیات پر ہوتا ہے۔ جب تک اُن میں تبدیلی نہ ہو، اُن کی زندگی میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ جن عوامل سے یہ تغیر واقع ہوتا ہے، قرآن انہیں ایمان کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ

اور پھر چونکہ قوم انفرادی کا مجموعہ ہوتی ہے اس لیے یہی قانون آگے بڑھ کر اقوام کو بھی محیط ہو جاتا ہے۔ اس قانون کا نتیجہ ہے کہ خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی حالت کو نہ بدلے یعنی اپنے اندر قلبی اور ذہنی تبدیلی پیدا نہ کرے۔

وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوءَ آفَلًا مَرَدَلَهُ ۖ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُونِهِ مِّنْ وَّالٍ ﴿۱۱﴾

دچنانچہ جس طرح یہ ایک عظیم اصول ہے کہ زندگی کی جو خوشگواریاں کسی قوم کو حاصل ہوں وہ اس سے نہیں چھپتیں جب تک وہ ان کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے (مشہور)۔ اسی طرح) یہ بھی ایک غیر متبدل قانون ہے کہ جب کسی قوم پر اس کے اعمال کے نتیجہ میں، تباہی آتی ہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا اور نہ ہی اس قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر وہ پھر قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کر لے تو وہ اس کی مدد کر سکتا ہے۔

نفسیاتی تغیرات سے جب کسی قوم پر تباہی آتی ہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ انسان کو مایوس نہیں ہونے دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ بجز اس کے کہ کوئی قوم نفسیاتی تغیر کی صلاحیتوں ہی کو معدوم کر چکی ہو، اس کے لیے تغیرِ احوال کا امکان ہے۔ مَا لَهُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ ذَلٍّ نِے نگاہِ کارُخ، دوبارہ زندگی حاصل کر سکنے کی اُمید کی طرف موڑ دیا اور اس کے لیے پھر مظاہرِ کائنات کی مثال سے اس بسیط حقیقت کو سمجھا دیا۔ فرمایا:

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنشِئُ السَّحَابَ  
الثِّقَالَ ۗ وَيَسْجِ الرِّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلٰئِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ ۗ وَ  
يُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ وَهُمْ يُجَادِلُونَ  
فِي اللّٰهِ ۗ وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ ۝۱۳

(تباہیوں کی ایسی یا اس انگیز حالت میں، قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کرنے کی امید افزا کیفیت کا اندازہ کرنے کے لیے تم پھر کائنات میں غور کرو کہ ایک ہی حادثہ میں کس طرح، بیم ورجاء، بے جُلبے ساتھ آتے ہیں، تم دیکھو کہ بجلی چمکتی ہے تو اس سے خوف و ہراس پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی پانی سے بھرے بٹوے بادل اُمنڈے چلے آتے ہیں جو تمہارے لیے نفع بخشہ ہوں گے پیغام بر ہوتے ہیں۔

ان بادلوں کی گرج بلکہ تمام کائناتی قوتیں، قانونِ خداوندی کی بیعت سے لرزہ براندازم، اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں سرگرم عمل رہتی ہیں تاکہ اُس کی ربوبیت اس طرح نکھر کر سامنے آجائے کہ ہر دیکھنے والے کی زبان پر بے ساختہ کلماتِ تحسین آجائیں (۱۲)۔ باقی رہیں بجلیوں کی تباہ کاریاں، تو وہ اُنس پر گرتی ہیں جو ان کی زد میں اپنا آشیانہ بنا کر خود تباہ ہونا چاہتا ہے اور یہ کچھ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ لوگ اس قدر زندہ شہادتوں کے باوجود قانونِ خداوندی کے بارے میں تجھ سے جھگڑا کرتے ہیں (اور نہیں

سمجھتے کہ خدا کا جو قانون، کائنات میں یہ کچھ کر رہا ہے وہ) انسانی دنیا میں بھی کس قدر سختی سے مواخذہ کرنا والا ہے۔ لیکن یہ امن و امان، یہ خوشحالیاں اور سیرابیاں بیٹھے بٹھائے اور محض زبانی یا اللہ یا اللہ کہہ دینے سے حاصل نہیں ہو جاتیں۔ اس کے لیے اُس خدا کے قوانین کا اتباع ضروری ہے جس کے قوانین کی خلاف ورزی سے تباہیاں آتی ہیں۔

﴿۱۳﴾ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ إِلَّا كَبَاسِطٍ كَفِيَّةٍ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاةً وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِمْ وَمَا دَعَاءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِي ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾

اس لیے جو قوم یہ چاہتی ہے کہ اس کی کوششیں ٹھوس تعمیری نتائج پیدا کریں، اُسے اُس کے قوانین کا اتباع کرنا چاہئے اس لیے کہ، ٹھوس، تعمیری نتائج پیدا کرنے والی ہر مانگ اُس کے قانون سے وابستہ ہے۔ جو لوگ یہ چاہیں کہ اس کے قانون کو چھوڑ کر کسی اور کے قانون کی رُو سے تعمیری نتائج پیدا کر لیں تو اُن کی یہ آرزو اور کوشش اسی طرح رابٹنگاں جائے گی جس طرح اُس شخص کی آرزو اور کوشش رابٹنگاں جاتی ہے جو دُور سے پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر سمجھے کہ پانی اس کے منہ تک خود بخود پہنچ جائے گا۔ حالانکہ اس طرح پانی اُس کے ہونٹوں تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ (یہ چیز قانونِ خداوندی کے خلاف ہے) لہذا اس کے قانون سے انکار کرنے والوں کی آرزو میں کبھی بار آور نہیں ہو سکتیں۔ (۱۴)

اس ضمن میں اندکس میں دعا اور جنت کے عنوانات بھی دیکھئے۔ اس کے بعد پھر مظاہرِ فطرت کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ فرمایا:

﴿۱۴﴾ وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظُلْمًا ﴿۱۵﴾ بِالْغُدُوِّ وَالْاَصَالِ ﴿۱۵﴾

یہ لوگ جو ہمارے قانون سے انکار کرتے ہیں، دیکھتے نہیں کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کوئی ہے طَوْعًا وَّ كَرْهًا "ہمارے قانون کے سامنے ہر تسلیم خم کیے ہوئے" (۱۴) اگر یہ لوگ کائنات کی بڑی بڑی چیزوں کو دیکھنا نہیں چاہتے تو کم از کم اپنے جسم پر ہی غور کریں جو خدا کے قانونِ طبع کے تابع ہے۔ وہ دیکھیں کہ ان کا سایہ کس طرح،

صبح سے دوپہر تک ایک سمت میں اور دوپہر سے شام تک دوسری سمت میں رہتا ہے۔ دیکھا انہیں اس پر اختیار ہے کہ وہ اس سایہ کی سمت کو بدل دیں؟ یہ لوگ یہاں تک تو مائیں گئے کہ اس کے بدلنے پر انہیں اختیار نہیں لیکن اسے تسلیم نہیں کریں گے کہ خدا کا قانون ان کے سایہ سے آگے بڑھ کر ان کی ذات پر اور انسانی معاشرہ پر بھی نافذ ہوتا ہے۔

اشیائے کائنات کی طوعاً و کرہاً سجدہ ریزی کے متعلق مطالب الفرقان جلد چہارم کے صفحہ ۱۶۶-۱۶۷ پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ اسے ایک نظر دوبارہ دیکھ لیا جائے۔ آیت زیر نظر میں البتہ ظلال (سایوں) کی جو مثال دی گئی ہے وہ بڑی عمیق حقیقت کی آئینہ دار ہے۔

کائنات کی ہر شے قوانین خداوندی کی اطاعت بہر حال کرتی ہے۔ اس سے خلاف ورزی کا کسی کو اختیار نہیں۔ انسان صاحب اختیار ہے لیکن جہاں تک اس کی طبعی زندگی کا تعلق ہے وہ بھی قوانین فطرت کی اطاعت پر مجبور ہے۔ (مثلاً) سانس پر اس کی زندگی کا دار و مدار ہے۔ اُسے اس کا تو اختیار ہے کہ سانس لے یا نہ لے۔ لیکن اُسے اس کا اختیار نہیں کہ وہ سانس بند کر لے اور پھر بھی زندہ رہے۔ یہاں وہ دیگر جانداروں کی طرح مجبور ہے۔ اس جبر و اختیار کی ایک بہن مثال اس کا سایہ ہے۔ ایک شخص کو اس کا تو اختیار ہے کہ وہ دائیں طرف جائے یا بائیں طرف۔ آگے کی طرف چلے یا پیچھے کی طرف۔ لیکن اُسے اس کا اختیار نہیں کہ وہ اپنے سایے کا رخ بھی اپنی مرضی کے مطابق متعین کر لے۔ اس کا رخ فطرت کا قانون مقرر کرتا ہے جس کے بدلنے پر اس کو کوئی اختیار نہیں۔

خدا کا یہی قانون اس کی انسانی زندگی میں بھی کار فرما ہے۔ اُسے اس کا تو اختیار حاصل ہے کہ وہ اقدار خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے یا ان کی خلاف ورزی کرے۔ لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ وہ زندگی تو اقدار و قوانین خداوندی کے خلاف بسر کرے اور وہ تباہیاں جو اس خلاف ورزی کا نتیجہ ہوں، انہیں آنے نہ دے۔ روک لے۔ بالفاظ دیگر لے اپنے اعمال پر تو اختیار ہے، اعمال کے نتائج بدلنے پر نہیں۔

اقدار خداوندی پر ایمان نہ رکھنے والوں (سیکولرازم کے پیروکاروں) کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ صرف کائناتی قوانین کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں، اپنی داخلی زندگی سے متعلق قوانین خداوندی کو تسلیم نہیں کرتے۔

﴿قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ قُلِ اللَّهُ ط قُلْ أَفَاتَخَذْتُمُ

لہ یہ جو جوگیوں، سنیاسیوں کے "جس دم" کے واقعات سامنے آتے ہیں یہاں ان سے بحث مقصود نہیں، انسان کی عام زندگی کی مثال پیش کی جانی مقصود ہے۔

مَنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءُ لَا يَمْلِكُونَ لِأَنفُسِهِمْ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا قُلْ هَلْ يَسْتَوِي  
الْأَعْمَى وَالْبَصِيرُ أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ  
شُرَكَاءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهُ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ  
شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

ان کی اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ اگر تم ان سے پوچھو کہ خارجی کائنات (زمین و آسمان) میں کس کا قانون کارفرما ہے، تو جس طرح تم کہتے ہو، یہ بھی کہہ دیں گے کہ وہاں اللہ ہی کا قانون نافذ العمل ہے (۲۳۔۲۹ ذ ۲۳۔۲۹) ان سے کہو کہ پھر تم اپنی داخلی دنیا میں (اس کے قانون کو چھوڑ کر) دوسری قوتوں کو کیوں کارساز بناتے ہو جن کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ وہ (دوسروں کے لیے تو ایک طرف) خود اپنی ذات کے لیے بھی نفع اور نقصان کی قدرت نہیں رکھتیں۔ تم جب خدا کو "اللَّهُ السَّمَاءِ" مانتے ہو تو اُسے "اللَّهُ الْأَرْضِ" کیوں نہیں مانتے۔ (۲۱ ذ ۲۱ ذ ۲۱ ذ ۲۱ ذ) ان دلائل کے بعد ان سے پوچھو کہ کیا اندھا اور دیکھنے والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ یا کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اندھیرا اور اجالا یکساں ہو جائے؟ (۳۵ ذ ۳۵ ذ ۳۵ ذ ۳۵ ذ)

یا ان سے پوچھو کہ انہوں نے جن ہستیوں کو خدا کی کارسازی میں شریک ٹھہرا رکھا ہے، کیا انہوں نے بھی خدا کی مخلوق کی طرح کوئی مخلوق پیدا کی ہے اور ان دونوں کی مخلوق ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہے جس سے یہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ خدا یکساں نہیں، اُس جیسے اور بھی ہیں۔

ان سے کہو کہ ان کا یہ خیال باطل ہے۔ ہر شے کا خالق صرف خدا ہے، وہ بے مثل اور یگانہ ہے اور تمام قوتوں کا

واحد مالک اور سب پر غالب۔

مفہوم میں جن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے ان پر غور کرنے سے حقائق اور بھی واضح ہو جائیں گے۔ یہ وجہ ہے جو قرآن ہر شخص کے اپنے اپنے تصور کے مطابق خدا کو ماننے کو ایمان باللہ تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وہ اس ایمان کو ایمان باللہ تسلیم کرتا ہے جو اُس خدا پر ہو جس کا تصور قرآن پیش کرتا ہے۔ اس کی تفصیلی بحث مطالب الفرقان جلد اول صفحہ ۱۰۰ پر نثر چکی ہے۔

————— ﴿۱۶﴾ —————

کائنات میں خیر کے ساتھ شر بھی ہے۔ یعنی تعمیری قوتوں کے ساتھ تخریبی قوتیں بھی۔ جن مسائل حیات کا صحیح مفہوم

سامنے نہ ہونے کی وجہ سے انسان غلط نگہی بلکہ گمراہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ان میں ایک اہم مسئلہ ”خیر و شر“ کا بھی ہے۔ اس سے جو الجھن پیدا ہوتی ہے اُسے فلسفہ کی زبان میں سینٹ تھامس کا معتمہ (ENIGMA) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ الجھاؤ یہ ہے کہ اگر شر (EVIL) خدا کا پیدا کردہ ہے اور اس کی مرضی سے کارفرما رہتا ہے تو خدا خیر مطلق نہیں۔ اگر وہ خدا کی مرضی کے علی الرغم سرگرم عمل رہتا ہے تو خدا قادر مطلق نہیں۔ یہ الجھن خیر و شر کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

کائنات میں سلسلہ ارتقا جاری و ساری ہے۔ نظریہ ارتقا کا ملخص یہ ہے کہ زندگی جس پیکر یا جس مرحلہ میں بھی ہے اُس کا ٹکراؤ مخالف قوت سے ہوتا ہے۔ اگر اس نوع میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت اور قوت ہے تو وہ مخالف قوت پر قابو پا کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ اگر ایسی قوت نہیں تو مخالف قوت سے مغلوب ہو کر معدوم ہو جاتی ہے اور اگر ایسا ہے کہ مخالف قوت سے اس کا ٹکراؤ نہیں ہوتا تو وہ جامد ہو جاتی ہے۔

مطالبہ الفرقان کی سابقہ جلدوں میں کشمکش حق و باطل، نظریہ ارتقا، ابلیس یا شیطان کے عنوانات کے تابع اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان مقالات کا مطالعہ اس سوال کو سمجھنے میں مدد و معاون ہوگا۔ بانگ درا میں ارتقا کے عنوان سے علامہ اقبالؒ کی جو نظم درج ہے اس میں اس ٹکراؤ کی وضاحت بڑے دلکش انداز میں کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

|                                      |                                   |
|--------------------------------------|-----------------------------------|
| سقیزہ کا رہا ہے ازل سے تا امروز      | چراغ مصطفویٰ سے شرارِ بولہبی      |
| حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز    | سرشت اُس کی ہے مشکل کشی، جفا طلبی |
| سکوتِ شام سے تا نغمہ سحر گاہی        | ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی!    |
| کشاکشِ زم و گرما، تپ و تراش و خراش   | زخاکِ تیرہ دروں تا بے شیشہِ حلبی  |
| مقامِ بست و شکست و فشار و سوز و کشید | میانِ قطرہ نیسان و آتشِ عنبی!     |
| اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام    | یہی ہے رازِ تبت تا بملتِ عربی     |

”مغان کہ داؤد انکور آب می سازند

ستارہ می شکنند آفتاب می سازند“

قرآن کریم میں شر یا تخریبی قوتوں کو ابلیس یا شیطان کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سابقہ جلدوں میں اس کی وضاحت بھی آچکی ہے۔ عبرانی زبان میں شیطان کے معنی (HINDERER) کے ہیں۔ یعنی رکاوٹ پیدا کرنے والا۔ اس



میں ٹکراؤ اور تصادم کا مفہوم واضح ہے۔ ابلیس بھی اقبالؒ کا خاص موضوع ہے۔ وہ زندگی کے فروغ اور ارتقاء کے لیے اس تصادم کو اس قدر ضروری سمجھتے ہیں کہ کہتے ہیں کہ

مزی اندر جہان کور ذوقے کہ یزداں وارد و شیطاں ندارد

یہ دراصل تصوف کے مسلک پر تنقید ہے جس میں "نفس" کے فنا کر دینے کو مقصد حیات قرار دیا جاتا ہے۔

دوسری طرف وہ مومن بھی اُسے قرار دیتے ہیں جس میں ابلیس کے ساتھ ٹکرائے اور اُسے مغلوب کرنے کی صلاحیت اور قوت ہو۔ اقبالؒ کو موجودہ مسلمانوں کے خلاف شکایت یہ ہے کہ ان میں شرکی تخریبی قوتوں (باطل) کے ساتھ ٹکرائے کی ہمت ہی نہیں۔ وہ اس حقیقت کو جاوید نامہ میں ایسے دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں کہ جوں جوں ننگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، انسان وجد میں آجاتا ہے۔ ابلیس بجنور رب العزت فریاد کرتا ہے کہ اگر تیری یہ مخلوق اس قدر دُور ہمت، بُرد اور کمزور تھی تب مجھے اس قدر بے پناہ قوت دینے کی ضرورت کیا تھی! اخروٹ توڑنے کے لیے (ROAD ROLLER) تو درکار نہیں ہوتا! وہ کہتا ہے کہ ان کی حالت یہ ہے کہ

صید خود صیاد را گوید بگبیر الاماں از بندہ خرمال پذیر!

اس کے بعد وہ کہتا ہے :۔

آینیاں تنگ از فتوحات آدم پیش تو بہر مکانات آدم

یہ ہے مصافحہ زندگی میں تصادم کی اہمیت۔ آپ اندکس میں جنت کا عنوان بھی دیکھئے۔ اس سے واضح ہو جائے گا کہ جنت کی راہ کس قدر صبر آزما، ہمت طلب، لہزہ انگیز، خارہ شکاف تصادمات سے سٹی پڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں قوتیں پیدا کیں اور انسان کو اس کی صلاحیت عطا کر دی کہ وہ ان قوتوں کو مسخر کرے اور اس کا اختیار بھی کہ وہ انہیں جس مقصد کے لیے چاہے استعمال کرے مگر وہ ان قوتوں کو (جن میں اس کی اپنی قوتیں بھی شامل ہیں) وحی خداوندی کی روشنی میں تعمیری مقاصد کے لیے صرف کرتا ہے تو یہ قوتیں بھی خیر بن جاتی ہیں اور انسان کا یہ عمل بھی عمل خیر۔ اس کے برعکس، اگر وہ انہیں تخریبی مقاصد کے لیے صرف کرتا ہے تو یہ قوتیں شر بن جاتی ہیں اور انسان کے یہ کام بھی شر۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا نے شر کو پیدا نہیں کیا۔ اس نے صرف قوتوں اور صلاحیتوں کو پیدا کیا ہے۔ یہ انسان ہے جو انہیں شر بنا دیتا ہے۔ خدا نے وحی کی راہ نمائی مرحمت فرمائی جو سرتما سر خیر کی طرف لے جاتی ہے، اس لیے مومن کی زبان سے کہلوایا کہ بیدک الغیور۔ (پہ)۔ "تو خیر ہی خیر عطا کرتا ہے" شر ہم پیدا کر لیتے ہیں۔ میں نے اس نکتہ پر اپنی "لغات القرآن" میں بھی بحث کی ہے۔ مناسب معلوم

ہوتا ہے کہ متعلقہ اثنا س یہاں درج کر دیا جائے۔

”سُورَةُ الرَّعْدِ“ میں مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (۱۳) سے محفوظ رہنے کی دعا سکھائی گئی ہے۔ یعنی جو کچھ پیدا کیا گیا ہے اُس کے شر سے حفاظت۔ اس سے ظاہر ہے کہ شر (EVIL) کوئی مستقل بالذات شے نہیں جسے الگ پیدا کیا گیا ہو (جیسا کہ مجوسیوں کے ہاں عقیدہ تھا)۔ کائنات کی کوئی شے نہ بجائے خویش شر ہے نہ خیر۔ ہر چیز میں شر کا پہلو بھی ہے اور خیر کا بھی۔ اس کے شر کے پہلو سے بچنا چاہیے اور خیر کا پہلو اختیار کرنا چاہیے۔ پانی اگر کشتی کے نیچے رہے تو خیر ہی خیر ہے لیکن اگر وہ کشتی کے اندر آجائے تو شر ہو جائے گا۔ کائنات کی ہر قوت کو وحی خداوندی کی روشنی میں صرف اور استعمال کرنا، خیر ہے اور اسے انسانیت کی تخریب کے لیے استعمال کرنا شر ہے۔

(لغات القرآن، جلد دوم، صفحہ ۹۴۰)

ان تفسیرات کی روشنی میں سورۃ الرعد کی آیت ۱۳ کی طرف آئیے۔

﴿۱۳﴾ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ  
زَبَدًا رَابِيًا وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حُلِيٍّ أَوْ مَتَاعٍ  
زَبَدٌ مِثْلَهُ ط كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ط فَأَمَّا الزَّبَدُ  
فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ط كَذَلِكَ  
يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ﴿۱۴﴾

دب رہی یہ بات کہ اگر کائنات میں سب کچھ اسی کا پیدا کردہ ہے تو پھر یہ کیا معاملہ ہے کہ یہاں صاف اور ستھرے پانی کے ساتھ خس و خاشاک بھی ہے اور خوشگوار یوں کے ساتھ ناخوشگوار باریاں بھی۔ خیر کے ساتھ شر بھی ہے اور حق کے ساتھ باطل بھی؟ ان سے کہو کہ یہ اس لیے ہے کہ یہاں حق و باطل کی کشمکش کا قانون کارفرما ہے۔ اور اس کشمکش سے کائنات اپنے ارتقائی منازل طے کرتی، آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسے مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ، وہ بادلوں سے ہمیشہ برساتا ہے تو ندی نالے، اپنے اپنے طرف کے مطابق بہہ نکلتے ہیں۔ پانی کے بہاؤ سے، زمین کا نیل کپیل جھاگ بن کر زمین کی سطح پر آجاتا ہے تو سیلاب کی روا سے بہا کر لے جاتی ہے (اور زمین صاف ستھری رہ جاتی ہے)۔ یا یوں سمجھو کہ جب کسی دھات کو آگ میں تپایا جاتا ہے تاکہ اس سے زیورات یا دیگر ضروریات کی چیزیں

بنائی جائیں تو اس کا کھوٹ، جھاگ بن کر اوپر آجاتا ہے (اور خالص دھات نیچے رہ جاتی ہے)۔  
اسی طرح کائنات میں خدا کے قانون کشمکش کے مطابق، تعمیری قوتیں، تخریبی قوتوں سے ٹکراتی رہتی ہیں تو تخریبی قوتیں  
جھاگ کی طرح رائیگاں چلی جاتی ہیں اور جو کچھ نوع انسان کے لیے نفع بخش ہوتا ہے وہ باقی رہ جاتا ہے۔ یہ ہے خدا کا

قانون محمود ثبات۔ (۱۳ ز ۱۸ ز ۲۰)

ان تصریحات کی روشنی میں جو پہلے پیش کی گئی ہیں، آیت کا مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ اس کو آیت ۱۳ میں قانون محمود  
ثبات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ویسے بھی یہ آیت مطالب الفرقان، جلد سوم، منہ پر کشمکش حق و باطل کے ضمن میں آچکی  
ہے۔ مزید وضاحت وہاں دیکھی جاسکتی ہے۔

لیکن آیت کے آخر میں جو بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے وہ دین کا ملخص، اسلام کا منتہی اور انسانی اعمال کے پرکھنے  
کی صادق ترین کسوٹی ہے۔ فرمایا کہ

بقا اس عمل کے لیے ہے جو نوع انسان کے لیے منفعت بخش ہے۔

جس قدر کوئی نظریہ، کوئی نظام، کوئی عمل نوع انسان کے لیے منفعت کا باعث ہے، اسی قدر اس میں باقی رہنے کی صلاحیت  
ہے۔ بقا اسی کے لیے ہے۔ یہ ایسی کسوٹی ہے جس سے پرکھ ہو جاتی ہے کہ انسان کے کون سے اعمال، اعمالِ صالحہ، حسنات،  
باعثِ ثواب یعنی نیک ہیں۔ وہی جو دوسرے انسانوں کے لیے نفع بخش ہیں۔ بقا سے مراد یہ ہے کہ وہ اس زندگی میں  
بھی موجب بقا ہیں اور اگلی زندگی میں بھی باقی رہنے والے۔ اس قدر مختصر الفاظ میں ایسا بلند اصول قرآن ہی پیش کر سکتا تھا۔  
پھر اس پر بھی غور فرمائیے کہ ”مَا يَنْفَعُ النَّاسَ“ کیہے۔ یعنی وہ کام جو کسی خاندان، خاص قبیلہ، خاص برادری،  
حتیٰ کہ کسی خاص قوم کے لیے نفع بخش نہیں بلکہ جو عالمگیر انسانیت کے لیے نفع بخش ہو۔

یہ ہے دین کا مقصود و مدعا۔ یہ ہے اسلام کا مطلوب و منتہی۔ یہ ہے اسلامی نظام کے قیام کی ضرورت اور یہ  
ہے اسلامی مملکت کی تشکیل کی وجہ جواز۔ یہ ہے امت مسلمہ کی بشت کی غرض و غایت۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ  
لِلنَّاسِ۔ (۲۳) تم وہ امت خیر بدست ہو جسے نوع انسان کی منفعت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ کیا انسانوں کا وضع کردہ  
کوئی نظام اس مقام بلند کو چھو بھی سکتا ہے؟ اور کیا کوئی اور نظام امن عالم کا ضامن ہو سکتا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ  
قرآن عظیم کے اس عالمگیر زیریں اصول کو ہر ایوان حکومت کے دروازے پر منقوش اور ہر محراب مسجد پر کندہ ہونا چاہیے۔  
مغربی سیاست دانوں نے قانون ارتقاء، ”بقا، للاصلاح“ بتایا تھا مگر قرآن نے وہ اصول ”بقا، للانفع“ بتایا۔ اصل اپنی  
ذات کے لیے ہے۔ انفع عالمگیر انسانیت کے لیے۔ ع

عقل خود ہیں دیگر عقل جہاں ہیں دیگر است

— ۱۳ —

حق و باطل کی کشمکش کا یہی اصول قوموں میں بھی کارنر ما ہے۔ اس تقسیم کے اعتبار سے اگر وہ دنیا میں دو ہی رہ جاتے ہیں۔ ایک وہ جو "مَا يَنْفَعُ النَّاسَ" کے مسلک پر کاربند ہو، دوسرا وہ جو اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرے۔

﴿۱۳﴾ لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا

لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ فَاى الْاَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهِ ط  
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوٓءُ الْحِسَابِ ۗ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَهَنَّمُ ط وَبِئْسَ الْبِهَادُ ﴿۱۴﴾

اس طرح خدا، مثالوں کے ذریعے بات واضح کر دیتا ہے، ان لوگوں کے لیے جو خدا کی دعوت پر نہایت حسن کارانہ انداز سے لبیک کہتے ہیں۔ تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ جس دعوت کو لے کر وہ اٹھے ہیں اس میں کس طرح تخریبی قوتوں سے تصادم ہوگا اور بالآخر کس طرح حق کی کامیابی ہوگی۔

باقی رہے وہ لوگ جو اس دعوت پر لبیک نہیں کہتے بلکہ اس کی مخالفت کرتے ہیں، تو ان سے کہہ دو کہ قانون خداوندی کی رو سے ان کی تباہی یقینی ہے۔ آج تو ان کے لیے موقع ہے کہ وہ اس دعوت کو تسلیم کر کے اس تباہی سے بچ جائیں۔ لیکن اگر انہوں نے ایسا نہ کیا اور ظہورِ نتائج کا وقت آگیا تو اس وقت اگر ایسا ہو کہ ان کے پاس تمام روئے زمین کی دولت ہو اور اس کے ساتھ اتنی ہی دولت اور جمع ہو جائے اور وہ چاہیں کہ اس تمام دولت کو دے کر اس تباہی سے بچ جائیں تو ایسا نہیں ہو سکے گا۔ اس وقت ان کے اعمال کا حساب، ان کے حق میں بہت بُرا ہوگا اور ان کا ٹھکانا تباہیوں کا جہنم ہوگا۔ اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

یہ دو گروہ کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

﴿۱۴﴾ اَمْ مَنْ يَعْلَمُ اَنَّمَا اُنزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ

اَعْمٰى ط اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُو الْاَلْبَابِ ﴿۱۵﴾

ذرا سوچو کہ ایک شخص وہ ہے جو اس پر یقین رکھتا ہے کہ جو کچھ تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے نازل ہوا ہے وہ حق

ہے اور دوسرا وہ ہے جو اس حقیقت کی طرف سے بالکل اندھا ہے۔ کیا یہ دونوں کبھی برابر ہو سکتے ہیں؟ لیکن ان مثالوں سے انہی لوگوں کے سامنے حقیقت آ سکتی ہے جو عقل و دانش سے کام لیں۔ لیکن وہ عقل نہیں جو ”سو خود بیند نہ بیند سو دیگر“۔ اقبالؒ، اس عقل کو جو انفرادی مفاد کے حصول کے لیے کوشاں اور اسے محفوظ رکھنے کے لیے ساعی ہو، ”عقل خود ہیں“ کہہ کر پکارتا ہے اور اس عقل کو جو مایفیع الناس کی علمبردار ہو، ”عقل جہاں ہیں“ اسی عقل کے حامل ہیں جن کی قرآن ان الفاظ میں خصوصیت بیان کرتا ہے۔

﴿۱۳﴾ الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَلَا يَنْقُضُونَ الْمِيثَاقَ ﴿۲۰﴾

دوہ عقل و دانش نہیں جو جذبات کے تابع چلتی اور انفرادی مفاد پرستیوں کی راہیں دکھاتی ہے۔ بلکہ ان لوگوں کی عقل و دانش جو اس عہد کو پورا کرتے ہیں جو انہوں نے اللہ سے باندھ رکھا ہے (۲۰) اور اپنے اقرار کو کبھی نہیں توڑتے۔

اس کے ساتھ:

﴿۱۳﴾ وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ

وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾

جو انسانیت کے ان ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑتے ہیں جن کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا تھا (۲۱) اس لیے کہ وہ ڈرنے

ہیں کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔

یہاں ان کی ایک اہم خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ انہیں ملاتے ہیں جنہیں ملانے کا خدا نے حکم دیا ہے۔ ”سورۃ البقرہ میں (اس کے برعکس) فاسقین اور مفسدین کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ انہیں توڑتے ہیں جنہیں جوڑنے کا حکم خدا نے دیا ہے (۲۱) نیز (۲۱)۔ اس کی وضاحت سورۃ البقرہ کی آیت (۲۳۱) اور سورۃ یونس کی آیت (۱۰۱) میں کر دی گئی۔ مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۲ پر دیکھیے۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ منشاء خداوندی تمام نوع انسان کو ایک عالمگیر برادری کی شکل میں منسوط کرنا ہے۔ ابتداء تمام انسان ایک امت، ایک برادری کی شکل میں رہتے تھے۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہو گئے تو یہ مختلف قبائل اور مختلف اقوام اور پھر ایک قوم کے اندر مختلف ذاتوں، برادریوں یا مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں کی شکل میں بٹ گئے۔ وحی خداوندی کا مقصود، نوع انسان کے ان تمام تفرقات کو مٹا کر پھر سے ایک عالمگیر برادری کی شکل میں امت واحدہ بنانا تھا۔ اس کی ابتداء اس قوم (جماعت مومنین) سے کی گئی جسے امت مسلمہ کہہ کر پکارا گیا۔ اس کا فریضہ تھا کہ وہ اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کر کے، عالم انسانیت کو اس دائرے کے اندر سمولے، یہی اسلام کا منتهی اور دین کی غایت تھی۔

لیکن اس اُمت نے کیا کیا؟ بجائے اس کے کہ نوعِ انسان کے اختلافات ختم کر کے انہیں ایک عالمگیر برادری کی شکل دیتی، خود ہی مختلف قوموں، فرقوں، برادریوں، پارٹیوں میں بٹ گئی اور جس جہنم میں غیر مسلم عذاب کی زندگی بسر کر رہے تھے، اس کو خود اپنے اوپر وارد کر لیا۔ آپ انڈکس میں فرقہ، تفرقہ جیسے عنوانات دیکھئے۔ قرآن نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ سو جو قوم خود شرک میں مبتلا ہو وہ وحدتِ انسانیت کی علمبردار کیسے بن سکتی ہے؟ یاد رکھیے، اسلام، انسانیت کے رشتوں کو جوڑنے کا نام ہے، توڑنے کا نہیں۔ بلا لحاظ رنگ، نسل، زبان، وطن، احرف ایمان کے اشتراک سے ایک عالمگیر انسانی برادری کی تشکیل۔ اس سے انسان اس عذاب سے نجات حاصل کر سکے گا جس میں وہ بُری طرح ماخوذ ہے۔ لیکن اقوامِ عالم اپنے گروہ بندانہ مفادات کو آسانی سے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں گی۔ اس کے لیے جبہٴ مسلسل کی ضرورت ہوگی جس کی راہ میں بڑے بڑے صبر آزمایا مراحل آئیں گے۔ اس لیے یہ مسافت بڑے ثبات و استقامت کی متقاضی ہوگی۔ موجودہ مسلمان اگر اس منشا، خداوندی کو پورا کرنا چاہیں گے تو انہیں سب سے پہلے اپنے ہاں کی مسزہبی فرقہ بندی کو ختم کر کے، خود اُمتِ واحدہ بننا ہوگا۔ پھر مسلمان ممالک اور اقوام کو جبل اللہ (قرآن) کے رشتے میں پرو کر اُمتِ مسلمہ میں وحدت پیدا کرنا ہوگی۔ اس کے بعد عالمگیر انسانیت کی وحدت کا مرحلہ آئے گا۔ اس کا عملی پروگرام۔ نظامِ صلوة اور نظامِ انفاق (نظامِ ربوبیت) کا قیام ہے۔ (انڈکس میں صلوة، انفاق، ربوبیت، رزق وغینہ کے عنوانات بھی دیکھیے۔)

﴿۱۳﴾ وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَ  
 أَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ  
 أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۱۳﴾

جو اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لیے، جو ان کے پروردگار نے ان کے لیے متعین کر رکھا ہے، نہایت ثباتِ استقامت سے سرگرم عمل رہتے ہیں اور نظامِ صلوة متشکل کرتے ہیں اور جو سامانِ نشوونما انہیں دیا جاتا ہے۔ خواہ ان کی معسر صلاحیتیں ہوں یا محسوس سامانِ زیست۔ اسے نوعِ انسان کی بہبود کے لیے، حسبِ ضرورت خفیہ یا اعلانیہ صرف کرتے ہیں اور یوں، معاشرہ کی ناہمواریوں کو، اپنے حسنِ عمل سے دور کرتے ہیں (۱۳) یہ وہ لوگ ہیں جن کا انجام نہایت خوشگوار ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس اُمت سے اس پروگرام کی ابتداء کرنے کو کہا جا رہا ہے اس میں تو خود صد ہا

خرابیاں ہیں۔ پہلے ان کا ازالہ ضروری ہے۔ اس کا طریقہ قرآن حکیم نے خود ہی بتا دیا ہے۔ **وَيَذُرُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ**۔ یعنی تخریبی کاموں کے نقصانات کا ازالہ اس طرح ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعمیری کام کیے جائیں۔ یہ ایک عظیم اصول ہے۔ اس کا مفہوم توبہ کے عنوان سے بھی سمجھ میں آسکتا ہے۔ لیکن اس سے بھی واضح تشریح سورۃ ہود کی آیت (۱۱۱) میں ملے گی جہاں کہا گیا ہے **كَرِهُوا الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ** (حسانات، سیئات کو بہا کر لے جاتی ہیں برائیوں کا ازالہ اچھائیوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ افراد ہی نہیں بلکہ معاشرہ کی اصلاح کے لیے بھی یہ اصول اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کا انجام نہایت خوشگوار ہے۔

جَنَّتْ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ  
وَذُرِّيَّتِهِمْ وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ ۗ سَلَامٌ  
عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۗ

یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے (اس گھر) دنیاوی زندگی کا انجام نہایت اچھا ہے۔ یعنی جتنی معاشرہ جس میں وہ داخل ہوں گے۔ وہ بھی اور ان کے ماں باپ۔ بیویاں اور اولاد بھی، بشرطیکہ ان کے اعمال صالح ہوں جن سے وہ اس زندگی کے اہل قرار پانچے ہوں اور ان پر چاروں طرف سے ملائکہ کا نزول ہوگا۔ (ابیم)

جو یہ خوشخبریاں لیتے آئیں گے کہ تمہارے لیے ہر طرح امن اور سلامتی ہے۔ اس لیے کہ تم نے نہایت استقامت اور استقلال سے مشکلات کا مقابلہ کیا، سو دیکھو کہ اس جدوجہد کے بعد تمہاری زندگی کا انجام کیسا خوشگوار ہوا۔

یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ بھتیوں کے رشتے دار (ماں باپ۔ بیوی بچے) محض ان کے رشتہ دار ہونے کی بنا پر جنت میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ ان کے اعمال صالح ہوں۔ قانون مکافات عمل کی رو سے کسی بڑے سے بڑے کے ساتھ بھی رشتہ داری کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ فیصلہ ہر ایک کے اپنے ذاتی اعمال کی رو سے ہوگا۔ **مَوَدَّةٌ فِي الْقُرْبَانِ** (۲۳) کے متعلق تفصیلی بحث مطالب الفرقان، جلد پنجم (صفحہ ۶۷-۶۸) میں گزر چکی ہے۔ سورۃ ہود میں دیکھئے۔ ہر رسول نے اپنی دعوت کا آغاز اس اعلان کے ساتھ کیا تھا کہ **لَا يَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا** (اللہ وغیرہ) میں تم سے کوئی اجر رسالت نہیں مانگتا۔ اس کا اعادہ متعدد دیگر مقامات میں بھی کیا گیا ہے۔ دعوت و تبلیغ بلا اجر کی اہمیت اس قدر ہے کہ کہا گیا **إِسْتَبْرَأْ مَنْ لَا يَسْئَلُكُمْ أَجْرًا وَهُمْ مُهْتَدُونَ** (۲۳) جو لوگ راہِ راست پر ہوں اور تم سے کوئی اجر بھی نہ مانگتے ہو، ان کا اتباع کرو۔

مؤمنین پر نزول ملائکہ کے متعلق دیکھیے (۱۱۱)۔  
اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر ہے جو ان کے خلاف زندگی بسر کرتے ہیں۔

﴿۱۳﴾ وَالَّذِينَ يَبْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ  
مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَٰئِكَ لَهُمُ  
الْعَنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ﴿۱۵﴾

ان کے برعکس، وہ لوگ ہیں جو اس عہد کو جو انہوں نے خدا کے ساتھ نہایت مضبوطی سے باندھا تھا، توڑ ڈالتے ہیں اور  
انسانیت کے جن رشتوں کو جوڑنے کا اُس نے حکم دیا تھا انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں (سپلا ذریعہ) اور اس طرح  
دنیا میں فساد اور ناہمواریاں برپا کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم رہ جاتے ہیں اور ان کا انجام  
بڑا ہی خراب ہوتا ہے۔

چونکہ یہ ضد ہے پہلی روش زندگی کی، اس لیے اس کی الگ وضاحت کی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم کا یہ عام انداز ہے  
کہ وہ اصداؤ کے تقابل سے اپنے مقصد کی وضاحت کرتا ہے اور یہ انداز بڑا بلیغ بھی ہوتا ہے اور موثر بھی۔ بقول غالب۔  
لطافت بے کثافت جلوہ پیرا ہو نہیں سکتی!

اوپر کہا گیا ہے کہ جو لوگ مشیت کے پروگرام کے خلاف زندگی بسر کرتے ہیں، ان کا انجام تباہ کن ہوتا ہے۔ اس  
پر عام طور پر ڈھنوں میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ عام مشاہدہ یہ ہے کہ یہ لوگ بڑے متمول اور خوشحال ہوتے ہیں اور عیش و  
عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔

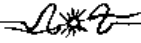
﴿۱۳﴾ اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ وَفَرِحُوا بِالْحَيَاةِ  
الدُّنْيَا وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾

یاد رکھو! دنیا میں سامانِ معیشت خدا کے قانون کے مطابق ملتا ہے۔ جو افراد ا لینا چاہے اور (اس کے لیے کوشش  
کرسے تو اسے) افراد ا بل جائے گا۔ جو ناپائلا لینا چاہے اُسے ناپائلا ملے گا۔ یہ سب خدا کے قانونِ طبعی کے مطابق  
ہوتا ہے۔ جو شخص اس قانون کے مطابق، کھیتی میں زیادہ محنت کرتا ہے اس کی فصل اچھی ہوتی ہے (۱۸-۲۱)۔ یہ  
جو ہم نے کہا ہے کہ جو لوگ انسانیت کے رشتوں کو منقطع کر دیتے ہیں، ان کا انجام خراب ہوتا ہے، تو یہ وہ لوگ



ہیں جو سمجھتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی ہے۔ اس کے بعد کچھ نہیں۔ لہذا وہ اسی دنیا کے مفاد کو نصب العین قرار دے لیتے ہیں اور اس میں مگن رہتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ اگر انسان کا مستقبل دُخروی زندگی، تاریک رہے تو اس زندگی کی خوشحالی کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ (۲۰۰-۲۰۱)

دنیا اور آخرت کی خوشگوار یوں کا تقابل قرآن حکیم کا اہم موضوع ہے اور ہم نے مختلف مقامات پر اس کی تشریح کی ہے۔ مثلاً مطالب الفرقان، جلد سوم (۲۵۴) اور وہاں دیئے گئے دیگر حوالے۔ علاوہ ازیں سورۃ بنی اسرائیل کی آیت (۱۸-۲۱) میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ ان مقامات میں اس اصول کو سامنے لایا گیا ہے کہ جہاں تک طبعی زندگی کے مفادات کا تعلق ہے، جو شخص بھی طبعی قوانین کا ثبات کے مطابق کوشش کرے گا اُسے اس کا ثمر مل جائے گا۔ اس میں مؤمن اور کافر کی کوئی تمیز نہیں۔ یہ تمیز اس مقام پر سامنے آتی ہے جہاں ان ثمرات اور مفادات کے استعمال کا سوال درپیش ہوتا ہے۔ اگر ان کا استعمال اقدار و اصول خداوندی کے مطابق ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ اس دنیا میں عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود اور اُخروی زندگی کی خوشگواریاں ہوتا ہے۔ اگر ان کا استعمال ان کے خلاف ہوتا ہے تو یہ دنیا بھی جہنم بن جاتی ہے۔ اور اُخروی زندگی کا جہنم تو بہر حال موجود ہی ہے۔



قرآن حکیم اپنے دعائی کو دلائل و براہین کی رُو سے پیش کرتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ ان پر علم و بصیرت کی روشنی میں غور کیا جائے اور ان کی صداقت کو اسی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ لیکن انسانیت کے بچپن کا ذہن (اور انسانوں کی معتد بہ اکثریت) ہنوز عہد طفولیت ہی میں زندگی بسر کر رہی ہے، عجائبات اور فوق الفطرت طلسمات کا خوگر ہے۔ اس لیے وہ حضرات انبیا، کرام کے دعائی کے جواب میں ان سے معجزات کا مطالبہ کرتا چلا آیا ہے۔ عہد نبی اکرمؐ میں بھی یہی ماجرا پیش آیا۔ مخاطبین نے معجزات کا مطالبہ کیا اور سان و حی نے اس سے انکار کرتے ہوئے بتایا کہ اس انکار اور استزاد کی وجہ کیا ہے۔ آپ اندکس میں ”معجزات“ کا عنوان دیکھیے۔ متعدد مقامات آپ کے سامنے آجائیں گے۔ اس سورۃ میں چند صفحات پہلے، آیت (۱۳/۲۲) کے تحت بھی یہ بحث آچکی ہے۔ یہاں پھر اس اعتراض کو سامنے لایا گیا ہے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ

قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنَابِ ۗ (۲۰)

دوب پھر اسی اعتراض کی طرف آؤ جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے (۱۳/۱۳) یعنی یہ لوگ جو اس ضابطہ خداوندی کی صداقت پر ایمان نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس رسول کو اس کے نشوونما دینے والے کی طرف سے کوئی (محموس) نشان (معجزہ) کیوں نہ ملا؟

ان سے کہہ دو کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ غلط اور صحیح راستہ پر چلنا انسان کے اختیار دار اسے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ لہذا جو شخص غلط راستے پر چلنا چاہے گا، قانون خداوندی اُسے غلط راستے پر چلنے دے گا۔ اُسے اُس راستے سے موڑ کر زبردستی صحیح راستے کی طرف نہیں لائے گا۔ اور جو شخص صحیح راستے کی طرف رجوع کرے گا اُسے خدا کا قانون صحیح راستے پر چلنے دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کی طرف دعوت علی وجہ البصیۃ پیش کی جاتی ہے تاکہ ہر شخص اپنے دل کے پورے اطمینان سے اسے تسلیم کرے۔ اس پر کسی قسم کی زبردستی نہ ہو۔ نہ جہانی (کراہ نہ ذہنی)۔

اس موضوع پر سابقہ جلدوں میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ انڈکس میں تقدیر کا عنوان دیکھیے۔ وہیں سے ”مَنْ يَشَاءُ“ کا مفہوم بھی واضح ہو جائے گا۔ زیر نظر آیت کا مطلب مفہوم سے واضح ہے۔ تقدیر کے عقیدہ سے انسان کو ایک جھوٹا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ جب یہ عقیدہ راسخ ہو کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ خدا جو کچھ کرتا ہے اس میں ہماری بہتری ہوتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ یہ چیز ہماری سمجھ میں نہ آئے۔ ہمیں بہر حال راضی برضا رہنا چاہیے۔ ان عقاید کی رُو سے انسان کو جھوٹا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے لیکن قرآن اس قسم کے فریبِ نفس کو زائل کر کے بتاتا ہے کہ حقیقی اطمینان کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ

اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ﴿۲۸﴾

یہی وہ خدا کا قانون ہے جس سے ذہنی اور قلبی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اس قسم کے اطمینان کے بغیر ایمان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایمان انہی کلمے جو اس طرح، بطیب خاطر، قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے بعد، حقیقت کو تسلیم کریں۔

پھر سن لو کہ صحیح اطمینان قلب خدا کے اس قانون کی رُو سے حاصل ہو سکتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے یعنی انسان کے اختیار دار اسے پر کسی قسم کا دباؤ نہ ہو اور وہ بطیب خاطر، اعترافِ حقیقت کرے

”ذکر“ کا مفہوم سابقہ جلدوں میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ ملخص اس کا یہ ہے کہ پیش آمدہ معاملہ کے فیصلہ کے لیے قرآن کریم کے احکام و قوانین کو سامنے رکھنا اور ان کے مطابق عمل کرنا ذکر اللہ ہے۔ ذکر کے اس مفہوم کا عام کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ تصوف نے اسے ایسے غلط معانی پہنارکھے ہیں جو اسلام کی اصل و بنیاد کے خلاف ہیں۔ جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کی تائید خود قرآن کریم کی اگلی آیت سے ہو جاتی ہے۔ فرمایا:

﴿۱۳﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحَسَنُ مَا بِهِم

جو لوگ اس طرح ایمان لائیں اور اُس کے بعد خدا کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق ایسے کام کریں جن سے، ان کی ذات کی صلاحیتیں بیدار ہوں اور انسانیت کے بگڑے ہوئے کام سنور جائیں، ان کے لیے ہر قسم کی خوشگواریاں ہیں اور نہایت حسین و متوازن مقامِ زیست ہے۔ (۱۳)

طوبیٰ کا مادہ (ط۔ ی۔ ب) ہے۔ اس کے معنی ہیں بہت زیادہ پسندیدگی۔ دائمی خوشحالی اور خوش نجاتی زندگی دنیا اور آخرت کی بکثرت خوشگواریاں۔ ہمارے شاعروں نے اسے جو معنی پہنائے ہیں وہ شاعرانہ مضمون آفرینی سے زیادہ کچھ نہیں۔ طیب کی طرح طوبیٰ بھی ایسا جامع لفظ ہے جس میں دنیا اور آخرت کی تمام خوشگواریاں سمٹ کر آگئی ہیں۔ جن کے لیے خدا طوبیٰ لہم کہہ دے انہیں اور کیا چاہیے۔

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر  
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد

اس کے بعد کہا کہ جو کچھ اس قرآن میں کہا جا رہا ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس سے پہلے بھی رسول آتے رہے۔ اور خدا کی وحی لوگوں تک پہنچاتے رہے اور ان لوگوں نے بھی اسی طرح پیغاماتِ خداوندی کی مخالفت کی جس طرح ”اے رسول! تیری قوم اس کی مخالفت کر رہی ہے۔“

﴿۱۳﴾ كَذَلِكَ أَرْسَلْنَا فِي أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا أُمَمٌ لِّتَتْلُوا

عَلَيْهِمُ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَنِ ط قُلْ هُوَ

رَبِّي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ ﴿۱۳﴾

اے رسول! ہم نے تجھے اس قوم کی طرف اسی طرح رسول بنا کر بھیجا ہے جس طرح ان سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف

رسول بھیجے تھے بمقصد یہ ہے کہ جو کچھ ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں تو ان کے سامنے پیش کر دے۔ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ یہ خدائے رحمن کو نہیں مانتے۔ تم، ان سے کہہ دو کہ وہ میرا نشوونما دینے والا ہے اور اس کے سوا کائنات میں کسی کا اختیار و اقتدار نہیں۔ میرا سارا بھروسہ اسی کے قوانین کی حکمیت اور نتیجہ خیزی پر ہے اور اسی لیے میں، ہر معاملہ میں، اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

پھر عنانِ توجہ معجزات کے موضوع کی طرف موڑ دی۔ فرمایا:

﴿۱۳﴾ وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كَلِمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ طَبَلٌ لِّلَّهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا أَفَلَمْ يَأْتِئْسَ الَّذِينَ آمَنُوا أَن لَّوِيئَاءُ اللَّهِ لَهْدَى النَّاسَ جَمِيعًا وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُم بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّن دَارِهِمْ حَتَّىٰ يَأْتِيَ وَعْدُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴿۳۱﴾

(ان لوگوں کی طرف سے جو محسوس معجزات کا مطالبہ ہوتا ہے (۱۲) تو اس سے خود تمہاری جماعت کے بعض افراد کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر ان کا مطالبہ پورا کر دیا جائے تو یہ سب ایمان لے آئیں اور یہ بہت اچھا ہو۔ ان سے کہہ دو کہ) اگر کوئی ایسا قرآن بھی ہوتا جس سے پہاڑ چلنے لگ جاتے اور زمین کی دور دراز مسافتیں آنکھ چھپکنے میں طے ہو جاتیں، حتیٰ کہ اس سے مردے بھی بولنے لگ جاتے (تو یہ لوگ پھر بھی ایمان نہ لاتے۔ ۶/۷۵، ۶/۱۱۲، ۱۵/۱۳، ۱۴/۹۰-۹۳) یہی وجہ ہے کہ خدانے تمام امور کو اپنے (قوانین کے) تابع رکھا ہے اور اس باب میں قانون یہ ہے کہ جو ہدایت حاصل کرنا چاہے وہ عقل و فکر سے کام لے (۱۲)۔

کیا اب بھی تمہاری جماعت کے لوگ (مؤمنین) اس بات کو نہیں سمجھتے کہ اگر لوگوں کو زبردستی مؤمن بنانا مقصود ہوتا تو خدا کے لیے یہ کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ وہ لوگوں کو پیدا ہی اس طرح کرتا، کہ سب صحیح راستے پر چلتے۔ لیکن اس نے عذاب ایسا نہیں کیا۔ اس نے اس بات کو انسان کے اختیار و ارادہ پر چھوڑا ہے۔ لہذا، جو لوگ اس دعوت سے انکار کر رہے ہیں وہ کسریٰ کی راہ اختیار کیے رہیں گے (اور اس کی مخالفت میں میدان جنگ تک میں اتر آئیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ) ان پر ان کی کرتوتوں کی وجہ سے آفتیں آتی رہیں گی اور یہ

سلسلہ یہاں تک بڑھے گا کہ جنگ کی مصیبت خود ان کے گھر دمکے کے قریب نازل ہو جائے گی۔ (یہ سلسلہ جو یہی جاری رہے گا) تاکہ کیش مکش فیصلہ کن مرحلہ تک پہنچ جائے گی (اور انہیں آخری شکست ہو جائے گی)۔ ایسا ہو کر رہے گا کیونکہ خدا کا قانون اپنی نتیجہ خیزی میں اٹل ہے۔ اس کے وعدے پورے ہو کر رہتے ہیں۔

یہ سوال کہ اگر دین کو زبردستی منوانا مقصود خداوندی ہوتا تو وہ انسان کو پیدا ہی اس طرح کرتا کہ سب انسان پیدائشی طور پر اسی دین پر ہوتے، متعدد مقامات میں آچکے ہے۔ مطالب الفرقان جلد اول صفحہ ۳۰۹-۳۱۲، اور جلد پنجم ص ۲۳ بالخصوص دیکھیے۔

أَفَلَمْ يَأْتِسَّ فِي يَأْتِسَّ كَامَادَه (ی۔ ژ۔ س) ہے جس کے عمومی معنی یا اس اور نا امید کی ہیں لیکن لغت میں اس کے معنی أَفَلَمْ يَعْلَمَ بھی دیئے گئے ہیں۔ یعنی کیا انہوں نے اس بات کو جان نہیں لیا؟ "زیر نظر آیت میں یہی معنی موزوں اور مفہوم کے مطابق ہیں۔ دیکھیے لغات القرآن۔ مادہ (ی۔ ژ۔ س) ص ۱۷۸۔ اس کشمکش کا آخری مرحلہ کیا ہو گا؟ فرمایا۔

﴿۳۲﴾ وَلَقَدْ اسْتَهْزَيْ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمَلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا

ثُمَّ اخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۳۲﴾

دیہ سب کچھ آہستہ آہستہ ہو گا۔ اور اس دوران میں، یہ لوگ تمہاری باتوں کا مذاق اڑاتے رہیں گے۔ لیکن تم اس سے دل برداشتہ نہ ہونا، اس قسم کا استہزاء تم سے پہلے رسولوں کے ساتھ بھی ہوتا رہا ہے۔ ان لوگوں کو بھی ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق مہلت کا وقفہ ملتا رہا۔ لیکن جب وہ اس پر بھی اپنی غلط روش سے باز نہ آئے تو ان کی گرفت ہوئی۔ (اُس وقت انہیں معلوم ہوا کہ) اُن کے اعمال کے نتائج کس طرح ان کا پیچھا کر رہے تھے اور ہماری عقوبت کیسی سخت ہوتی ہے۔

خدا کے رسولوں اور اس کی آیات سے استہزاء بھی متعدد مقامات میں آیا ہے۔ داندکس دیکھیے یہ دنیایت کی آخری حد ہوتی ہے۔



قرآن کی بنیادی تعلیم "اللہ واحد" ہے۔ یعنی تمام قوتوں کا مالک ایک خدا۔ ذہن خداوندی اپنے عہدِ طفولیت میں اسے بھی تسلیم نہیں کرتا تھا۔ بلکہ یوں کہیے کہ یہ عظیم تصور اس کے ذہن میں سما نہیں سکتا تھا۔ اس لیے اس نے مختلف

توتوں کے لیے مختلف الہ (خدا) وضع کر رکھے تھے۔ اسے شرک کہا جاتا ہے۔ قرآن نے کس کس انداز سے اور کیسے کیسے پیرایہ میں اس کی تردید کی ہے، اس کے لیے انڈکس میں شرک کا عنوان دیکھئے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے۔

﴿۱۳﴾ اَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۗ وَجَعَلُوا لِلَّهِ  
شُرَكَاءَ ۗ قُلْ سَمُّوهُمْ ۗ اَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ اَمْ  
بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ۗ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرَهُمْ وَصَدُّوا  
عَنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَنْ يُضِلِلِ اللهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴿۲۳﴾

(ان سے کہو کہ ذرا اس پر غور کر دو کہ) جس خدا کے قانونِ مکافات کی سہہ گیری اور خبررسی کا یہ عالم ہے کہ وہ ہر فرد کے اعمال پر اس طرح نگاہ رکھتا ہے، کیا وہ (اپنی مدد کے لیے ان کا محتاج ہو سکتا ہے) جنہیں یہ لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں؟ ان سے کہو کہ خدا کے علم کی دستوں کے متعلق تو تمہیں بتا دیا گیا ہے۔ اب تم جن ہستیوں کو اہل کاشریک قرار دیتے ہو ذرا ان کے علم کی تفصیلات بھی بیان کرو تا کہ پتہ چلے کہ روئے زمین پر کون سی بات ایسی ہے جو خدا کے احاطہ علم سے باہر رہ گئی ہے اور اس کی خبر تم ان شرکاء کے ذریعے خدا کو دینا چاہتے ہو۔ ان شرکاء کے ذریعے جو کچھ بھی نہیں جانتے۔

یا کیا یہ بات ہے کہ تم نے ان امور کی گہرائیوں میں اتر کر کبھی غور نہیں کیا۔ محض سطحی طور پر (جو سنتے آئے وہی دہرا دیا)۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس، ان کے دعویٰ کی صداقت کی دلیل کوئی نہیں۔ یہ محض جذبات سے کام لیتے ہیں جن کی وجہ سے انہیں اپنی تدا میر بڑی خوش آئند دکھائی دیتی ہیں اور اسی سے یہ صحیح راستے کی طرف آنے سے رُک گئے ہیں۔

خدا کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہ لیں اور اپنے جذبات کی رُو میں بے جا ہیں، وہ کبھی صحیح راستے

کی طرف نہیں آسکتے۔ سو جو لوگ اس طرح غلط راستہ اختیار کر لیں، انہیں کون صحیح راستہ دکھا سکتا ہے۔

اس میں شرک کے ایک گوشے کا ذکر نمایاں طور پر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ لوگ اس لیے معبود تراشتے ہیں تاکہ وہ ان کی بات خدا تک پہنچا دیں (۲۳) ہم (مسلمان) جب اس قسم کی آیات پڑھتے ہیں تو ہماری نگاہیں مشرکین کے عقاید، ان کے دیوی دیوتاؤں، ان کی عبادت گاہوں کی طرف اٹھتی ہیں۔ ہم کبھی اپنے گھر کی طرف جھانک کر نہیں دیکھتے۔ ہم

کس طرح ”حضرت صاحبان“ کی بارگاہوں میں حاضر ہو کر گڑگڑا گڑا کر عرض کرتے ہیں کہ یا حضرت! ہمارے لیے خدا سے دعا کیجئے۔ عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نہ ہمارے احوال سے واقف ہے نہ ہماری بات براہ راست سنتا ہے۔ یہ بزرگ خدا کے مقرب ہیں۔ یہ ہماری بات خدا تک پہنچا سکتے ہیں۔ کیا یہ وہی شرک نہیں جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے؟ چونکہ ہم اس موضوع پر شرک اور دعا کے عنوانات کے تحت بہت کچھ لکھ چکے ہیں (۱) اور میری کتاب۔ تصوف کی حقیقت۔ اس موضوع پر مستقل تصنیف ہے، اس لیے یہاں مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔ ان لوگوں کا انجام کیسا ہوگا؟ فرمایا:

﴿۱۳﴾ لَهْمُ عَذَابٍ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلِعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَقُّ  
وَمَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۲۶﴾

ان کی غلط روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان پر اس دنیا کی زندگی میں بھی تباہی آئے گی اور آخرت کی تباہی اس سے بھی زیادہ جگر پاش ہوگی۔ انہیں خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔

قرآن کریم اس حقیقت کو بار بار دہراتا ہے کہ غلط روش زندگی کا تباہ کن عذاب اسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے (اور اس طرح صحیح طرز زندگی کی خوشگواریاں بھی) بالفاظِ دیگر جنت اور جہنم کا آغاز یہیں سے ہو جاتا ہے اور مسلسل آخری زندگی تک چلتا ہے۔ انڈکس میں جنت اور جہنم کے عنوانات دیکھئے۔ اس اجمال کی تفصیل آپ کے سامنے آجائے گی۔ زیرِ نظر آیت میں دنیا اور آخرت دونوں کے عذاب کا ذکر آگیا ہے۔ یہ تو تھا جہنم۔ اس کے برعکس جنت:

﴿۱۳﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وَعَدَ الْمُتَّقُونَ ط تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ  
أُكْلُهَا دَائِمٌ وَظِلُّهَا ط تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَوْا ط وَعُقْبَى الْكَافِرِينَ النَّارُ ﴿۲۵﴾

ان کے برعکس، صحیح راستے پر چلنے والوں کے لیے جنت کی زندگی ہوگی، اس جنت کی مثال یوں سمجھو کہ، ایک باغ ہے جس میں پانی کی ندیاں جاری ہیں۔ اس کی وجہ سے وہ ہمیشہ سرسبز و شاداب رہتا ہے۔ اس کے پھل وقتی نہیں دائمی ہیں اور اس کی آتشیں پائدار (۱۳) و (۲۶)۔ اس قسم کا مآل زندگی ہوگا ان لوگوں کا جو غلط روش سے بچ کر قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کریں۔ ان کے برعکس، جو لوگ ان قوانین سے انکار کریں گے ان کا انجام تباہی اور بربادی ہوگا۔

بسیط حقائق (ABSTRACT REALITIES) کو تمثیلی انداز ہی سے بیان کیا جاسکتا ہے۔ اُخروی زندگی کی ہر حقیقت ماوراء الطبیعات ہے اس لیے قرآن کریم نے اسے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ ان حقائق کو مادی اور محسوس نہیں سمجھنا چاہیے۔ تمثیلات سے ان کا ایک تصور ذہن میں آسکتا ہے۔ وہ درحقیقت ہیں کیا، اسے ہم اپنے تصور کی موجودہ سطح پر نہیں سمجھ سکتے۔

جیسا کہ متعدد مقامات پر بیان کیا جا چکا ہے، قرآن کریم قوموں کی اس دنیا کی زندگی کو بھی جنت اور جہنم سے تعبیر کرتا ہے۔ ان کا بیان بھی درحقیقت تمثیلی اور تشبیہی ہی ہے۔ (مثلاً) وہ دودھ کی نہریں اور شہد کی ندیاں کہتا ہے تو اس سے مراد سچ سچ کی ندیاں اور نہریں نہیں ہوتیں بلکہ اس کا مطلب بکثرت اور باافراط ہوتا ہے۔ ہم بھی اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ وہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں، سو جنت اور جہنم اُخروی زندگی کے ہوں یا اس دنیا کے، ان کے بیانات کو تمثیلی سمجھنا چاہیے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ تمثیلات و تشبیہات وہی ہو سکتی تھیں جو زمانہ نزول قرآن کی مخاطب قوم (عربوں) کی سمجھ میں آجائیں۔ وہ ایران اور روم کی تہذیب و تمدن اور وہاں کی معاشرتی آسائشوں اور آرائشوں کو (IDEAL) سمجھتے تھے۔ اس لیے قرآن میں مثالیں بھی بیشتر انہی کے معاشرہ کی دی گئی ہیں۔ اس موضوع پر اس سے پیشتر تفصیل سے لکھا جا چکا ہے اس لیے یہاں ان اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ (دیکھئے مطالب الفرقان، جلد اول ص ۱۴۵؛ ص ۱۹۵؛ ص ۲۲۳۔ وہاں زیر نظر آیت بھی آگئی ہے۔)

جنت کی زندگی قرآن کریم کے اتباع سے ملتی ہے۔ سورۃ یونس کی آیت ۲۵ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جماعت مومنین سے کہا ہے کہ وہ ایسی نعمت بے بہا کے ملنے پر جشن مسرت منائیں۔ یہاں اسی کا اعادہ کیا گیا جو فرمایا کہ:

﴿۱۳۶﴾ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا الْكِتَابَ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمِنَ الْأَحْزَابِ مَنْ يُنْكِرُ بَعْضَهُ قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا أُشْرِكَ بِهِ إِلَيْهِ أَدْعُوا وَإِلَيْهِ مَأْبِدٌ ﴿۳۶﴾

جن لوگوں کو ہم نے اس قسم کا صابظہ ہدایت دیا ہے (جن پر عمل پیرا ہونے کے نتائج ایسے خوشگوار ہیں) وہ ہر اس بات پر جو تیری طرف نازل کی جاتی ہے، جشن مسرت مناتے ہیں۔ باقی رہیں دوسری جماعتیں، سوان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن پر بعض احکام بہت ناگوار گزرتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ تمہیں خوش لگے یا ناگوار گزرے، مجھے تو صرف اسی کا حکم دیا گیا ہے کہ میں صرف اللہ کی اطاعت اور حکومت اختیار کروں اور اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کروں



اسی مسلک کی طرف میں تمہیں دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف خود بھی رجوع کرتا ہوں۔ یہاں جو کہا گیا کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس کتاب کے بعض حصے پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض حصے سے انکار کرتے ہیں یا وہ احکام انہیں ناگوار گزرتے ہیں تو اس کی تفصیل سورۃ بقرہ آیت (۱۱۰) میں گزر چکی ہے۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ اس روش کا نتیجہ دنیا میں ذلت اور خواری کی زندگی اور آخرت میں شدید عذاب ہوگا۔ اسلام یہ ہے کہ زندگی کے ہر گوشے میں قوانین خداوندی کی مکمل اطاعت کی جائے اور اس میں کسی اور افتخاری کو شریک نہ کیا جائے۔ قرآن اسی مقصد کیلئے نازل کیا گیا ہے۔

﴿ ۱۳ ﴾ **وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۚ وَلَئِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ**  
**بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ لَا مَالَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾**

اور اسی مقصد کے لیے ہم نے اس ضابطہ قوانین کو نہایت واضح طور پر نازل کیا ہے۔ اسے مخاطب! اگر تو اس علم و حقیقت کے پالینے کے بعد بھی، ان راہ گم کردہ لوگوں کے خیالات کا اتباع کرے تو یہ سمجھ لے کہ قانون خداوندی کے مقابلہ میں نہ تو تیرا کوئی دوست اور کارساز ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کی گرفت سے نچھ کوئی بچا سکتا ہے۔

اس کے بعد مخاطبین کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا کہ یہ رسول، عام انسانوں جیسا انسان کیوں ہے؟ فرمایا کہ یہ بات اس رسول کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ تمہارے (اہل کتاب) کے ہاں بھی تو رسول آتے رہے ہیں۔ وہ بھی عام انسانوں جیسے انسان ہی ہوتے تھے (دیکھیے۔ انڈکس میں عنوان رسول خدا کے ہاں فیصلے قانون کی رُو سے ہونے ہیں۔ رسولوں کی بشریت یا فوق البشریت کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

﴿ ۱۲ ﴾ **وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمُ آيَاتٍ ۙ**  
**ذُرِّيَّةً ۙ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ لِكُلِّ أَجَلٍ**

**كِتَابٍ ﴿۳۸﴾**

(باقی رہا ان کا یہ اعتراض کہ انہی جیسا ایک انسان کس طرح رسول بنا دیا گیا تو ان سے کہہ دو کہ) ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سے رسول بھیجے تھے (وہ بھی تمہاری طرح انسان ہی تھے اور) ان کے بیوی بچے بھی تھے۔

اس کے بعد ان کے اس تقاضا کی طرف آؤ کہ جس نبی کا تم بار بار ذکر کرتے ہو، وہ آتی کیوں نہیں۔ تو ان سے کہہ دو کہ) یہ بات کسی رسول کے اختیار میں نہیں ہوتی کہ وہ اس قسم کی کھلی نشانی کو جب جی چلے اپنی مرضی کے

مطابن لے آئے۔ یہ چیزیں اللہ کے قانون کے مطابق، اپنے وقت پر ظہور میں آتی ہیں۔ اس کا قانون یہ ہے کہ ہر عمل اور اس کے نتیجے کے ظہور میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ اس وقفہ کو میعاد یا اجل کہتے ہیں۔ یہ اجل ایک قانون کے مطابق ہوتی ہے۔

یعنی اس بات کے لیے قانون مقرر ہے کہ ایک عمل اپنے نتیجہ خیز ہونے میں کتنا وقت لینا ہے۔ اس طرح توہل کی بھی اجل ہے (۱۳۹)۔

اس میں اسم نکرہ لِكَلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ہے۔ اس کی تشریح مطالب الفرقان جلد پنجم (ص ۱۸۹) میں آچکی ہے۔ نیز جلد چہارم ص ۲۵۳۔ اس سلسلہ میں عنوان۔ قوم یا اقوام بھی دیکھیے، جہاں قوموں کے عروج و زوال اور استبدال و استخلا سے متعلق قوانین کا ذکر آیا ہے۔ اس کو "قانونِ محوشبات" بھی کہا جاتا ہے۔

﴿۱۳۹﴾ يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ ۖ وَعِنْدَآ اَمُّ الْكِتَابِ ﴿۳۹﴾

جو قوم، نظریہ زندگی، یا نظام حیات اس قابل نہیں ہوتا کہ باقی رہے، وہ خدا کے قانون کے مطابق مٹا دیا جاتا ہے اور جو اپنے آپ کو، قانونِ خداوندی کے مطابق، حکم اور استوار ثابت کر دیتا ہے اسے باقی رکھا جاتا ہے (۱۳۹ ذہبی)۔ یہ سب کچھ ان اصولی قوانین کے مطابق ہوتا ہے، جو تخلیق کائنات کے ساتھ، اللہ نے مقرر کر رکھے ہیں اور جن کے مطابق اس کا نظم و نسق چل رہا ہے۔

قانونِ محوشبات ایک عظیم حقیقت ہے۔ سلسلہ ارتقا۔ اس قانون کے مطابق جاری و ساری رہا ہے (اور ہے)۔ جس نوع میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہ رہی، وہ مٹ گئی۔ جس میں اس کی صلاحیت تھی، وہ باقی رہی۔ قوموں کی موت حیات کا فیصلہ بھی اسی قانون کی رو سے ہوتا ہے۔

سورۃ شوریٰ کی آیت (۲۲۴) میں کہا گیا ہے کہ باطل محو ہو جاتا ہے اور حق کو ثبات حاصل ہوتا ہے اور یہ سب کچھ خدا کے قوانین (بِکَلِمَاتِهِ) کے مطابق ہوتا ہے۔ آپ دیکھیے، ہر مقام پر اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ سب کچھ توہل کے مطابق ہوتا ہے۔ یونہی اتفاقیہ یا دھاندلی سے نہیں ہوتا۔

یہ کہ یہ قانون غیر متبدل ہے اور کسی کی خاطر اس میں رعایت نہیں ہوتی۔ اس کی وضاحت خود حضور نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کی رو سے کر دی جہاں کہا:

﴿۱۳۹﴾ وَاِنْ لَّمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَّوَفِّيَنَّكَ فَاِنَّمَا

## عَلَيْكَ الْبَلْغُ وَعَلَيْكَ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾

جن باتوں کا اُن سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ تو بہر حال ہو کر رہیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض باتیں تیرے سامنے وقوع پذیر ہو جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تو اس سے پہلے ہی وفات پا جائے (لہذا، اس کا خیال نہیں کرنا چاہئے) کہ یہ نتائج کب برآمد ہوتے ہیں، تیرا کام یہ ہے کہ تو اس ضابطہ ہدایت کو لوگوں تک پہنچائے جائے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ دیکھیں کہ ہمارے قانون کے مطابق نتائج کب ظہور میں آتے ہیں۔

یہ مضمون سورۃ یونس کی آیت (۱۰۴) میں بھی آچکا ہے۔ تفصیل وہاں ملاحظہ فرمائیے۔

قانون کی طرف توجہ دلانے کے ساتھ ہی رسول اللہ پر یہ واضح کر دیا کہ اس انقلاب کا آغاز ہو چکا ہے۔

﴿۱۳﴾  
﴿۴۱﴾ اَوْلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا

وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لِمُعْتَبِرٍ لِّحُكْمِهِ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۴۱﴾

(یہ جو ہر وقت تقاضا کرتے رہتے ہیں کہ وہ نظام ربوبیت کب قائم ہوگا جس میں ان کی انفرادی مفاد پرستیاں ختم ہو جائیں گی تو کیا انہیں یہ نظر نہیں آتا کہ ہم کس طرح زمین (دوسائل پیداوار) کو بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھ سے چھین کر ان کے مقبوضات کو کم کرتے چلے جاتے ہیں (۱۰۴) اسی طرح ایک دن ایسا آجائے گا جب ان کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں رہے گا۔ سب کچھ نوع انسان کے لیے عام ہو جائے گا (۱۰۴) یہ خدا کا فیصلہ ہے۔ اور جو فیصلہ خدا کرتا ہے، دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں جو ان فیصلوں کو ٹال سکے۔ وہ محاسبہ کرنے میں بڑا تیز ہے۔

مطالب الفرقان، جلد اول (ص ۲۹۶) پر بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کے معاشی نظام کی رُو سے زمین پر کسی کی انفرادی ملکیت نہیں رہ سکتی۔ یہ ملکیت کی تحویل میں رہے گی تاکہ وہ اس سے عام افراد معاشرہ کی پرورش کا انتظام کر سکے۔ اس انقلاب کے آغاز کے متعلق جلد اول ص ۳ میں بھی ذکر آچکا ہے۔ جب یہ انقلاب اپنی تکمیل تک پہنچ جائے گا تو تمام ذرائع رزق ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے عام ہو جائیں گے۔ ان پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں رہے گی۔ زیر نظر آیت میں اَرْض کے معنی "زمین" لیے گئے ہیں اور قرآن کے معاشی نظام کی رُو سے یہ معانی بھی درست ہیں۔ لیکن آیت (۱۰۴) میں انہی الفاظ کے بعد کہا ہے۔ اَفْهَمُّ الْغُلَبُونَ۔ کیا ان کا غلبہ باقی رہ جائے گا؟ یہاں اس غلبہ کا ذکر ہے جو زمینداری اور جاگیرداری کی رُو سے حاصل ہوتا ہے اس لیے ان آیات میں غلبہ کا مفہوم بھی درست ہے۔ زمین کی ملکیت کا کم اور ختم ہونا اور غلبہ کا باقی نہ رہنا لازم و ملزوم ہیں۔ قرآنی انقلاب میں، نہ کوئی کسی کا محتاج ہوگا نہ

مکرم۔ اقبال کے الفاظ میں سے

کس دریں جا سائل و محروم نیست  
عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اس انقلاب کو کوئی روک نہیں سکتا۔

﴿۱۳﴾ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا ۖ يَعْلَمُ مَا  
تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۖ وَسَيَعْلَمُ الْكُفْرَ لِمَنْ عَقَّبَى الْدَارَ ﴿۱۴﴾

ان سے پہلے بھی (معاذ پرست گروہوں نے) بڑی بڑی تدبیریں کر دکھیں (کہ خدا کے فیصلے نافذ نہ ہونے پائیں لیکن کسی کی کچھ پیش نہ گئی) ان کی تدبیریں خدا کے قوانین کے مطابق ہی نتیجہ پیدا کرتی رہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص جو کچھ بھی کرے، خدا کو اس کا علم اچھی طرح ہوتا ہے۔ لہذا قوانین خداوندی سے انکار کرنیوالوں

کو جلد معلوم ہو جائے گا کہ آخر لامر باری کس کے ہاتھ میں رہتی ہے اور کس کا انجام کیا ہونا ہے؛

باقی دنیا کو چھوڑیے۔ اس کے خلاف سب سے بڑی سازشیں تو خود ہم (مسلمانوں) نے کیں جو نظام ملوکیت کو لے آئے۔ اس کے ساتھ نظام پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری خود بخود آگئے۔ آج بھی دنیا نظام سرمایہ داری سے تنگ آ کر ایسے نظام کی تلاش میں ہے جس میں نہ کوئی شخص روٹی کے لیے کسی کا دست نگر ہو، نہ لہذا کسی کا محکوم اور ذلیل۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت آج بھی نظام سرمایہ داری کو اسلام کا تقاضا قرار دے رہی ہے مگر قرآنی نظام کی مخالفت کرنیوالے دیکھ لیں گے کہ انجام کار کامیابی کے حاصل ہوتی ہے؟

قرآن سے انکار کرنے کے معنی رسول کی رسالت سے انکار کرنا ہوتا ہے۔

﴿۱۳﴾ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۖ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا  
أَبْنِي وَبَيْنِكُمْ ۖ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ﴿۱۴﴾

یہ لوگ جو قانون خداوندی سے انکار کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ تو خدا کا پیغامبر نہیں (اس لیے کہ تو اس تباہی کو جلدی نہیں

لانا جس کی دھکیاں دیتا ہے) ان سے کہہ دو کہ (ہیں اس بات پر تم سے قطعاً جھگڑا نہیں کرنا چاہتا) تمہارے اور میرے

درمیان جو فیصلہ قانون خداوندی کی رُو سے ہو گا وہ میری صداقت کی کافی شہادت ہو گا یا اس شخص کی شہادت جو قانون

خداوندی سے واقف ہو (اور اس لیے سمجھ سکتا ہو کہ جو کچھ میں پیش کرتا ہوں وہ خدا کا قانون ہے یا میرا خود ساختہ)!

آپ کو شاید علم نہ ہو کہ ہمارے علماء کے ہاں "علم الکتاب" ہونا ہی نہیں۔ انہیں اٹھارہ اٹھارہ علوم پڑھائے جاتے ہیں لیکن قرآن ان کے

نصاب میں نہیں ہوتا۔ آخری سال تبرکاً سورۃ بقرہ کی تفسیر پڑھا دی جاتی ہے اور بس۔ قرآنی انقلاب تو وہی لاسکے گا جس کے پاس

علم الکتاب ہو گا!

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تیرہواں پارہ ————— چودہویں سورۃ



## باب سوم

### سورۃ ابراہیم

# لَتُخْرِجَنَّكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ

## (الغلاب قرآنی)

- نوع انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جانے والی کتاب ہدایت۔
- آیات اللہ۔ قوم موسیٰ کی مثال۔
- انبیائے سابقہ اور اقوام گزشتہ کے احوال و کوائف کی یاد دہانی۔
- نبوت انسان کا اکتسابی ملکہ نہیں، یہ موهبت خداوندی ہے۔
- جہنمی زندگی۔ لیڈروں اور متبعین کے مکالمات۔
- جنتی زندگی۔ شادمانیاں اور کامرانیاں۔
- خوشگوار نظریہ حیات اور غلط نظریہ زندگی، اور ان کے حاملین کا تقابل۔
- قانون مکافات عمل اور کائنات میں جاری و ساری نظام ربوبیت۔
- عالمگیر نظام ربوبیت کی بنیاد کے لیے حضرت ابراہیم کے ہاتھوں تعمیر کعبہ۔
- اس نظام کے قیام کے لیے ابراہیم کی حسین آرزوئیں۔
- تاریخی کوائف و حوادث کا تذکرہ موعظت و عبرت۔
- باطل معاشرہ میں اصلاح احوال ممکن نہیں۔ اس کی جگہ نیا معاشرہ قائم کرنا ضروری ہے۔

## باب سوم

## سُورَةُ اِبْرٰهِيْمَ

## چودھویں سُورۃ

﴿۱۴﴾ الرَّحْمٰنُ كَتَبَ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ

اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلَى صِرَاطٍ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ﴿۱﴾

خدا نے عظیم و رحیم کا ارشاد ہے کہ یہ ضابطہ قوانین ہم نے تیری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تو، اس کے ذریعے  
نوع انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے (۱۴ : ۱) اور ان کے نشوونما دینے والے کے  
قانون کے مطابق، انہیں اس خدا کے تجویز کردہ راستے پر ڈال دے جو جلال و جمال اور حسن و قوت کا مالک ہے (۱۴ : ۱)

قرآن کریم کا مقصد یہ بتایا کہ یہ نوع انسان کو ظلمت سے نور کی طرف لے جائے گا۔ اُس راستے سے جو خود خدا کا تجویز فرمودہ  
ہے۔ ظلمت اور نور، قرآن مجید کی بڑی اہم اور معروف اصلاح ہے جسے اس نے اکثر استعمال کیا ہے۔ اس کا مفہوم —  
مطالب الفرقان، جلد اول ص ۲۶ پر دیکھئے۔ ہر وہ عقیدہ، نظریہ، مسلک جو الحق (قرآن) کے خلاف ہو ظلمت کے تحت  
آجاتا ہے اور النور خود قرآن مجید ہے۔ لیکن یہاں چند قدم آگے چل کر، قرآن نے ظلمت اور نور کی کشمکش کے ایک خاص  
گوشے کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ پانچویں آیت میں ہے کہ صاحب ضرب کلیم، حضرت موسیٰ کو اس مقصد کے لیے بھیجا گیا  
تھا کہ وہ قوم بنی اسرائیل کو ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لے آئے۔ بنی اسرائیل، شخصی حکومت (فرعون) کے استبداد،  
نذہبی پیشواہیت (ہامان) کے "مقدس دام" اور سرمایہ داری (قارون) کی ہوسِ خون آشامی کی تاریکیوں میں بُری طرح گھمے  
ہوئے تھے۔ انہیں ان محکومیوں اور غلامیوں کے پیچھے سے چھڑا کر آزادی کی فضا نے بیٹھ میں لے جانا، تاکہ وہ صرف اپنے  
خدا کے قوانین کے تابع زندگی بسر کر سکیں، ظلمت سے نور کی طرف لے جانا تھا۔ اس کشمکش میں خدا اور ملائکہ کی مدد کس  
طرح مؤمنین کے شامل حال ہوتی ہے، اسے دیکھئے (۱۴ : ۲) کے ان الفاظ میں واضح کر دیا جنہیں عرف عام میں درود کہا جاتا ہے

اور جس کا مفہوم مطالب الفرقان، جلد سوم ۳۱۱ میں دیا گیا ہے) یہاں اس نکتہ کی وضاحت پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ اخراج من الظلمات الی النور کا مرحلہ قرآن کریم میں دینے گئے پرودگرام کی رُو سے طے ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم حامل قرآن ہونے کے دعوے کے باوجود ظلمت (ذلت، پستی، محکومی، غلامی، مفلسی، ناداری، کمزوری، بد اخلاقی وغیرہ) سے نکل نہیں سکتی تو سمجھ لیجئے کہ وہ اس کتاب عظیم کو تو گلے میں لٹکائے یا طاقوں میں سجائے رکھتی ہے، عمل اس کا اس کے خلاف ہے کیونکہ یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک قوم قرآن پر عمل پیرا ہو اور پھر "ظلمت کی ظلمت" میں رہے۔

اذن اللہ کے معنی قانونِ خداوندی ہیں۔ (دیکھیے مطالب الفرقان، جلد سوم ۲۵۱)۔ یہاں اس خدا کا راستہ (صراط) کہا گیا ہے جو عزیز بھی ہے اور حمید بھی۔ وہ جس کے قوانین کا غلبہ اور قوتِ حمد آفریں نتائج پیدا کرتے ہیں (انڈکس میں عنوان حمد دیکھیے) اس کا منظر نگار خدائے کائنات ہے۔

﴿۱۲﴾ اَللّٰهُ الَّذِي لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَّوَيْلٌ لِّلْكَافِرِيْنَ

مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴿۱۲﴾

وہ خدا، کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اُس کے متعین کردہ پرودگرام کی تکمیل میں سرگرم عمل ہے۔ جو لوگ اس کی تجویز کردہ راہ پر چلنے سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے لیے سخت نباہی و بربادی ہے۔ غلط راستے پر چلنے کا نتیجہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

یہ کون لوگ ہیں؟

﴿۱۳﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلٰى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ

عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عَوْجًا ۗ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ ﴿۱۳﴾

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب اس طبعی (جوانی، زندگی اور سطح انسانیت کی) (اُخری) زندگی کے مفاد میں محکاؤ ہونا ہے تو یہ طبعی زندگی کے مفاد کو ترجیح دیتے ہیں اور لوگوں کو صحیح راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں کیونکہ اس سے ان کے مفاد پر زد پڑتی ہے) اور کوشش کرتے ہیں کہ اس سیدھی راہ میں (اپنے خود ساختہ مذہب و شریعت کی آڑ میں) کچی پیدا کر دیں اور اس طرح دین کو کچھ سے کچھ بنا دیں۔

یہ ہیں وہ لوگ جو ایک بہت بڑی گمراہی کا شکار ہو رہے ہیں۔

مذہبی پیشواہیت کی ان دسیسہ کاریوں (یعنی خدا کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جانے اور سیدھے سادے دین میں



الجہنم پیدا کر دینے) کا ذکر متعدد مقامات میں آیا ہے۔ اس کا تفصیلی مفہوم مطالب الفرقان جلد چہارم ص ۷۹۔ زیر آیت (۱۴/۹) دیکھئے۔ یہاں اس "کارستانی" کو مذہبی پیشوائیت تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان لوگوں کو بھی اس کے اندر شامل کر لیا ہے جو دنیاوی مفاد کو اقدارِ خداوندی پر ترجیح دیتے ہیں اور اول الذکر میں زیادہ کشش اور جاذبیت محسوس کرتے ہیں۔ یہ لوگ قرآنی راستے سے بہت دور نکل جاتے ہیں۔

بات شروع سے قرآن کے متعلق ہو رہی تھی۔ خود قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اسے عربی میں نازل کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے دیکھئے مطالب الفرقان جلد اول ص ۳۲۔ قرآن کریم کے عربی میں نازل ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ یہ صرف عربوں کے لیے تھا (اور انہی کے لیے ہے) قرآن کا تو خود دعویٰ ہے کہ یہ تمام نوع انسان کے لیے قیامت تک ضابطہ حیات ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ (اس کے باوجود) یہ صرف کسی ایک زبان ہی میں نازل ہو سکتا تھا اور وہ وہی زبان ہونی چاہیے تھی جو رسول اللہ کی اولین مخاطب قوم کی تھی اور وہ عربی تھی۔ باقی دنیا کو اسے سمجھنے کے لیے، اس کی زبان سیکھنی ہوگی۔ علم حاصل کرنے کا طریق ہی یہ ہے بالخصوص اس کتاب کا علم جس کا کسی زبان میں بھی، ترجمہ اس کی اصل کا صحیح مفہوم ادا نہیں کر سکتا۔ دیکھئے مذکورہ بالا حوالہ) اس قرآن سے ہدایت (صحیح راستے کی طرف رہنمائی) حاصل ہوگی اور اسے چھوڑ دینے سے افراد اور اقوام گمراہ ہو جائیں گے

﴿۱۴/۳﴾ **وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ**

**اللَّهُ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ** ○

اور ہم نے جتنے رسول بھی بھیجے ہیں وہ اپنی قوم کی زبان میں پیغام حق پہنچاتے تھے تاکہ وہ اس طرح لوگوں پر توہینِ خداوندی کو بالکل واضح کر دیں۔ (اس کے بعد لوگوں کو اختیار دیا گیا کہ) جو چاہے قانونِ خداوندی کے مطابق سیدھی راہ اختیار کر لے اور جو چاہے غلط راستے پر چلتا ہے۔ اللہ کا قانون غلبہ اور حکمت پر مبنی ہے۔

اس کے بعد قومِ موسیٰ کے اخراجِ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ کا ذکر آیا ہے۔

﴿۱۴/۵﴾ **وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ**

**إِلَى النُّورِ ۗ وَذَكَرَهُمْ بِآيَاتِ اللَّهِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِكُلِّ**

**صَبَّارٍ شَكُورٍ** ⑤

اسی بیج کے مطابق ہم نے موٹے کو اپنے ضابطہ قوانین کے ساتھ بھیجا کہ وہ بنی اسرائیل کو موت کی تاریکیوں سے نکال کر زندگی کی روشنی میں لے آئے اور انہیں ان تاریخی سرگزشتوں کی یاد دلائے جن میں نظام خداوندی کو غلبہ اور تسلط حاصل ہوا تھا۔ ان سرگزشتوں میں ان لوگوں کے لیے بڑی بڑی نشانیاں ہیں جو مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے کام لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی کوششیں بھرپور نتائج کی حامل ہوں۔

دستان بنی اسرائیل گزشتہ جلدوں میں متعدد مقامات پر شرح و بسط سے آچکی ہے (انڈکس دیکھیے) اس لیے زیر نظر آیات کی تشریح کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ان کے مفہوم پر اکتفا کیا جائے گا، بجز کسی خاص یا جدید نکتہ کے۔

غور فرمائیے۔ یہاں تذکرہ دو قوموں کی کشمکش اور تصادم کا ہے اور اسے ایام اللہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ دو قوموں کی کشمکش نہیں، درحقیقت حق و باطل کی کشمکش ہے اور اسی بیج سے اسے ایام اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسلام کی تاریخ اور باقی دنیا کی تاریخ میں یہی بنیادی فرق ہے۔ اسلام کی تاریخ حق و باطل کی کشمکش کی تاریخ ہوگی اس لیے اسے ایام اللہ کہا جائے گا۔ باقی دنیا کی تاریخ ہی نہیں، بلکہ خود مسلمانوں کی (ایک قوم کی حیثیت سے) تاریخ بھی ایام اللہ نہیں کہلائے گی۔ وہ بھی، دیگر اقوام عالم کی تاریخ کی طرح ایک قوم کی تاریخ ہوگی۔ اسلام کے صدر اول کے بعد حق و باطل کی کشمکش کا دور ختم ہو گیا تھا اس لیے اس کے بعد ایام اللہ کا دور بھی باقی نہ رہا۔ اس کے بعد ہماری تاریخ، اسلام کی تاریخ نہیں، مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ اس فرق کو پیش نظر رکھنے سے بڑی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ واقعات سلاطین کے عہد کے ہوتے ہیں (خواہ وہ کسی ملک میں ہوں) اور انہیں اسلامی تاریخ کی حیثیت سے مروجہ اسلام کی تائید میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے، صدر اول کے بعد ہماری ساری تاریخ مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ ایام اللہ تو اس کے بعد وجود فروریغ دیدہ ہوئے ہی نہیں۔ دنیا میں جس قدر کتابیں "اسلام کی تاریخ" کے نام سے متداول ہیں وہ مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ اسلام کی تاریخ آج تک مرتب ہی نہیں ہوئی۔ یہ جب بھی مرتب ہوگی، اس کا اندازہ ہوگا کہ اسلام اصل (اور ابتداء) میں کیا تھا۔ اب اس کی شکل کیا ہو چکی ہے اور یہ تبدیل کیسے ہوئی۔ یہ ہوگی اسلام کی تاریخ۔ میں نے اپنی کتاب "شاہکار رسالت" کے آخری باب میں اس کی طرف اشارے کیے ہیں۔ اس کی تفصیلی تاریخ لکھنے کی خواہش ایک عرصے دل میں چل رہی ہے لیکن دیگر زیادہ اہم مصروفیات کی وجہ سے، اس کے لیے ابھی تک وقت نہیں مل سکا۔ (بیدہ التوفیق)

ایام اللہ اور عام تاریخ میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہوگا کہ عام تاریخ تو محض واقعات کا مجموعہ ہے یا زیادہ سے زیادہ ان واقعات کے طبیعی اور سیاسی اسباب کا تذکرہ۔ لیکن ایام اللہ (کی تاریخ) میں ہر صبار اور شکور، قوم کے لیے

سفر حیات کامیابی سے طے کرنے کے لیے عظیم نشاناتِ راہ ہوں گے (انڈکس میں تاریخ کا عنوان دیکھئے)

اس داستان کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

﴿۱۳﴾ **وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ أَنْجَاكُمْ**

**مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ**

**وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿۱۴﴾**

جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ان عنایاتِ خداوندی کو یاد رکھو کہ اس نے تمہیں کس طرح، فرعون کے پنجہ استبداد سے نجات دلائی، وہ لوگ تم پر ڈھونڈ ڈھونڈ کر سخت عذاب لاتے تھے۔ ان میں بدترین عذاب یہ تھا کہ وہ تمہاری قوم کے معزز افراد کو ذلیل کیا کرتے تھے اور جو جوہر مردانگی سے عاری ہوتے تھے انہیں معزز و مقرب بنایا کرتے تھے (پڑھ) تمہارے نشوونما دینے والے نے تمہیں اس مصیبت سے نجات دلا کر تمہاری قومی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی پیدا کر دی اور یہ اس کی طرف سے بہت بڑی نعمت تھی۔

یہ تمام واقعات پہلے آچکے ہیں۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ نے ان سے کہا :

﴿۱۴﴾ **وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ**

**إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ﴿۱۵﴾**

اور تمہارے نشوونما دینے والے نے تمہیں صاف صاف بتا دیا کہ اس عظیم انقلاب کے مقصد یہ ہے کہ تمہارے لیے یہ امکانات پیدا کر دیئے جائیں کہ تم اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کر سکو۔ اگر تم نے ایسا کر لیا اور ان صلاحیتوں کو ہمارے پروگرام کے مطابق صحیح مصرف میں لائے تو جو کچھ تمہیں حاصل ہوا ہے اس میں اور اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا اور جو کچھ ملا ہے اس کی قدر نہ کی تو اس کا نتیجہ سخت تباہی اور بربادی ہوگا۔

اور اس کے ساتھ اس امر کی بھی تشریح کر دی کہ :

﴿۱۵﴾ **وَقَالَ مُوسَىٰ إِنَّ تَكْفُرُوا أَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا**

**فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿۱۶﴾**

چنانچہ موسیٰ نے اس کی دھناحت کرتے ہوئے، ان سے کہہ دیا کہ اگر تم نے خدا کی اس بخشائش کی قدر نہ کی۔ اور تم ہی نہیں، اگر ساری دنیا کے انسان بھی اس طرح ناسپاس گزاری کی راہ اختیار کر لیں تو اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ انسانوں کی اپنی ہی تباہی ہوگی۔ وہ تمہاری سپاس گزاری کا محتاج نہیں۔ پورا نظام کائنات اس کے سزا دار حمد و ستائش ہونے کی زندہ شہادت ہے (لہذا وہ تم سے جن یا توں کا مطالبہ کرتا ہے وہ تمہارے ہی فائدے کے لیے ہے)۔

اور پھر قرآن کے عام انداز کے مطابق، انبیاء سابقہ اور اقوام گزشتہ کے احوال و کوائف کی یاد دہانی کرائی۔

﴿۱۴۰﴾ اَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبُؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ ۗ وَ  
الَّذِيْنَ مِنْ اٰبَعْدِهِمْ ۗ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ  
بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَا  
اُرْسِلْتُمْ بِهِ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۱۴۰﴾

موسیٰ نے ان سے یہ بھی کہا کہ، کیا تم نے یہ نہیں سنا کہ ان قوموں پر کیا جیتی تھی جو تم سے پہلے جو گزری ہیں۔ قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور کئی قومیں جو ان کے بعد آئیں اور جن کے حالات کسی تاریخ میں محفوظ نہیں۔ صرف اللہ کو معلوم ہیں۔ ان کی طرف، ان کے پیغامبر واضح قوانین لے کر آئے۔ لیکن ان لوگوں نے ان کی سخت مخالفت کی اور ہر ممکن کوشش کی کہ ان کی آواز کو بلند نہ ہونے دیا جائے۔ ان کی بات آگے نہ بڑھنے پائے۔ انہوں نے ان رسولوں سے اعلان یہ کہہ دیا کہ جو پیغام تم لے کر آئے ہو، ہم اسے ماننے کے لیے تیار نہیں اور جس نظام کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو، ہمیں اس کی صداقت اور کامیابی پر قطعاً یقین نہیں۔ ہمارے دلوں میں اس کے متعلق بڑے شکوک اور اضطرابات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

اس کے جواب میں :

﴿۱۴۱﴾ قَالَتْ رُسُلُهُمْ اِنِّى اللّٰهُ شَكَّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ  
يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُوْخِّرْكُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴿۱۴۱﴾

قَالُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا ط تَرِيدُونَ أَنْ تَصُدُّوَنَا عَمَّا كَانُوا

يَعْبُدُونَ أَبَاؤَنَا فَإِن تُونَا بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ①

ان رسولوں نے اُن سے کہا کہ کیا تمہیں اُس خدا کے بارے میں شک ہو رہا ہے جس نے اس کائنات پست و بلند کو پیدا کیا ہے؟۔ جو نظام اُس خدا کا تجویز فرمودہ ہو، کیا تمہیں اس کی صداقت اور کامیابی کے متعلق شک ہے؟ وہ تمہیں اس نظام کی طرف صرف اس لیے دعوت دیتا ہے کہ تمہارے لیے اس تباہی سے محفوظ رہنے کا سامان پیدا کر دے جو تمہارے جرائم کی وجہ سے تم پر آنے والی ہے اور اس طرح تمہیں ایک مدت معینہ تک زندگی کی کامرانیوں اور خوشخواروں سے بہرہ یاب ہونے کا موقع عطا کر دے۔

اس کے جواب میں وہ کہتے کہ تم ہماری طرح کے ایک انسان ہو (اس لیے تمہارا یہ دعویٰ غلط ہے کہ تمہیں خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے) تم چاہتے ہو کہ جن ہستیوں کی اطاعت و عبودیت ہمارے اسلاف نے اختیار کر رکھی تھی، ان سے ہمیں روک دو (تاکہ ہم تمہارا مسلک اختیار کر لیں)

نیز، انہوں نے کہا کہ تم ان دلائل اور تاریخی مشاہدات کو چھوڑ دو، تم جو کہتے ہو کہ تمہاری یہ دعوت ضرور غالب آئے گی، تو اسے غالب کر کے دکھاؤ۔ اس طرح غالب کر کے کہ اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہے۔ (اُس وقت ہم دیکھیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔)

اس آیت میں ایک تو مخالفین کا یہ اعتراض نقل کیا گیا ہے کہ تم ہمارے ہی جیسے انسان ہو، پھر تم خدا کے رسول کیسے ہو سکتے ہو؟ (وہی قدیمی اعتراض!) دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ قَاتُونَا بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ تمہاری تحریک غالب آئے گی، تو اسے غالب کر کے دکھاؤ۔ اس میں تاخیر کیوں کر رہے ہو اور دوسرے معانی یہ ہو سکتے ہیں کہ ہمیں کوئی کھلا ہوا معجزہ دکھاؤ، اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ:

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَى

مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَأْتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ

اللَّهِ وَ عَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ②

ان کے رسولوں نے اُن سے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہم تمہارے ہی جیسے انسان ہیں لیکن خدا اپنے قانونِ مشیت کے مطابق،

اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، نبوت بطور موبہبت عطا کر دیتا ہے۔ باقی راغبہ و تسلط، سو وہ قانون خداوندی کے مطابق ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ (وہ کب حاصل ہوگا، یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس کا ہمیں یقین ہے کہ وہ حاصل ضرور ہوگا۔ ہمیں قانون خداوندی کی حکمت پر پورا پورا بھروسہ ہے اور یہ صرف ہم پر ہی موقوف نہیں، جو لوگ بھی تونہ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں، انہیں اس کی حکمت پر پورا پورا بھروسہ ہے۔

آیت کے پہلے حصہ میں ان کے اس اعتراض کا جواب ہے کہ ایک بشر، رسول کس طرح ہو سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ نبوت انسان کا اکتسابی ملکہ نہیں۔ یہ موبہبت خداوندی ہے (تفصیل نبوت اور وحی کے عنوانات میں گزر چکی ہے) دوسرا جواب سلطان کے متعلق ہے۔ سو یہاں بھی اس سے مراد غلبہ اور کاصیابی، اور معجزہ دونوں ہو سکتے ہیں۔ دو ٹوک بات بہر حال یہی تھی کہ ہمارا بھروسہ قوانین خداوندی پر ہے اور چونکہ وہ قوانین محکم ہیں اس لیے ہمیں اپنے دعاوی پر پورا پورا یقین ہے۔ ان قوانین پر بھروسہ اور اعتمادِ کامل کیوں ہے؟

﴿۱۴﴾ وَمَا لَنَا أَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللَّهِ وَقَدْ هَدانا سُبُلَنَا وَلَنَصْبِرَنَّ

عَلَىٰ مَا أَذِيْمُونَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿۱۴﴾

اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ ہم اس کے قانون کی حکمت پر اعتماد نہ کریں جبکہ اس نے زندگی کی مختلف راہوں کو ہمارے سامنے اس طرح واضح طور پر بے نقاب کر دیا ہے کہ ہر حقیقت و اشکاف ہو کہ ہمارے سامنے آگئی ہے، اس کے قانون کی حکمت پر اعتماد ہی تو ہے جس کی وجہ سے ہماری کیفیت یہ ہے کہ تم ہمیں جس قدر اذیتیں پہنچاؤ گے ہم انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کریں گے اور ان سے ہمارا قدم کبھی نہیں ڈگمگائے گا۔

جب خدا کا قانون اس قدر محکم ہے تو ہر بھروسہ کر نیوالے کو اس پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

سبیل کا، بجائے سُبُل (جمع) کی تشریح مطالب الفرقان جلد اول (ص ۴۲) پر) کی جا چکی ہے۔ دوسرے مقام پر ہے کہ جو ہماری طرف آنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے ہم اُسے سُبُل کی طرف راہنمائی کر دیتے ہیں (۲۹) منزل وہی رہتی ہے، (جسے خدا نے متعین کر دیا ہے) یعنی اس کی طرف جانے والی شاہراہ (صراطِ مستقیم) بھی ایک ہی ہے۔ لیکن حالات کی مطابقت پگڈنڈیاں (طریق کار) مختلف ہو سکتی ہیں جو بالآخر اس شاہراہ میں جا کر مل جاتی ہیں۔ لیکن پگڈنڈی ہو یا شاہراہ، یہ سفر اسی اعتماد کے ساتھ اختیار کیا جاتا ہے کہ یہ سب ہمیں منزل مقصود تک پہنچا دیں گی۔ ان (مخاضین) کی طرف سے وہی جواب ملتا رہا جو ہر سرکش، مستبد کا وطرہ ہے۔

۱۴۱۳ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُوْدَنَّ فِي مِلَّتِنَا

اس پر ان لوگوں نے جو قوانین خداوندی سے انکار کرتے تھے، اپنے رسولوں سے کہا کہ (ہم زیادہ باتیں سننے کے لئے تیار

نہیں)۔ یا تو (چپکے سے) ہمارا مسلک اختیار کر لو ورنہ ہم تمہیں اپنی سرزمین سے باہر نکال دیں گے۔

انہوں نے یہ کہا اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء سے کہا:

۱۴۱۴ فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِينَ ۝۱۳ وَلَنُسَكِّنَنَّكُمْ الْأَرْضَ

مِنْ بَعْدِهِمْ ط ذَلِكُمْ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ ۝۱۴

اَسْتَفْتَحُوا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ۝۱۵

انہوں نے انہیں یہ دھمکی دی اور ان کے نشوونما دینے والے نے انہیں بذریعہ وحی کہہ دیا کہ (گھبراؤ نہیں) ہم ان ظلم و

زیادتی کرنے والوں کو تباہ کر دیں گے۔ اور ان کی تباہی کے بعد تمہیں ان کے ملک میں آباد کر دیں گے (یہ کچھ اس لیے

نہیں ہوگا کہ ہمیں تمہاری طرف داری مقصود ہے اور ان سے یونہی عداوت ہے۔ یہ سب ہمارے اہل قانون کے مطابق ہوگا)

اور ہر اس قوم کے حق میں ایسا ہی ہوگا جو جانتی ہے کہ کائنات میں قانون خداوندی کا مقام کیا ہے اور اس قانون کے

خلاف چلنے کا نتیجہ کیا۔ اور وہ اس نتیجے سے خائف رہتی ہے۔

چنانچہ وہ لوگ دلائل و براہین سے نڈمانے اور انہوں نے چاہا کہ ایک فیصلہ کن بات سامنے آجائے، تو وہ آگئی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر سرکش اور باغی (جس نے قانون خداوندی کا مقابلہ کیا تھا) ناکام و نامراد رہا۔

یہاں ایک نکتہ غور طلب ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بعض رسولوں نے تو مملکت قائم کی تھی لیکن بعض ایسے بھی تھے جنہیں

مملکت اور حکومت قائم کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ زیر نظر آیات میں بات تمام رسولوں کے متعلق ہو رہی ہے اور کہا یہ

جا رہا ہے کہ انہیں ان کے مخالفین کی تباہی کے بعد، ان کی جگہ متمکن کیا گیا تھا۔ اس سے واضح ہے کہ مخالفین کی بربادی کے

بعد خدا کے رسول ان کی جگہ متمکن ہوئے تھے اور انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ اقتدار کسی

وسیع و عریض مملکت میں ہی قائم ہو۔ یہ کسی محدود و خطہ ارض میں بھی ہو سکتا تھا۔ قرآن کی یہ شہادت بہر حال یقینی

ہے کہ اپنے مخالفین کی تباہی کے بعد یہ ان کی جگہ متمکن ہوئے تھے۔ اگر کسی مقام پر تاریخ اس کی تائید نہیں کرتی تو یہ تاریخ

کی کوتاہی ہے اور اگر قرآن حکیم میں ہر رسول کے سلسلہ میں اس کی تفصیل نہیں آئی تو یہ اس لیے کہ قرآن تاریخ کی کتاب

نہیں۔ یہ کتاب ہڈی ہے اور یہ اتنا ہی بیان کرتا ہے جتنا ہدایت کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ یہ اصول ہمیشہ یاد رکھنا

چاہیے کہ جب بھی عام تاریخ اور قرآن کے بیان کردہ کسی اصول یا تصریح میں تضاد ہو تو قرآن کے بیان کو مبنی بر صداقت کہنا چاہیے۔ ہمارا ایمان قرآن پر ہے نہ کہ تاریخ پر۔ (انڈکس میں تاریخ کا عنوان دیکھئے)۔

یہاں دو غیر متبادل اصول بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ ظالم، جبار، عنید (مستبد، کرکس، آمر حکمران) آخر الامر ناکام رہتے ہیں اور جو لوگ قوانین خداوندی کی خلاف ورزی سے محتاط رہتے ہیں، کامیاب ہوتے ہیں۔ یہ غیر متبادل قانون خداوندی ہے۔ ان نتائج کے برآمد ہونے میں وقت تو لگتا ہے لیکن ایسا ہو کر رہنا یقینی ہے۔ ذَلِكْ لِمَنْ خَافَ۔ ایک ابدی اصول اور غیر متبادل قانون کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو بھی ایسا کرے گا اس کا نتیجہ یہی نکلے گا۔

حکومت اور اقتدار، دولت اور حشمت کا چھن جانا ہی کچھ کم عذاب نہیں ہوتا، لیکن اس سے بھی زیادہ شدید عذاب ایک اور ہوتا ہے اور وہ ہوتا ہے 'محمومی اور غلامی' ذلت و پستی کی زندگی۔ یعنی اس شکست اور ناکامی سے یہ نہیں ہوتا کہ وہ قوم صفحہ ہستی سے معدوم ہو جائے۔ وہ زندہ رہتی ہے اور یہ زندگی اس کے لیے زیادہ شدید عذاب کا سبب بنتی ہے۔ متعدد مقامات پر بتایا جا چکا ہے کہ آخری زندگی کی جنت اور جہنم برحق ہے۔ اس پر ہمارا ایمان ہے لیکن قرآن حکیم کی رو سے، جنت اور جہنم کی زندگی اس دنیا ہی سے شروع ہو جاتی ہے (انڈکس میں عنوانات دیکھئے جنت اور جہنم) زیر نظر آیات میں 'محموم قوموں کی اسی دنیا کی جہنم کی طرف اشارہ ہے۔ غور کیجئے کہ محکوم کی زندگی کا قرآن نے کیسا عبرت آمیز نقشہ کھینچا ہے فرمایا:

﴿۱۴﴾ مِّنْ ذَرَايِهِ جَهَنَّمَ وَيُنْفِقُ مِنْ مَّاءٍ صَدِيدٍ ﴿۱۴﴾ يَتَجَرَّعُهُ وَلَا  
يَكَادُ يُسَبِّغُهُ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَآهُ وَسَيْئٌ وَمِنْ ذَرَايِهِ  
عَذَابٌ غَلِيظٌ ﴿۱۵﴾

(اور یہ ناکامی اور نامرادی وقتی نہ تھی، بلکہ یہ) ایک مستقل عذاب تھا جو ان کے پیچھے لگ گیا۔ اس ذلت کی زندگی میں نہیں کھانے کو ملتا تھا لیکن بجائے اس کے کہ اس سے ان کی نشوونما ہوتی، وہ ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما میں الٹا روک بن جاتا تھا۔

(انہیں اس ذلت کی زندگی کا احساس تھا۔ اس لیے) یہ سامانِ زیست ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترتا تھا۔ لیکن اسے طوعاً و کرہاً اسے نگلنا پڑتا تھا۔ انہیں چاروں طرف سے موت کے سامان دکھائی دیتے تھے (اور وہ چاہتے بھی تھے کہ انہیں موت آجائے تاکہ اس عذاب سے چھٹکارا ہو جائے) لیکن انہیں موت بھی نہیں آتی تھی (نہ ۱۴ ذ ۱۵) بلکہ



موت آنے کی بجائے اس عذاب کی شدت اور بڑھ جاتی تھی۔ دُنت! ذلت اور محکومی کا عذاب بھی کس قدر الم انگیز اور جانگسل ہوتا ہے!

یہ عذاب اس دنیا کا تھا۔ آخری زندگی کا عذاب اس سے بھی زیادہ جاننا ہوگا۔ اصل جہنم کی غذا کی مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے۔ (۴۹ ذ ۴۹)

یہاں کہا ہے کہ اس زندگی میں موت ہر طرف سے آتی دکھائی دے گی لیکن وہ مرے گئے بھی نہیں، دوسری جگہ ہے لَا يَمُوتُ رَجُلًا وَلَا يَمُوتُ رَجُلًا (نہیہ ذ ۳۱) وہ نہ زندہ ہوں گے نہ مردہ۔

علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ محکومی کی زندگی تو ایک طرف، اس کی موت بھی ہزار عبت کا موقع ہوتی ہے، اور عذابِ مجازیں ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "قبر"؛ (اپنے مردہ سے) قبر کہتی ہے:

آہِ اِظْلَامٍ تُوْجِهَاتُ فِيْ بَسْمَةِ مَحْكُومٍ تَحَا؟ میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاکِ میری سوزناک

تیری میت سے ہری تاریکیاں تاریک تر تیری میت سے زمیں کا پردہ ناموس چاک

الغدر! محکوم کی میت سے سو بار الحذر!

اے سرافیل! اے خدائے کائنات! اے جانِ پاک

یہ ہے محکوم کی جہنم کی زندگی اور اس کی ذلت آمیز موت! واضح رہے کہ دنیا کے عام نقطہ نظر سے ایک قوم پر اگر کوئی دوسری قوم حاکم ہو تو وہ قوم محکوم کہلائے گی۔ لیکن قرآنی نقطہ نگاہ سے اگر کسی قوم پر کتاب اللہ کے ہوا کسی کی حکمرانی ہو تو وہ محکوم ہے، خواہ وہ حکمرانی خود اپنی قوم ہی کی کیوں نہ ہو۔ اس اعتبار سے مسلمانوں کی تمام آزاد قومیں ہزار سال سے محکوم کی محکوم چلی آرہی ہیں، اسلام میں انسانوں پر انسانوں کی حکومت، خواہ کسی شکل میں ہو، غلامی اور محکومی ہے، آزادی صرف قوانینِ خداوندی کی محکومیت کا نام ہے۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

ان لوگوں کے اعمال کے متعلق کہا:

مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي

يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ ۗ ذَلِكَ هُوَ الضَّلَلُ الْبَعِيدُ ⑭

(اور یہ چیز صرف انہی کے ساتھ مخصوص نہیں) جو لوگ بھی قوانینِ خداوندی سے انکار کر کے غلط راستوں پر چل نکلتے ہیں (وہ)

کہیں ہوں اور کسی زمانے میں ہوں، ان کے اعمال زندگی کی مثال یوں سمجھو جیسے ہلکی سی راگھ ہو جس پر آدمی کے دن، زور کا بھجکا چلے اور وہ ساری راگھ اڑ کر کہیں کی کہیں چلی جائے اور اس میں سے کچھ بھی باقی نہ رہے (ان کے اعمال، کوئی ٹھوس تعمیری نتیجہ مرتب نہیں کرتے، اس لیے وہ رائیگاں جاتے ہیں) غور کرو کہ انسان کی ناکام اور بے نتیجہ کوششوں کی اس سے بُری مثال اور کیا ہوگی۔

جہاں اعمال قرآن کی اہم اصطلاح ہے۔ اس کے مفہوم کے لیے دیکھیے مطالب الفرقان، جلد چہارم ص ۴۷، اور جلد پنجم ص ۱۶۵۔ یہ اس لیے کہ کائنات کی مشینری تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لیے قوانین خداوندی کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ جو کام ان قوانین کے مطابق نہیں ہوں گے وہ اس پروگرام میں فٹ نہیں بیٹھ سکیں گے اس لیے تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکیں گے۔ اس سلسلہ میں کہا:

﴿۱۴﴾ **الْمُتَرَاتِنَ اللّٰهُ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ**

وہ اس لیے کہ ان کی زندگی کا نقشہ کائناتی نقشہ کے کچھ خلاف ہے، کائناتی نظام پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جانے لگی کہ وہاں ہر شے تعمیری نتیجہ مرتب کرتی ہے۔

﴿۱۴﴾ **اِنْ يَشَاۤءُ رَبُّكُمْ وَاٰتٍ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۹﴾ وَمَا ذٰلِكَ عَلٰى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۲۰﴾**

(اور جس چیز میں اس کی صلاحیت نہیں رہتی وہ ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ایسی چیز لے لیتی ہے جس میں اس قسم کی صلاحیت ہوتی ہے) لہذا ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے اعمال تعمیری نتائج پیدا نہیں کریں گے تو تم کائناتی نقشہ میں فٹ نہیں بیٹھ سکو گے اور خدا کا کائناتی قانون تمہیں نکال کر باہر پھینکے گا اور تمہاری جگہ نئی مخلوق لے آئے گا (۱۳: ۱۹-۲۰) اور ایسا کرنا خدا کے لیے کچھ مشکل نہیں۔

قرآن کریم میں ایک قوم کی جگہ دوسری قوم لے آنے کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے (دیکھیے انڈس بالخصوص ۹: ۱۱۴) لیکن خدا کے لیے یہ بھی مشکل نہیں کہ اگر ساری کی ساری نوع انسانی غلط راہوں پر چل نکلے تو ان کی جگہ ایک نئی مخلوق لے آئے۔ (جیسا کہ آیت ۳۱: ۱۱ میں بالتحریک آیا ہے) زیر نظر آیت میں قوم مخاطب کا استبدال بھی متصور ہو سکتا ہے اور نوع انسانی کا استبدال بھی۔ قومی استبدال کا مفہوم لینے سے اگلی آیات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

﴿۱۴﴾ **وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰۗءُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ**

**تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مَّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ طَقَالُوْا لَوْ**

هَدَيْنَا اللّٰهَ لَهْدِيْنَكُمْ ط سَوَاءٌ عَلَيْنَا اَجْرَعْنَا اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ

مَّحِيْبٍ ﴿۲۱﴾

(ابھی تو وہ انتظار کا وقفہ ہے جس میں آخری فیصلہ کن نصاب کی تیاری ہوتی ہے۔ جب یہ وقفہ گزر جائے گا) اور سب نانونِ خداوندی کا مقابلہ کرنے کے لیے نکل کر میدان میں آجائیں گے اور وہ وقت ہوگا جب (مضمر) چھپے ہوئے نتائج محسوس (مشہور اور بارز) شکل میں سامنے آجائیں گے تو اس وقت اس تباہی کو دیکھ کر کمزور لوگ (یعنی عوامِ جو لیدروں کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں) اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ ہم تمہارے پیچھے چلا کرتے تھے، تو آج کیا تم ایسا نہیں کرو گے کہ اس تباہی سے بچنے کی کوئی سبیل پیدا کر دو؟ وہ کہیں گے کہ اگر ہمیں اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نظر آتی تو ہم تمہارے بچاؤ کی بھی کوئی شکل بتائے، لیکن اب تو حالت یہ ہے کہ ہمیں خود اپنے بچاؤ کی بھی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی، اس لیے تمہیں کیا بتائیں؟ اب تو وہ وقت آچکا ہے کہ خواہ ہم اپنی روش پر بدستور چلتے جائیں خواہ اسے چھوڑ دیں، نتیجہ یکساں ہے۔ اب اس تباہی سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں۔ (۳۳ ز ۳۲، ۳۴ ز ۳۳، ۳۵ ز ۳۴، ۳۶ ز ۳۵، ۳۷ ز ۳۶) ﴿۲۱﴾

جہنم میں لیڈروں اور پیش روؤں کے مکالمات کے لیے وہ آیات دیکھئے جن کے حوالے اوپر مضمون میں دیے گئے ہیں۔

نیز مطالعہ الفرقان۔ جلد چہارم (صفحہ ۵۴۹)؛ جلد تیسرا (صفحہ ۱۹۷)۔

اور اس کے بعد شیطان!

﴿۲۲﴾ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قَضٰى الْاَمْرَانَ اللّٰهُ وَعَدَّكُمْ وَعَدَّ الْحَقَّ وَ

وَعَدَّتْكُمْ فَاخْلَفْتُكُمْ ط وَمَا كَانَ لِىْ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا اَنْ

دَعَوْتَكُمْ فَاَسْتَجَبْتُمْ لىْ ؕ فَلَا تَلْمُزُوْنِىْ وَّلَوْ مَوَّآ اَنفُسَكُمْ ؕ مَا اَنَا

بِمُصْرِحٍ كُمْ وَمَا اَنْتُمْ بِمُصْرِحِيْنَ ط اِنِّىْ كَفَرْتُ بِمَا اَشْرَكْتُمُوْنَ ط مِنْ

قَبْلُ ط اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾

اور جب اس نصاب کا آخری فیصلہ ہو چکے گا تو شیطان (یعنی انفرادی) فساد پسندیوں کا باطل نظام جس پر یہ لوگ چلے آ رہے تھے، کہے گا کہ ایک بات تم سے نظامِ خداوندی نے کہی تھی، سو وہ بات حقیقت بن کر تمہارے سامنے آگئی۔ اور ایک بات تم سے میں نے کہی تھی تو وہ قطعاً اس کے خلاف ہوا۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ میرے پاس کوئی ایسی قوت نہیں تھی

کہ میں تمہیں اپنے پیچھے زبردستی لگا لیتا۔ جو کچھ ہوا وہ صرف یہ ہے کہ میں نے تمہیں آواز دی تو تم نے اس پر فوراً لبیک کہہ دیا اور اس طرح میرے بلاوے کو قبول کر لیا۔ لہذا تم مجھے الزام مت دو۔ خود اپنے آپ کو الزام دو۔ اب میں بھی چیخ پکار کرنا ہوں (کہ میں گیا) اور تم بھی چیخ پکار کر رہے ہو کہ تم تباہ ہوئے۔ سارا معاشرہ کہرام مچا رہا ہے۔ چھوٹے بڑے سب وہائی سے بے ہیں لیکن، نہ میں ہی تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں، نہ تم ہی مجھے بچا سکتے ہو۔ تم نے، اس سے پہلے جو یہ روش اختیار کر رکھی تھی کہ میرے قوانین و احکام کی اطاعت، قوانین خداوندی کی طرح کیا کرتے تھے، میں تمہاری اس روش سے بری الذمہ ہوں (اسے تم نے خود ہی اختیار کیا تھا) حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بھی قوانین خداوندی سے سرکشی برتیں، ان کے لیے الم انگیز تباہی ہوتی ہے۔

شیطان (اور ابلیس) کا ذکر سابقہ جلدوں میں بکثرت آچکا ہے۔ ان کی مابہتیت کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۹۹) پر تفصیل سے بتایا جا چکا ہے۔ یہاں صرف ایک محکمہ کی وضاحت ضروری ہے۔ ہم اپنے ہر غلط کام کو شیطان کی طرف منسوب کر کے خود بری الذمہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ چونکہ شیطان خود ہمارے اپنے ہی سرکش جذبات کا نام ہے اس لیے غلط کاموں کے لیے کسی اور کے ذمہ دار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں (بغرض تفہیم) شیطان کو ایک جداگانہ ہستی قرار دے کر اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ غلط کاموں کا ذمہ دار شیطان نہیں ہوتا، تم خود ہوتے ہو! انسان کے سرکش جذبات، اسے غلط کاموں کے لیے اکساتے ہیں (اسے اس کی دعوت دیتے ہیں) اور یہ ان کی دعوت پر لبیک کہہ دیتا ہے۔ ذمہ دار بہر حال یہ خود ہی ہوتا ہے اس لیے ان کا خمیازہ بھی خود ہی بھگتا ہے۔ ان کے برعکس وہ قوم ہے جس کی زندگی قوانین خداوندی کے مطابق بسر ہوتی ہے۔

﴿۲۳﴾ **وَأَدْخِلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ**

**تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ط تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ﴿۲۳﴾**

ان کے برعکس جو لوگ قوانین خداوندی کی صداقت پر یقین رکھ کر، اس کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے، انہیں شاد کامیوں اور کامرانوں کی جنت میں داخل کیا جائے گا جس کی بہاروں پر کبھی خزاں نہیں آنے گی اور یہ سب کچھ خدا کے قانون ربوبیت کے مطابق ہوگا۔ اس (جنتی معاشرہ) میں ہر ایک کی آرزو اور کوشش یہ ہوگی کہ وہ دوسروں کے لیے، زیادہ سے زیادہ زندگی اور سلامتی کا سامان ہم پہنچائے۔

یہ دو جماعتیں ہیں بلکہ دو نظریات زندگی ہیں جن کے یہ ثمرات ہیں۔ اسے مثال کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔

الْمُتْرِكِيفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ  
 أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۚ تُؤْتِي أَكْلَهَا كُلَّ حِينٍ  
 بِإِذْنِ رَبِّهَا ۚ وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۱۵﴾

ذرا غور کرو کہ ان ہر دو متضاد نظریاتِ حیات اور نظامِ ہائے زندگی کو خدا کس طرح ایک مثال کے ذریعے واضح کرتا ہے۔ خوشگوار نظریہ زندگی کی مثال ایک ایسے عمدہ پھل دار درخت کی ہی ہے جس کی جڑیں (پائال میں) محکم اور استوار ہوں اور اس کی شاخیں فضائے آسمانی میں جھولے جھول رہی ہوں (یعنی اسے معاشی زندگی میں مادی تمکن بھی حاصل ہو اور اس کے ساتھ ہی وہ بلند اخلاقی اقدار سے بھی ہم کنار ہوں) کا مشہور مادہ کائنات سے ماورا ہے، وہ دختِ قانونِ خداوندی کے مطابق ہر زمانے میں، ہر وقت پھل دینے جاتا ہے۔ اللہ اس طرح تجربی اور نظری حقائق کو محسوس مثالوں کے ذریعے واضح کر دیتا ہے تاکہ لوگ انہیں اچھی طرح سمجھ جائیں۔

یہ مثال بڑی جامع ہے جس میں اسلام کی اصل و اساس سمٹ کر آگئی ہے۔ قوموں کی زندگی کا راز اس نظریہ میں مضمر ہوتا ہے جس کی بنیاد پر وہ اپنے معاشرہ کی عمارت استوار کرتی ہیں۔ ایک نظریہ حیات وہ ہے جو مادی کائنات اور اقدارِ خداوندی دونوں پر پرورش پاتا ہے۔ تخیل کائنات سے وہ مادی قوتوں کو مستحضر کر لیتا ہے اور پھر ان قوتوں کو اقدارِ خداوندی کے مطابق (نوع انسان کی نشوونما کے لیے) استعمال کرتا ہے۔ اس نظریہ کے زندگی بخش اور حیات افزا نتائج مستقلاً برآمد ہونے رہتے ہیں۔ یعنی جب تک کوئی قوم اس پر عمل پیرا رہتی ہے اس کی برکات سے فیض یاب ہوتی رہتی ہے۔ دوسری جگہ اس کے متعلق کہا اُكُلْهَا ذَاتُهَا وَظِلُّهَا ذَاتُهَا (۱۳)۔ اس کا سایہ بھی دائمی ہوتا ہے اور پھل بھی۔ جتنی معاشرہ کے پھلوں کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ چھوٹے بڑے ہر ایک کی دسترس میں ہوتے ہیں۔ ان تک ہر ایک کی رسائی ہوتی ہے سب یکساں طور پر ان سے منتفع ہوتے ہیں۔ قَطُّوْهَا ذَاتُهَا (۱۹)۔ اس کے دختوں کی پھلوں سے لدی ہوئی شاخیں یوں سمجھو گویا ہر ایک کی جھولی میں ہوتی ہیں۔ وہ پھل از خود تمام افرادِ معاشرہ تک پہنچتے ہیں۔ فَاصْبِرْ كَاشْرَاطٍ ۙ لَا تَمْتَدُّ بِهَا وَتَلْمِذُونَ (۲۲)۔ پھل بڑی کثرت سے ہوں گے اور ان کے راستے میں کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی۔ ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق میسر ہوں گے۔ یہ تو جہنمی معاشرہ (نظامِ سرمایہ داری) ہے جس میں پھل تو بکثرت ہوتے ہیں لیکن بانگوں پر پہرے بٹھائے جلتے ہیں کہ کوئی محتاج اور ضرورت مند ان کے قریب تک نہ آنے پائے۔ سورۃ القلم اور سورۃ کہف (۲۰ — ۲۱ — ۲۲) میں باغ والوں کی مثال سے واضح کیا گیا ہے۔

سو خوشگوار نظریہ زندگی کے ثمرات بھی قائم و دائم ہوں گے اور ان سے متمتع بھی بلا امتیاز تمام انسان ہوں گے۔ یہ ہے اسلامی نظام زندگی کا نقشہ اور قرآنی نظریہ حیات کا مال!

اس کے برعکس:

﴿۱۴﴾ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ رَجَّتْ مِنْ فَوْقِ  
الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾

اس کے برعکس، غلط نظریہ زندگی اور نظام حیات کی مثال، ایک ایسے نکمے درخت کی سی ہے جس کی کھوکھلی سی جڑ زمین کے اوپر ہی اوپر ہو، کہ اُسے جب جی چاہے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ (جو غلط نظام، اخلاقی اتذار خداوندی سے ہمکنار نہیں ہوتا، اسے ثبات و قرار نصیب نہیں ہوتا)۔

اس لئے کہ — جو شاخ نازک پر آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا!

ان ہر دو نظریات حیات کے فرق کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ طیب نظریہ حیات کی یہ کیفیت ہے کہ جب تک کوئی قوم اس پر عمل پیرا رہے گی وہ اسے اپنے ثمرات سے متمتع کرتا رہے گا۔ خبیث نظریہ حیات کی یہ حالت ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے کے باوجود قوم زندگی کے حقیقی خوشگوار ثمرات سے محروم رہے گی۔ خوشگوار ثمرات سے مراد طبعی اسباب و وسائل کی کثرت ہی نہیں، ان سے حاصل ہونے والا امن و سکون اور اطمینان و سلامتی بھی ہے جو غیر خداوندی نظریہ سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتے۔

طیب نظریہ حیات مفصلاً قرآن کریم ہے اور مجملًا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ (حق حکومت خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں)۔ یہ شرف و مجرب انسانیت کا ضامن ہے۔ طیب نظریہ حیات پر کار بند رہنے والی قوم کی حالت کیا ہوتی ہے:

﴿۱۴﴾ يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا  
وَفِي الْآخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ ﴿۲۷﴾

اس طرح اللہ، اس محکم نظریہ زندگی کی رُو سے، ایمان والوں کی جماعت کو، ان کی دنیاوی اور اُخروی زندگی (دونوں) میں ثبات اور تمکن عطا کر دیتا ہے اور جو لوگ اس نظام سے سرکشی برتتے ہیں، ان کی کوششیں راجیگاں چلی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ اس کے قانون مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔

چونکہ وہ قوم قولِ ثابت (محکم نظریہ حیات) پر کار بند ہوتی ہے اس لیے اُسے زندگی میں ثبات و استحکام حاصل ہوتا ہے۔

اس دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔ یہ ہے قرآنی نظریہ حیات کی امتیازی خصوصیت۔ یہ دنیا بھی حسین اور تابناک اور اُخروی زندگی بھی دلچسپ و تابندہ۔ یہ کچھ یونہی اتفاقاً نہیں ہو جاتا، خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے جو ابدی اور غیر متبدل ہے۔ یہی اس نظریہ کے ثبات اور اس کی حامل قوم کے استحکام کی دلیل ہے۔

لیکن کَلِمَةً طَيِّبَةً (خوشگوار نظریہ حیات) یہ کچھ از خود ہی نہیں کر دیتا۔ جب انسان اس پر عمل پیرا ہوں تو پھر اپنے نتائج مرتب کرتا ہے۔ سورۃ فاطر میں اس عمیق حقیقت کو بڑے برجستہ انداز سے واضح کیا گیا ہے۔ فرمایا: **إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ سِرْفَعَةً** (۳۳) کلمہ طیب میں اُپر کو اُٹھنے کی صلاحیت تو ہوتی ہے لیکن اُسے بلند انسان کے اعمال صالح ہی کرتے ہیں۔ نہ نظریہ زندگی بلا انسانی اعمال نتیجہ خیز ہوتا ہے نہ انسانی اعمال بلا نظریہ حیات برومند ہو سکتے ہیں۔ سورۃ انفال کی آیت (۱۶)۔ **وَمَا رَهَيْتُ إِذْ رَهَيْتُ**۔ میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے ایک نظر پھر دیکھ لیجئے۔ خدا کا متعین کردہ نظریہ زندگی اور بندہ مومن کے ہاتھ کا تعاون۔ کامطلب واضح ہو جائے گا۔ اس کے برعکس جو قومیں غیر خداوندی نظریات پر عمل پیرا ہوتی ہیں ان کے لیڈر انہیں تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف لے جاتے ہیں۔

﴿۲۸-۲۹﴾ **الْمُتَرَالِي الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ**

**دَارَ الْبُورِ ۗ لِيُصَلُّوا بِهَا وَيَبْسُ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾**

اب تم اس قانونِ مشیت کو سامنے رکھ کر اقوامِ عالم کی تاریخ پر نگاہ ڈالو اور ان راہنمایان قوم کی حالت پر غور کرو جنہیں اللہ نے زندگی کی خوشگواریاں اور فراوانیاں عطا کیں۔ لیکن انہوں نے ان کی قدر نہ کی، ان کا غلط استعمال کیا، اور اپنی ملت کے کارواں کو ایسی منڈی میں لاکر بٹھا دیا جس میں ہر طرف کساد بازاری تھی۔ جہاں اس غنیمت کا سد کا کوئی خریدار نہ تھا۔ یعنی انہیں تباہی اور بربادی کے جہنم میں جھونک دیا۔ اور یہ کیسی بُری جگہ تھی جہاں انہوں نے اس فائدے کو اُٹا رہا!

غور فرمائیے، قرآن نے تاریخِ انسانیت کو کس طرح چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ گہر میں محصر ہوا اضطراب دریا کا۔ اور یہاں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ قوموں کی زندگی میں جہنم سے کیا مراد ہوتی ہے؟ قوم کی کس میسرسی، بے قدری، خستہ حالی، ذلت و خواری کی زندگی جس تک اُس کے راہ نماؤں نے اُسے پہنچا دیا ہو۔

انہوں نے یہ کیسے کیا؟  
﴿۳۰﴾ **وَجَعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا لِّيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِهِ ۗ قُلْ تَمَتَّعُوا**

## فَإِنَّ مَصِيرَكُمْ إِلَى النَّارِ ﴿۳۰﴾

انہوں نے کیا یہ کہ (نام تو لیتے رہے قوانین خداوندی کا، لیکن) اس کے ہم پایہ ٹھہرانے رہے غیر خداوندی قوانین کو، تاکہ اس طرح لوگوں کو، خدا کے تجویز کردہ راستے سے بہکا کر، ڈوسے راستے پر ڈال دو۔ تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم نے بھی ایسی روش اختیار کر رکھی ہے۔ سو اس سے تھوڑے دنوں تک فائدے حاصل کر سکتے ہو۔ اس کے بعد تمہارے لیے بھی تباہی اور بربادی ہے۔

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ خوشگوار نظریہ حیات (کلمہ طیب) لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان قوانین الہیہ کے سوا کسی کا محکوم نہیں۔ اس سے وہ مقام انسانیت پر فائز ہوتا ہے۔ یہی توحید ہے۔ باطل نظریات کے حامل، انسانوں کو بھی حکمران قرار دیتے ہیں۔ یہ مشرک ہے، جو جبرئیل انسانیت ہے۔ (جیسا کہ مشرک کے عنوان کے تحت آپ، مطالب الفرقان کی مختلف جلدوں میں دیکھ چکے ہیں) توحید پر ایمان سے خدا کا کچھ سنورتا ہے، نہ مشرک سے اس کا کچھ بگڑتا ہے۔ ان کا تعلق خود انسان کے سنورنے اور بگڑنے سے ہے مشرک سے کچھ عرصہ کے لیے دنیاوی مفاد حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن اس کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جس نظریہ سے انسان اپنے مقام سے گر جائے اس کا نتیجہ ذلت و رسوائی کے سوا کیا ہو سکتا ہے!

ان کے برعکس، کلمہ طیب کے حاملین کے متعلق فرمایا:

﴿۳۱﴾ قُلْ لِعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا يُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعَ فِيهِ وَلَا خِلَالَ ﴿۳۱﴾

ان کے برعکس تم میرے ان بندوں سے جو میرے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں، کہہ دو کہ وہ اس سے ڈگھرائیں کہ باطل کا نظام ہر طرف مسلط ہے اس لیے، اس سے کس طرح بچا جائے گا؟ وہ نظام صلوة کو قائم کرتے ہیں اور ہم نے جو کچھ انہیں بے رکھا ہے۔ وہ ان کی مضر صلاحیتیں ہوں یا محسوس سامان زیست۔ اُسے حسب موقع و ضرورت، علانیہ اور بلوشیہ، اس بلند مقصد کے لیے صرف کرتے چلے جائیں، ابھی تو اس کا موقع ہے۔ اگر یہ وقت بھل گیا تو پھر مشکل ہو جائے گی۔ اس لیے کہ یہ جنس وہ نہیں ہے جسے، جب



جی چاہے، بازار سے خرید لیا جائے یا کسی دوست سے احساناً مانگ لیا جائے۔ اسے تو موقع پر خونِ جگر سے حاصل

کیا جاتا ہے)۔ (۲۵۴)

اس کا تعلق قانونِ مکافاتِ عمل سے ہے۔ اس کی تشریح مطالبُ الفرقان، جلد دوم (صفحہ ۴۲۸) اور جلد سوم (صفحہ ۴۳۱) پر دیکھیے۔ اگرچہ یہ موضوع (مکافاتِ عمل) سابقہ جلدوں میں پھیلا ہوا ہے کہ قرآنی تعلیم اور دعوت کا نقطہٴ ماسکیدی ہے، اسی پر نظامِ ربوبیت کی بنیاد ہے جو تمام کائنات کو محیط ہے۔

﴿۱۴﴾ ۳۳-۳۴ اَللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ  
السَّمٰوٰتِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الشَّجَرِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ  
لَكُمْ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمْ  
الْاَنْهَارَ ﴿۳۶﴾ وَسَخَّرَ لَكُمْ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآبِّیْنَ ۗ وَ  
سَخَّرَ لَكُمْ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ﴿۳۷﴾

اس طرح انسانی دنیا میں وہ نظامِ ربوبیت قائم ہو جائے گا جس کے اسباب و ذرائع خارجی دنیا میں پہلے سے مہیا کر دیے گئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے خدا نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو پیدا کیا۔ وہ بادلوں سے مینہ برساتا ہے جس کی آبیاری سے طرح طرح کے پھل پیدا ہوتے ہیں تاکہ وہ تمہارے لیے سامانِ زلیلت بنیں۔ اس نے تمہارے لیے کشتیوں (اور جہازوں) کو مسخر کر دیا تاکہ وہ اس کے قانون کے مطابق سمندوں میں چلتے رہیں اور تمہارے لیے دریا بھی مسخر کر دیے (تاکہ تم ان سے آبِ پاشی کا کام لے سکو)

اور اس نے تمہارے لیے چاند اور سورج کو بھی قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ وہ ایک مقررہ قاعدے کے مطابق، برابر چلے جا رہے ہیں۔ نیز اس نے تمہارے لیے دن اور رات کو بھی مسخر کر دیا۔

یہ (نظامِ کائنات) اس لیے سرگرم عمل ہے کہ انسانوں کو ان کی ضروریاتِ زندگی میسر آتی رہیں۔

﴿۱۴﴾ ۳۳-۳۴ وَ اَتٰكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوهُ ۗ وَاِنْ تَعَدُّوا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا  
تُحْصُوْهَا ۗ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمًا كَفٰرًا ﴿۳۷﴾

غرضیکہ اس طرح اس نے، (اپنے کائناتی قانونِ ربوبیت کے مطابق) تمہیں وہ سب کچھ دے دیا جس کی تمہیں، اپنی نشوونما کے لیے ضرورت ہے (۱۴/۳۵)۔ یہ سامانِ رزق اس قدر متنوع اور فراوان ہے کہ اگر تم اسے گننے لگو تو اس کا احاطہ نہ کر سکو (یہ سامانِ رزق ہم نے تمام انسانوں کی عالمگیر پرورش کے لیے دیا تھا۔ لیکن انسانوں نے اسے اپنے قبضے میں لے کر ایسی دست درازیاں شروع کر دیں کہ، ہر ایک ڈسٹرکٹ کے حقوق چھیننے لگا اور جو کچھ کسی کے ہاتھ آیا، اُسے دبا کر بیٹھ گیا۔

خدا نے سامانِ رزیت، بلا حدود و قیود ساری دنیا میں پھیلا دیا تھا۔ لیکن انسانوں نے اس کی تقسیم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا جس سے تمام ناہمواریاں وجود میں آگئیں۔ اس طرح بالادست انسانوں کی دست درازیوں سے نظامِ ربوبیت تہ و بالا ہو گیا۔

سرکش اور بالادست انسانوں کے اس ظلم و جور اور سلب و نہب کو روکنے کے لیے خدا نے انبیاء کرام کی بعثت کا سلسلہ شروع کیا تاکہ ان کے ہاتھوں نظامِ ربوبیت قائم ہو جائے۔ ان میں حضرت ابراہیم کو ایک خاص مقام حاصل ہے کیونکہ انھوں نے مقامی حدود سے نکل کر عالمگیر انسانیت کے نظام کی بنیاد رکھی تھی جس کا مرکز کعبہ تھا۔ حضرت ابراہیم کی داستانِ جلیلہ سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔ (انڈیکس میں دیکھیے عنوانات ابراہیم اور کعبہ) یہاں ان کی اس دُعا کا ذکر کیا گیا ہے جو انھوں نے تعمیرِ کعبہ کی تکمیل کے بعد مانگی تھی۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِنًا  
وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ ۗ ﴿۳۵﴾

سرکش انسانوں کی ان دست درازیوں اور ناہمواریوں کی روک تھام کے لیے، ابراہیم نے نظامِ خداوندی کی بنیاد رکھی اور اس کے لیے ایک مرکز قائم کیا۔ (۱۴/۳۵) اور اس سلسلہ میں خدا سے دُعا کی کہ اسے نوعِ انسان کو نشوونما دینے والے! تو اس سستی کو (جسے میں نے تیرے نظام کا مرکز قرار دے دیا ہے) ایسا بنا دے کہ یہ سرکش اور مستبد قوتوں کے سلسلے ہوئے انسانوں کے لیے مقامِ امن بن جائے اور مجھے اور میری اولاد کو (جو اس مرکز کی محافظ ہوگی) اس کی توفیق عطا فرما کہ ہم ہر اُس کام اور اُس شے سے مجتنب رہیں جو تیرے قانون کی اطاعت کے راستے میں حائل ہوں، اور ہمیں تجھ سے بیگانہ بنا دے۔

صنم (جمع اصنام) کا ترجمہ عام طور پر "بُت" کیا جاتا ہے لیکن اس کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع ہے۔

امام راغب (اپنے مفردات میں) کہتے ہیں کہ ”ہر وہ چیز جو انسان کو خدا سے بیگانہ کر دے اور اس کی توجہ کسی دوسری طرف پھیر دے، صنم کہلاتی ہے۔“ انھوں نے مزید کہا ہے کہ ”حضرت ابراہیمؑ نے جو دعائیں مانگی تھی کہ مجھے اور میری اولاد کو اس سے محفوظ رکھنا کہ ہم اصنام کی عبودیت اختیار کر لیں تو اس سے مراد ایسی ہی خواہشات کے پیچھے لگ جانا تھا کیونکہ انھیں اس کا خدشہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اور ان کی اولاد بتوں کی پرستش شروع کر دے گی۔“ (۱۴/۳۶) القرآن (دیرویزہ، ص ۱۰۵)۔ یہی وہ اصنام ہیں جن کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

رہِ اقبالِ را در کعبہ اسے شیخِ حرم! ہر زمان در آستین وارو خداوندے دگر

اور یہ کہ:

می ترا شد فکر ما ہر دم خداوندے دگر رست از یک بندتاً افتاد در بند دگر

حضرت ابراہیمؑ کے استنام کے طور پر:

صنمکہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیلؑ

یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لآ اِلٰہ میں ہے

اس اعتبار سے دیکھیے تو ہم سب اصنام پرست ہیں۔ لآ اِلٰہ سے مراد مٹی اور پتھر کی صورتوں کو توڑنا ہی نہیں، ان تمام خواہشات، مقاصد، مفادات اور رجحانات کو دل کے صنمکہ سے نکال باہر کرنا بھی ہے جو اقدارِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے کی راہ میں حائل ہوں۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہی دعا ہمارے لیے مانگی تھی کہ ملتِ ابراہیمیؑ کے پیرو ہونے کی جہت سے ہم بھی ان کی معنوی ذریت میں شامل ہیں۔

اصنام کا مندرجہ بالا مفہوم اگلی آیت نے واضح کر دیا جب کہا کہ:

﴿۱۴﴾ رَبِّ اِنَّہُمْ اَضَلُّنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّہٗ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّکَ عَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۶﴾

اے میرے نشوونما دینے والے! ان غیر خدائی قوتوں اور جاذبتوں نے، بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے اور یہ جو میں نے دعا کی ہے کہ میری اولاد کو صحیح راستے پر چلنے کی توفیق عطا ہو تو یہ اس لیے کہ اگر وہ تیرے راستے پر چلے گی تو اس نظام کے مرکز کی نولیت کی اہل رہے گی۔ اگر وہ اس راستے پر نہ چلے گی تو محض میری اولاد ہونا اسے اس کا اہل نہیں بنا سکے گا۔ (۱۴/۳۶)۔ اس نظام میں ”اپنے“ اور بیگانے کا معیار ہی بدل جاتا

ہے) میرا اپنا وہ ہوگا جو اس مسلک کا اتباع کرے گا جس پر میں چلتا ہوں۔ جو اس سے سرکشی برتنے گا تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، خواہ وہ میری اولاد میں سے ہی کیوں نہ ہو (۱۶) البتہ اس کی حفاظت اور پرورش کا انتظام تیرے طبعی قانون کے مطابق، اسی طرح ہوگا جس طرح دوسرے انسانوں کا انتظام ہوتا ہے۔

(کیونکہ تیرا طبعی قانون کا فرومون سب کے لیے یکساں ہے۔ (۱۷))

انسانوں کو گمراہ کرنے والے مٹھی اور پتھر کے بت نہیں بلکہ وہ مذہبی پیشوا ہیں جو لوگوں کو غیر خدا کی معبودیت کا سبق پڑھاتے ہیں اور اس طرح خدا کی طرف جانے والے راستے کی راہ میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آیت کے اگلے حصہ میں کہا کہ ”میرا وہ ہے جو میرا اتباع کرے“ یہ دو قومی نظریہ کی اساس و بنیاد ہے ”ہم میں سے وہ ہے جو ہمارا اتباع کرتا ہے“ نہ وہ جس کا ہر قسم کوئی نسبی یا ضلبی رشتہ ہے۔ (دو قومی نظریہ کے لیے دیکھیے انڈکس میں عنوانات قوم، قومیت یا دو قومی نظریہ بالخصوص مطالب الفرقان، جلد پنجم ص ۲۳۲، اور جلد سوم حضرت ابراہیم کی ساری زندگی اسی ابدی اصول کی زندہ تفسیر ہے۔ باپ سے قطع تعلق، قوم سے قطع تعلق، گھبراہ سے قطع تعلق، وطن سے قطع تعلق۔ غرضیکہ ہر اس شخص یا رشتے سے قطع تعلق جو خدا کے راستے میں حائل ہو (۱۸)۔ اس کے بعد انھوں نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا۔

﴿۱۴﴾ رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بُوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ  
عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ  
أَفِيدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْتُقِهِم مِّنَ  
الْثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ﴿۱۵﴾

اے ہمارے نشوونما دینے والے! میں نے (اس مقصدِ عظیم کے لیے) اپنی کچھ اولاد کو تیرے واجب اللہ حرام گھر کے پاس لا کر بسا دیا ہے (اسے ”تیرا گھر“ اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ تمام انفرادی نسبتوں سے بلند ہو کر عالمگیر انسانیت کی مشترکہ جائے امن ہے) یہ ایک ایسے مقام پر واقع ہے جہاں کھیتی کا نام و نشان تک نہیں۔ میں نے یہ سب اہتمام اس لیے کیا ہے کہ میری اولاد نظامِ صلوة کو قائم کرے۔ یعنی اس نظام کو جس میں تمام افراد تیرے قوانین کا اتباع کریں۔ سوائے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ایسا کر دے

کہ ان تمام، بظاہر، نامساعد حالات کے باوجود، لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں۔ نیز، تو ان کے لیے زمین کی پیداوار سے سامانِ رزق فراہم کر دے (۱۱۶) تاکہ (یہ معیشت کی طرف سے مطمئن ہو کر، اس مقصد کے حصول کے لیے، ایسے جذب و انہماک سے کام کریں کہ) ان کی کوششیں بھرپور نتائج کی حامل ہوں۔ رزق کی دعا کے متعلق مطالبۃ الفرقان، جلد سوم (ص ۱۷۱) دیکھیے اور انڈکس میں ”قرآن کا معاشی نظام“ وہاں آیہ زیر نظر بھی آگئی ہے۔

اس آیت میں دو ایک اور اہم نکات بھی آئے ہیں۔ کہا یہ ہے کہ (۱) اس شہر میں امن و امان قائم رہے۔ اور (۲) رزق کی طرف سے انہیں اطمینان ہو۔ یہ سب کچھ کس لیے ہے؟ لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ۔ تاکہ وہ اتنا مستحضر ہو کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ اگر اس سے مراد (جیسا کہ ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے) نماز پڑھنا ہی ہے تو اس کے لیے ان شرائط کی ضرورت نہیں۔ نماز تو ہر حال میں پڑھی جاسکتی ہے۔ بلکہ حالتِ خوف اور افلاس میں لوگ زیادہ خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ اس سے مراد نظامِ خداوندی قائم کرنا ہے (تشریح اس کی انڈکس میں ص ۱۷۱ کے عنوان میں ملے گی)۔ اس نظام کا نتیجہ یہ ہو گا کہ لوگوں کے دل ان کی طرف کھینچے چلے آئیں گے۔ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا (۱۱۷)

اور اگلی بات یہ ہے کہ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ۔ ہمارے ہاں شکر کا جو مفہوم لیا جاتا ہے (یا اللہ تیرا شکر ظاہر ہے کہ اس کے لیے بھی ان شرائط کی ضرورت نہیں۔ شکر کے مفہوم کے لیے دیکھیے مطالبۃ الفرقان جلد دوم، ص ۱۷۱) آیہ زیر نظر سے بھی اس مفہوم کی مزید تشریح ہوتی ہے۔ یعنی انہیں امن و سکون، خوشحالی اور فارغ البالی میسر ہو نا کہ جس بلند مقصد کے لیے وہ سرگرم ہوں، اس میں ان کی محنت بھرپور نتائج پیدا کر سکے۔ اگر نہ معاشرہ میں امن ہو نہ رزق کی طرف سے اطمینان، تو انسان کوئی کام و مجموعی سے نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس کی مسماعی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتیں۔ سعدی تو یہاں تک کہہ گیا ہے کہ

چنان تخط سالی شد اندر دمشق

کہ یاراں فراموش کردند عشق

اور یہ کہ صبح میں جب نماز کے لیے کھڑا ہوا تو دل اس پریشانی میں مبتلا رہا کہ — چہ خور و باعدا  
فرزندم؟ — اس کے بعد عرض کیا کہ بارِ الہا! جو کچھ میں گزارش کر رہا ہوں یہ محض میرے دل کی آواز ہے  
اور تو اسے خوب جانتا ہے۔

﴿۱۴﴾ رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِي وَمَا نَعْلُنُ وَمَا يَخْفَى  
عَلَى اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ﴿۳۸﴾

اے ہمارے پروردگار! جو کچھ ہمارے دلوں کے اندر ہے اور جو کچھ ہم ظاہر کرتے ہیں، تجھ پر سب روشن ہے (اور ایک ہم ہی پر کیا موقوف ہے) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کچھ بھی ایسا نہیں جو تجھ سے پوشیدہ ہے (اس لیے تو یہ بھی جانتا ہے کہ جس نظام کی ابتداء اس چھوٹے سے پیمانے پر ہمارے ہاتھوں کرائی جا رہی ہے، اس کا مستقبل کیا ہونے والا ہے)۔  
مستقبل کے لیے جو کچھ مانگا، اس کے ساتھ ہی بارگاہِ خداوندی میں ان نوازشاتِ کریمانہ کا شکر یہ بھی ادا کیا جو ماضی میں ان کے حال پر ارزانی ہوتی تھیں۔ فرمایا:

﴿۱۴﴾ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ  
وَإِسْحَاقَ إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ ﴿۳۹﴾

دیں اس کے مستقبل کے متعلق بڑا پُر امید ہوں۔ اس لیے کہ یہ کچھ تو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں کہ حالاً کی نامساعدت کے باوجود، تیری عنایات سے وہ کچھ ہو جاتا ہے جس کی انسان کو عام طور پر، توقع نہیں ہو سکتی۔ مثلاً، تو نے مجھے، میری کبرسنی میں جبکہ میں اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا، اسمعیل اور اسحاق جیسے بیٹے عطا کیے جو تیری حمد و ستائش کے زندہ پیکر ہیں۔ لہذا مجھے پورا پورا یقین ہے کہ میرا خدا، میری دعا کو ضرور شرفِ قبولیت عطا کرے گا۔

اور دعا وہی ہے جو پہلے مانگی تھی۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے بار دیگر پیش خدمت کر دیا۔

﴿۱۴﴾ رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَائِمًا  
تَقْبَلُ دُعَاءِ ﴿۴۰﴾

اس دعا کو، کہ وہ مجھے اور میری اولاد کو اس قابل بنا دے کہ ہمارے ہاتھوں نظامِ صلوة قائم ہو جائے، اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو میری اس آرزو کو ضرور پورا کر دے۔

اور اس کے ساتھ ہی

﴿۱۴﴾ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ﴿۱۴﴾

یزمیری یہ بھی دعا ہے کہ مجھ سے، میرے ماں باپ سے اور دوسرے مؤمنین سے، اگر کوئی چھوٹی موٹی

کو تباہیاں ہو جائیں تو ظہورِ نجات کے وقت ہم ان کے مضر اثرات سے محفوظ رہیں (۱۴)

باپ کے لیے دعائے مغفرت کے سلسلے میں، مطالبُ الفرقان، جلد ششم میں زیر آیت (۱۴) دیکھیے۔ نیز

وہ حوالے جو اوپر مفہوم میں دیے گئے ہیں۔

—————

جیسا کہ معلوم ہے قرآن کریم ان داستانوں کو تاریخی کوائف و حوادث کے طور پر بیان نہیں کرتا، ان سے مقصد عبرت و موعظت اور تذکیر و تنذیر ہوتی ہے۔ جس مقصد کے لیے داستانِ ابراہیم کو اس مقام پر دہرایا گیا ہے، آئندہ آیت میں یوں واضح کر دیا کہ :

﴿۱۴﴾ وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ ۗ

إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ ﴿۱۴﴾

ان آرزوؤں اور التجاؤں کے ساتھ، ابراہیم نے اس نظام کی ابتداء کی تھی جس کی تکمیل کے لیے اے رسول!

اب تم اٹھے ہو، اس لیے تم یہ خیال نہ کرو کہ یہ ظالم اور سرکش لوگ جو کچھ کر رہے ہیں، ہم اس سے

بے خبر ہیں۔ (ہمارا قانون مکافات سب کچھ دیکھ رہا ہے) لیکن یہ وقفہ مہلت کا ہے۔ جب ظہورِ نجات

کا وقت آجائے گا اس وقت تباہیوں کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ کر ان کی حالت یہ ہو جائے گی

کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ ان کے ڈھیلے باہر نکل آئیں گے۔

میدانِ کارزار میں شکست کھانے کے بعد ان کی حالت یہ ہوگی کہ :

﴿۱۴﴾ مَهْطِعِينَ مُقْنِعِي رَعْوِهِمْ لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ

وَإِنِّي أَخَذْتُ الْحَبْلَ بِإِصْبَعِي ﴿۱۴﴾

افراقِ قری کا یہ عالم ہو گا کہ یہ ادھر ادھر دیکھے بغیر، منہ اٹھائے، بدحواس بھاگے چلے جائیں گے۔ سب

ان کا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ حتیٰ کہ ان کی نگاہ بھی کا شانہ چشم میں لوٹ کر نہیں آئے گی۔ ان کے دل

امید سے خالی ہو جائیں گے۔ یا اس انجیز جذبات ان پر بُری طرح سے چھا جائیں گے۔  
اس وقت یہ لوگ، جو اس قدر سرکشی اختیار کر رہے ہیں، یوں ذلیل و خوار ہوں گے۔

﴿۱۴﴾ وَأَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُولُ الَّذِينَ ظَلَمُوا رَبَّنَا أَخِّرْنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ نَّجِبْ دَعْوَتِكَ وَتَتَّبِعِ الرَّسُولَ ۖ أَوْلَمْ تَكُونُوا أَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۗ ﴿۴۶﴾

اے رسول! تو ان مخالفین کو بتا ہی کے اس قسم کے ہولناک عذاب سے آگاہ کر دے۔ اُس وقت یہ سرکش اور سبکدلوگ، خدا سے گڑگڑا کر التجا کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں نھوڑی سی مہلت دے۔ ہم تیری دعوت قبول کر لیں اور تیرے رسول کی پیروی کریں گے۔  
ان سے کہا جائے گا کہ تم اس سے پہلے قسمیں اٹھا اٹھا کر کہا کرتے تھے کہ ہماری قوتوں کو زوال نہیں آسکتا (اب دیکھو کہ زوال کسے کہتے ہیں اور وہ کیسے آیا کرتا ہے؟)

اُنھیں یاد دلایا جائے گا کہ :

﴿۱۴﴾ وَسَكَنْتُمْ فِي مَسْكِينَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْآمَثَالَ ﴿۴۵﴾

تم ان لوگوں کی بستیوں میں بسے تھے جنہوں نے اپنے آپ پر زیادتی کی تھی۔ ہم نے تمہیں اُن کے واقعات سے آگاہ کر دیا تھا تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ ہمارا قانونِ مکافات اس قسم کے لوگوں سے کیا کیا کرتا ہے۔ نیز اور بھی طرح طرح کی مثالوں سے تم پر حقیقت واضح کر دی تھی۔

اور یہ بھی کہ :

﴿۱۴﴾ وَقَدْ مَكَرُوا مَكَرَهُمْ وَعِنْدَ اللَّهِ مَكْرَهُمْ ۖ وَإِن كَانَ مَكْرَهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾



ہم نے تمہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ اُن لوگوں نے، نظامِ خداوندی کی مخالفت کے لیے طرح طرح کی چالیں چلیں۔  
— ایسی چالیں کہ اُن سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل جائیں۔ لیکن ہمارے قانونِ مکافات کے مقابلہ  
میں ان کی کوئی چال کارگر نہ ہو سکی۔

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ:

﴿۱۴﴾ **فَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخْلِفاً وَعَدِهِ رِسْلَهُ إِنَّ اللَّهَ**  
**عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۱۴﴾**

لہذا، تم اس زعم میں نہ رہو کہ خدا اپنے پیغامبروں سے (جو اس انقلاب کی دعوت لے کر آتے ہیں) وعدہ خلافی کرے گا (اس کی ہر بات پوری ہو کر رہے گی) اس لیے کہ وہ بڑی قوتوں کا مالک ہے اور اس کے قانونِ مکافات کی رُو سے، ہر غلط عمل کی سزا مل کر رہتی ہے۔ اس سے کوئی اِدھر اُدھر نہیں بھاگ سکتا۔

”خدا کے انتقام“ کے مفہوم کے لیے مطالبُ الفرقان - جلد چہارم ص ۱۰ دیکھیے؛  
اس تضادم کے بعد جو انقلاب آئے گا اُسے قرآن نے چار لفظوں میں اس جامعیت اور حُسن و خوبی سے سمٹا کر رکھ دیا ہے کہ شعور اور ذوقِ دونوں اس پر وجود کرتے ہیں۔ فرمایا:

﴿۱۴﴾ **يَوْمَ تَبْدَلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَوَاتُ وَبَرَزَ لِلَّهِ**  
**الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۱۴﴾**

(اے رسول! ان سے کہہ دو کہ میری اس دعوت سے ایسا انقلاب آئے گا کہ) یہ زمین ایک دوسری زمین بن جائے گی۔ آسمان اور آسمان ہو جائے گا۔ یہ زمین و آسمان بدل جائیں گے۔ موجودہ معاشرہ کی

لے اگر ان الفاظ سے (مجازی نہیں بلکہ، حقیقی معانی لیے جائیں تو اس سے مفہوم وہ کائناتی (طبعی) انقلاب ہوگا جو کسی وقت آئے گا۔ اس کی کنہ و حقیقت کے متعلق ہم قبل از وقت کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس سے مراد وہ انقلاب ہے جو نبی اکرمؐ کے ہاتھوں اس معاشرہ میں رُو نما ہوا اور جس نے سب کچھ نہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ اس اعتبار سے ہم نے ان الفاظ کے مجازی معنی لیے ہیں۔

کی جگہ ایک نیا معاشرہ وجود میں آجائے گا اور تمام لوگ اس خدا کے سامنے اُبھر اور نکھر کر آجائیں گے جس کے قانون کے سامنے اور کسی کا قانون نہیں چل سکتا، اور جو بڑی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے۔ معاشرہ میں ممکن انقلاب کا نقشہ کس جامعیت سے کھینچا گیا ہے۔ یعنی اس سے باطل کے سابقہ نظام کا نام و نشان تک باقی نہیں رہے گا۔ یہ توجہ سے لے لیا ہوگا۔ اس کی جگہ حق کا نظام نو متکون ہو جائے گا۔ یہ حصہ الّا ہوگا۔ خاکِ ماخیزد کہ سازد آسمانے دیگرے۔ دوسرے مقامات پر دانیاء سابقہ کے سلسلہ میں، کہا تھا۔ جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا۔ (۱۴: ۱۵) ”ات تہ و بالا کر دیا گیا تھا“، لیکن حضورِ خاتم النبیین کے ہاتھوں جو انقلاب آیا، اس سے ”یہ زمین بدل گئی، آسمان بدل گیا“ آپ دُنیا کے غیرِ مُسلم مورخین سے پوچھئے۔ وہ بھی بتائیں گے کہ اس انقلاب کی رُو سے زمین اور آسمان کس طرح بدل گئے تھے۔ یہ بیوند سازی نہیں تھی، تعمیر نو تھی۔ تجدید نہیں تھی، تاسیس تھی۔ قرآن انقلاب کی دوسرے معاشرہ سے مفاہمت یا مصالحت نہیں کرتا، وہ اُسے جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر اس کی جگہ کسیر نیا معاشرہ قائم کرتا ہے۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کی رُو سے تو ہر نظام کھن کی بنیادی اینٹوں تک کو اکھیڑ پھینکنا ہوتا ہے۔

ہر بنائے کہنہ کا باداں کنندہ اول آں بنیاد را ویراں کنند  
یہی تہ آن کے انقلاب آدلیں کے وقت ہوا تھا۔ یہی اُس قوم کو کرنا ہوگا جو بارگہ قرآنی انقلاب پر  
کرنے کا تہیہ کرے۔

اقبال کے الفاظ میں :

یا بکُش در سینہ من آرزوئے انقلاب یا دگرگوں کُن نہادِ این زمان و این زمیں  
یا چُناں کُن یا چُسنیں !  
(ذبورِ عجم، مشہ)

اس سے بھی آگے :

کافر! دل آوارہ دگر بارہ باو بند بر خویش کشادیدہ و از غیر فر و بند  
دیدن دگر آموز و ندیدن دگر آموز

باطل معاشرہ میں اصلاح احوال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی اصلاح نہیں ہوتی، اس کا  
استیصال ہوتا ہے۔ جیسا تو اس کی جگہ ایک نیا معاشرہ قائم ہوتا ہے۔ جو لوگ باطل معاشرہ کو اصلاحات کی

رُو سے "اسلامی" بنانے کی سعی لا حاصل کرتے ہیں، اُن کی کوششیں کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتیں۔ یہ باطل دوئی پسند ہے حق لاشرکیہ شریعت میاں حق و باطل نہ کر قبول! اس انقلاب کی رُو سے سابقہ زمین کی جگہ نئی زمین آجائے گی اور سابقہ آسمان کی جگہ نیا آسمان۔ وہ زمین جو ربوبیتِ خداوندی کے نور سے جگمگا اُٹھے گی:

وَاسْتَرَقَّتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا - (۳۹/۶۴)

وَتَرَى الْمَجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ﴿۳۹﴾

سَرَابِلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَتَغْشَىٰ وُجُوهُهُمُ النَّارُ ﴿۴۰﴾  
 اُس دن، تو ان مجرمین کو دیکھے گا جو اس وقت یوں سرکشی اختیار کر رہے ہیں کہ یہ جنگی قیدیوں کی شکل میں، زنجیروں میں جکڑے جا رہے ہوں گے۔

ان کی زہریں، جو انہوں نے اپنی حفاظت کے لیے پہنی تھیں، تارکول کی طرح ان کے جسم سے چمٹ کر ان کے لیے وبال جان بن رہی ہوں گی، ان کے چہرے جنگ کی آگ سے جھلے ہوئے ہوں گے۔

یہ کچھ ظلم و استبداد کی رُو سے نہیں ہوگا (جیسا کہ دنیاوی انقلابات میں ہوتا ہے) یہ قانونِ مکافات عمل کی رُو سے ہوگا۔

لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ط إِنَّ اللَّهَ

سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۴۱﴾

یہ سب اس لیے ہوگا کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے، ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ مل جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس کا قانون، اعمال کا محاسبہ کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاتا۔ وہ بہت تیز واقع ہوا ہے۔

یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد کہا:

هَذَا بَلَاغٌ لِلنَّاسِ وَلِيُنذِرُوا بِهِ وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا

## هُوَ إِلَهٌ وَاحِدٌ ۚ لَيْدَكِرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ ﴿۵۲﴾

یہ تمام حقائق اور واقعات اس لیے بیان کیے گئے ہیں کہ :

- ۱۔ ان کی روشنی میں، انسانیت اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکے۔
  - ۲۔ لوگ آگاہ ہو جائیں کہ غلط روشِ زندگی کا نتیجہ کس قدر تباہ کن ہوتا ہے۔
  - ۳۔ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ کائنات میں اقتدار اور اختیار صرف خدا کا ہے کسی اور کا نہیں۔ اور
  - ۴۔ صاحبانِ عقل و بصیرت ان حقیقتوں کو سامنے رکھیں جنہیں عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اور ان سے عبرت حاصل کریں۔
- منفہوم پوری پوری تشریح کر رہا ہے۔ اس میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں۔

اختتام — سورۃ ابراہیم



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

چودھواں پارہ ————— پندرہویں سورۃ



## باب چہارم

## سُورَةُ الْحَجِّ

## قرآنی انقلاب آیا ہی چاہتا ہے

- قرآنی انقلاب آیا ہی چاہتا ہے، جس کے بعد انکار کرنے والے حسرت میں رہیں گے۔
- تباہ ہونے والی اقوام حیوانی سطح زندگی پر حجبی رہی ہوتی ہیں، تاہم ان کی تباہی سے پہلے انہیں مہبت کا وقفہ ملتا ہے۔
- قرآن کی حفاظت کا ذمہ اس کے نازل کرنے والے رکھا ہے۔
- ماضی میں بھی ہدایت خداوندی لانے والے رسولوں کا استہزاء کیا گیا۔
- قرآن آجانے کے بعد علم یقین کا ایک چمکتا ہوا شعلہ ہر قیاس و تخمین کی حقیقت کو بے نقاب کر دیتا ہے۔
- ارض و سموات میں ہر جگہ نظام ربوبیت کا فرمایا ہے۔
- زندگی اور موت خدا کے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔
- سامان زریست بھی قوانین خداوندی کی رُو سے حاصل ہوتا ہے۔
- کشمکش حیات میں عروج، خدا کے عطا فرمودہ صراطِ مستقیم پر چلنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس اصول کی وضاحت کے لیے قصۃ ابلیس و آدم کی مثال۔
- قانونِ مکاناتِ عمل کی نتیجہ خیزی سے بچنا ممکن نہیں۔
- قوموں کا عروج و زوال اور استخلاف و استبدال بھی اسی قانون کے تابع ہے۔
- حضرت ابراہیمؑ اور قوم لوطؑ کی مثالیں۔
- قوم لوطؑ جنسی بدنہادی کے سبب تباہ ہوئی۔
- اصحاب الایکھ، حدود فراموشی اور اصحاب الحجیر، قوانین خداوندی سے اعراض کے سبب اپنی ہستی کھو بیٹھے۔
- ان کی تباہ شدہ بستیوں کے آثار ان کی تباہی کی مُنہ بولتی تصاویر ہیں۔
- اقوام سابقہ کی تاریخ اور قرآن کے حقائق اُس بات پر دلیل ہیں کہ قرآنی انقلاب برپا ہو کے رہے گا۔
- اگرچہ ابتداء میں لوگ ساتھ نہیں دیتے اور قرآنی حقائق کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔
- داعی انقلاب کو صبر و استقامت سے اپنے پروردگار پر عمل پیرا رہنے کی تلقین خداوندی۔

## باب چہارم

## سُورَةُ الْحَجِّ

## پندرہویں سُورۃ

اصْحَابُ الْحَجِّرِ کے الفاظ اس سورۃ کی آیت (۸) میں آئے ہیں۔ اسی سے اس کا نام الْحَجْر ہے۔ یہ قوم ثمود کا دار الخلافہ تھا جس کا تفصیلی تذکرہ مطالب الفرقان، جلد پنجم (۲۸۹-۲۹۵) میں آچکا ہے۔ نیز جلد ششم (سورۃ الاعراف میں) اس داستان کے جو کوائف پہلے آچکے ہیں، ان کے حوالوں پر اکتفا کیا جائے گا۔ تشریح ان نکات کی، کی جائے گی جو اس میں پہلی بار آئیں گے۔ سورۃ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

الرَّفِیْقَةُ ۱۵  
تِلْكَ اٰیَةُ الْكِتٰبِ وَقُرْٰنٍ مُّبِیْنٍ ①

خدا نے علیم و رحیم کا ارشاد ہے کہ یہ اُس ضابطہ خُداوندی یعنی قرآن کریم کی آیات ہیں جو اپنے مطالب کو بڑے واضح انداز میں بیان کرتا ہے۔

قرآن کریم کو بیشتر مقامات میں کتابِ مُبِیْن کہا گیا ہے۔ یعنی خود بھی واضح اور ہر متعلقہ بات کو واضح طور پر بیان کرنے والی۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن اپنے مطالب آپ واضح کرتا ہے۔ اس سورۃ کی اس پہلی آیت سے سابقہ پارہ (مثلاً) ختم ہو جاتا ہے اور اگلی آیت سے چودھواں پارہ شروع ہوتا ہے۔



## چودھواں پارہ

﴿۱۵﴾ رَبَّمَا يُوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ ﴿۲﴾

(اے رسول! اب یہ انقلاب اپنے فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ رہا ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ جو اس کی اس طرح مخالفت کر رہے ہیں، اس حسرت میں رہیں گے کہ اے کاش! ہم بھی اسے تسلیم کر لیتے۔ قرآنی تعلیم کا اساسی نکتہ یہ ہے کہ حق اور باطل کی کشمکش، شروع سے چلی آرہی ہے۔ اس کشمکش میں حق کی علمبردار جماعت کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن آخر الامر حق غالب آتا ہے اور باطل ناکام رہ جاتا ہے۔ اس میں البتہ مہلت کا وقفہ ہوتا ہے جس میں باطل کے پرستار اس غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ فتح و کامرانی انہی کے حصے میں آئے گی۔ لیکن اس وقفہ کے ختم ہو جانے پر وہ خاسر و نامراد رہ جاتے ہیں اور اس وقت انہیں اس کا افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے شروع ہی سے اس حقیقت کا اندازہ کیوں نہ لگا لیا اور حق کی مخالفت نہ کر کے خواہ مخواہ اس قدر نقصان اٹھایا۔

﴿۱۵﴾ ذَرَّهُمْ يَٰكُلُوا وَيَمْتَعُوا وَيَلْهَمُ الْأَمَلُ فَسُوفَ

يَعْلَمُونَ ﴿۳﴾

(اس وقت، تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے، کہ یہ زندگی کی حیوانی سطح پر (۱۶) کھائیں، پیئیں اور سامانِ زینت سے فائدہ اٹھائیں (اس لیے کہ، ان کے نزدیک زندگی کا مقصد ہی یہ ہے۔ یہ انہی مشاغل میں اُلجھے رہیں اور اس طرح، ان کی لمبی چوڑی آرزوئیں (۱۷) انہیں زندگی کے بلند مقاصد سے غافل رکھیں۔ وہ وقت دُور نہیں کہ انہیں اپنی اس غلط روش کے انجام کا علم ہو جائے گا۔ (ابھی مہلت کا وقفہ ہے)

قرآن حکیم دو نظریات، دو ذہنیات، دو مسالک اور ان کی بنیادوں پر انسانوں کے دو گروہوں کا ذکر کرتا ہے۔ ایک نظریہ زندگی یہ ہے کہ انسانی زندگی، اس کے جسم کی طبعی زندگی ہے جسے طبعی قوانین کے تابع بسر کیا جاتا ہے۔ کھایا، پیا، افزائشِ نسل کی، اور موت آنے پر مر گئے۔ یہ حیوانی سطح کی زندگی ہے، جسے کفر کی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (۱۶)۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ انسانی زندگی اس کے جسم کی زندگی ہی نہیں،



جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے اس کی ذات (نفس) کہا جاتا ہے۔ انسانی جسم کی پرورش اور نشوونما طبعی قوانین کے تابع ہوتی ہے لیکن انسانی ذات کی نشوونما قوانین خداوندی (ابدی اقدار الہیہ) کی رُو سے ہوتی ہے۔ انسانی اعمال کے نقوش اس کی ذات پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ موت سے انسان کا جسم تو ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کی ذات آگے بھی جاتی ہے۔ اسے آخری زندگی کہا جاتا ہے۔ حق و باطل کی کشمکش و حقیقت انہی دو نظریاتِ حیات کی کشمکش ہے۔ اقوامِ سابقہ کی داستانیں (جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں، اس کے اسی دعویٰ کی شہادت ہیں۔ فرمایا:

﴿وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرِيْبَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُومٌ ﴿۱۵﴾﴾

اور (ان سے پہلے بھی) ہم نے کسی قوم کو ان کی مہلت کا وقفہ پورا ہونے سے پہلے تباہ نہیں کیا۔ یہ وقفہ ہمارے قانونِ مکانات کے مطابق متعین ہوتا ہے۔ اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں (ہم) مہلت کا وقفہ، قوموں کے اعمال، یعنی اُن کی زندہ رہنے کی صلاحیت کی نسبت سے متعین ہوتا ہے لیکن وہ دیگر قوانینِ خداوندی کی طرح، ہوتا ایسا اٹل ہے کہ اس میں ذرا کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ سورۃ الاعراف ... کی آیت (۳۴: ۷) اور سورۃ الرعد کی آیت (۱۳: ۳۸) میں اس نکتہ کی وضاحت کی جا چکی ہے جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ:

﴿مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ﴿۱۵﴾﴾

ہمارا یہ قانونِ مہلت اس قدر اٹل ہے کہ نہ کوئی قوم اس وقفہ سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کے بعد زندہ رہ سکتی ہے۔ (غلط روش کے نتائج ٹھیک اپنے وقت پر ظہور میں لاتے ہیں) لیکن مہلت کے وقفہ میں یہ بات کسی قوم کی سمجھ میں مشکل آ سکتی ہے کہ اس کی روش اور نظام کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ جب ایک قوم، قوت و شوکت اور دولت و حشمت کے اوجِ کمال پر ہو، اس سے کہنا کہ وہ تباہ ہو جائے گی، اس کے لیے ناقابلِ فہم ہوگا۔ ایسا کہنے والے کے متعلق وہ اس کے سوا اور کیا کہے گی کہ وہ پاگل ہے۔ سابقہ اقوام میں سے ہر قوم نے ایسا ہی کیا۔ یہی کچھ حضور نبی اکرمؐ کے ساتھ ہوا۔ آپؐ نے جب اپنی قومِ مخاطب سے کہا کہ — تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپؐ ہی خود کشی کرے گی۔ — تو:

﴿۱۵﴾ وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ﴿۶﴾

اس وقت یہ لوگ خوابِ غفلت میں پڑے ہیں اور ان کے نشہ قوت کی بدستی کا یہ عالم ہے کہ

یہ کہتے ہیں کہ ”اے وہ جس پر یہ شرآن نازل ہو رہا ہے، تو پاگل ہے“

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، ہر رسول کے متعلق یہی کہا گیا۔ (دیکھیے: ۲۶ ز ۳۴؛ ۲۶ ز ۳۴؛ ۲۶ ز ۳۴؛ ۲۶ ز ۳۴؛ ۲۶ ز ۳۴۔)

سورۃ (۵۱) میں جامع طور پر بتایا گیا کہ ہر رسول کے ساتھ یہی ماجرا گزرا تھا۔ حضور نبی اکرم کے سلسلہ میں

خود خدا نے اس الزام کی تردید کر دی۔ (۵۲ ز ۲۹؛ ۵۲ ز ۲۹؛ ۵۲ ز ۲۹)

اور پھر وہی مطالبہ کہ اگر تم خدا کے رسول ہو تو مجھزہ دکھاؤ۔

﴿۱۵﴾ لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلَكَةِ إِنْ كُنْتُمْ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۷﴾

”اور اگر تو اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو ایسا کیوں نہیں کرتا کہ فرشتوں کو ہلے سامنے لے آئے“

مجھزہ کے مطالبہ کے سلسلہ میں، انڈکس میں ”مجھزات“ کا عنوان دیکھیے۔ جہاں تک ملائکہ کا تعلق ہے،

مطالب الفرقان۔ جلد دوم (ص ۶۶) پر بتایا جا چکا ہے کہ ان سے مراد وہ قوتیں ہیں جو مدبراتِ امورِ الہیہ اور

موثراتِ قوانینِ خداوندی ہیں۔ ہم ان کی کنہ و حقیقت کے متعلق تو کچھ نہیں جان سکتے البتہ قرآن حکیم نے ان

کے مناصب اور فرائض کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس طرح تدبیرِ امور کرتے

اور قوانینِ خداوندی کو موثر بناتے ہیں۔ اس مقام پر سلسلہ کلام یوں چلا آ رہا ہے کہ اس قومِ منافق کی غلط

روشِ زندگی کا نتیجہ ان کی تباہی ہوگی جو مہلت کا وقفہ گزر جانے کے بعد وارد ہوگی۔ اس تباہی کے وارو

ہونے کو ملائکہ کی طرف منسوب کیا گیا۔

﴿۱۵﴾ مَا نُنزِّلُ الْمَلَكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذًا مُنظَرِينَ ﴿۸﴾

اے کاش! ان کی سمجھ میں یہ بات آسکتی کہ ہم ملائکہ کو یونہی نازل نہیں کیا کرتے۔ وہ اس وقت

نازل ہوا کرتے ہیں جب نتائج کے حقیقتِ ثابۃ بن کر سامنے آنے کا وقت آجائے۔ (وہی

حق و باطل کی کشمکش کا آخری مرحلہ ہوتا ہے، اس کے بعد پھر کسی کو مہلت نہیں ملا کرتی۔

اس موضوع کا تسلسل تو آگے بھی برقرار رہے گا لیکن درمیان میں ایک ایسی بات کہہ دی جس کا بڑا گہرا

تعلق قرآن کے ہر دعویٰ کے ساتھ ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ ہر قوم کے نظامِ حیات کا انجام ان قوانین کے

مطابق ہوتا ہے جو اس کتاب میں مذکور ہیں۔ چونکہ قرآن ایک مستقل ابدی ضابطہ حیات ہے اس لیے اس کے متعلق یہ وضاحت ضروری تھی کہ یہ مکمل اور غیر متبدل ہے۔ اس میں نہ کسی جگہ اضافہ کی ضرورت ہوگی، نہ کسی قسم کے تغیر و تبدل کی۔ اس حقیقت کو (۱۱۶) میں واضح کر دیا۔ ایک ابدی ضابطہ حیات کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ رہے۔ اس کا اعلان اگلی آیت میں کر دیا:

﴿۱۵﴾ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾

اس قرآن کو ہم نے نازل کیا ہے (اس لیے اس کا ہر وعدہ سچا ہو کر رہے گا۔ اور چونکہ اسے تمام نوع انسان کے لیے، ہمیشہ کے لیے، ضابطہ ہدایت بن کر رہنا ہے، اس لیے ہر طرح سے بے مکمل کر دیا گیا ہے۔ اس میں کسی رد و بدل کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ۱۱۶) اس لیے ہم خود اس کی حفاظت کریں گے۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکے گی۔

یہ تینوں خصوصیات (مکمل، غیر متبدل اور محفوظ) قرآن کے ساتھ منحصر ہیں۔ مذاہب عالم میں سے کسی مذہب کی مبینہ آسمانی کتاب میں اس کا دعویٰ نہیں کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی مذہب کا یہ دعویٰ بھی نہیں کہ جس کتاب کو وہ (اپنی) الہامی کتاب کہتے ہیں وہ وہی ہے جو ان کے بانی مذہب نے انہیں دی تھی۔ (تفصیل اس کی میری کتاب - مبینہ آسمانی کتابوں کی کہانی - میں ملے گی)۔ ان کے برعکس قرآن کے اس دعویٰ کو کہ وہ غیر محرف اور محفوظ ہے، غیر مسلموں تک تسلیم کرتے ہیں۔ یہ حرفاً حرفاً وہی ہے جسے نبی اکرمؐ نے یہ کہہ کر اُمت (بلکہ عالم انسانیت) کو دیا کہ یہ ان پر بذریعہ وحی (خدا کی طرف سے) نازل ہوا ہے۔ یہ قرآن کی منفرد خصوصیت ہے اور ختم نبوت کی ایک محکم دلیل یہ بھی ہے۔ جب ایک منزل من اللہ کتاب اپنی مکمل اور غیر محرف شکل میں موجود ہو، اور اس میں نہ کسی اضافہ کی ضرورت ہو، نہ تبدیلی کی، تو کسی رسول کے آنے کی ضرورت کہاں رہتی ہے۔ (تفصیل ان امور کی مطالبۃ الفرقان کی سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔)

اس کے بعد پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

﴿۱۵﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شِيْعِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَمَا

يَاْتِيهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهِ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۱﴾

اور تم کوئی نئے رسول نہیں ہو، جس نے تم سے پہلے بھی، مختلف گروہوں کی طرف رسول بھیجے

تھے۔ لیکن جو رسول بھی آیا، لوگوں نے اس سے (اسی طرح) مذاق کیا (جس طرح یہ تم سے مذاق کرتے ہیں۔ لہذا تمہارے لیے گھبرانے کی کوئی بات نہیں)۔  
آیت (۱۵) میں کہا تھا کہ انبیاء کو مجنون کہا گیا۔ یہاں کہا ہے کہ ان کا (معاذ اللہ) مذاق اڑایا گیا (مثلاً ۲۴؛ ۲۵) مخالفت میں یہ حرکت انتہائی ذلیل اور کمینہ ہوتی ہے۔ لیکن قوت کا نشہ ہر جوہر انسانیت اور ہر رمق شرافت کو سلب کر لیتا ہے۔ اس لیے قرآن نے کہا کہ یہ کسی خاص مجرم یا مجرم قوم کے ساتھ منحصر نہیں ہیں۔ یہ تمام مجرمین کی مشترکہ نفسیاتی کیفیت ہے۔

كذٰلِكَ نَسْلُكُهُ فِي قُلُوبِ الْمَجْرِمِينَ ﴿۱۵﴾

یہ سب مجرمین کی مشترکہ نفسیاتی کیفیت ہے (کہ وہ اپنی قوت کے نشہ میں، دلائل و براہین کا جواب استہزاء اور استغناء سے دیتے ہیں)۔

اس نفسیاتی کیفیت کا نتیجہ تھا کہ مذاق و سابقہ کے مجرمین پہنچاتے خداوندی پر ایمان لاتے تھے اور نہ ہی نبی اکرم کی قوم مخالف، قرآن پر ایمان لانے کی۔ ایمان کے لیے مقدم شرط نفسیاتی تبدیلی ہوتی ہے۔

لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِينَ ﴿۱۶﴾

یہی کیفیت تمہاری قوم کی ہے۔ یہ بھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے (اور جو کچھ پہلے لوگ کرتے تھے وہی کچھ یہ بھی کریں گے)۔

باقی رہا ان کا معجزات کا مطالبہ، سو واقعہ یہ ہے کہ جس ذہنیت کے یہ حامل ہیں اُس کی رُو سے یہ کوئی حارق عادت واقعہ دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرَجُونَ ﴿۱۷﴾

لَقَالُوا اِنَّمَا سُكَّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْكُورُونَ ﴿۱۸﴾

دیہکتے ہیں کہ اگر تو اپنے دعوائی رسالت میں سچا ہے تو ہمارے سامنے فرشتے لے آ۔ یہ ان کی محض کٹختی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم ان کے سامنے، آسمان میں کوئی دروازہ کھول دیں اور یہ اُس میں چڑھنے بھی لگ جائیں (تو بھی یہ ایمان نہ لائیں)۔ اُس وقت یہ کہنے لگ جائیں کہ ہماری نگاہ

بند کر دی گئی ہے یا ہم پر جاؤ کر دیا گیا ہے۔ ایمان لانے کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن پر غور و فکر کیا جائے،  
 ذیہ کہ اس قسم کی خارق عادات باتوں کا تقاضا کیا جائے۔  
 (انڈکس میں معجزات کا عنوان دیکھیے)

(۱)

شعورِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں مظاہرِ فطرت کی کُنہ و حقیقت سے واقف نہیں تھا۔ وہ اُن کے جلال سے اس قدر مرعوب اور اُن کے جمال سے ایسا مسحور ہوا کہ انہیں اپنا معبود بنا لیا اور ان کی پرستش شروع کر دی۔ اس کی ان تمام توہم پرستیوں میں سب سے زیادہ تباہ کن عقیدہ یہ تھا کہ ہر ایک انسان کا ایک ستارہ ہے جس کے ساتھ اس کی قسمت وابستہ ہے۔ یہ عقیدہ اس لیے تباہ کن تھا کہ اس سے انسان صاحب اختیار و ارادہ ہونے کی بجائے مجبور و مقہور ہو جاتا ہے۔ جب انسان کی تقدیر کسی موہوم قوت (ستارہ) کے تابع ہو، اس سے زیادہ مجبور اور کون ہوگا؟ بجا ریوں کی موج بختی ہر معبود پرستش گاہ میں نجومی براجمان رہتے تھے جن کے گرد قسمت کمال پوچھنے والوں (بالخصوص پوچھنے والیوں) کا ہجوم رہتا تھا۔ وہ یہ کہہ کر کہ وہ عالمِ افلاک میں جا کر بزمِ ستارگان کی تمام کیفیت معلوم کر کے آئے ہیں، ان توہمات کی گہر میں مضبوط کرتے رہتے تھے۔ قرآن آیا اور اس نے ہر قسم کی توہم پرستی کی تاریکی کو علم و بصیرت کی روشنی میں بدل دیا۔ اُس نے مظاہرِ فطرت اور اجرامِ فلکی کی اصل حقیقت کو بے نقاب کر کے کاہنوں اور منجموں کی دسیہ کاریوں کے پرے چاک کر دیئے (انڈکس میں فطرت کا عنوان دیکھیے) اس نے ستاروں کے متعلق کہا:

﴿لَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ﴾ (۱۵)

﴿وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ﴾ (۱۶)

(باقی رہا ان کا یہ کہنا کہ اس قسم کی باتیں جو قرآن میں بیان ہوتی ہیں، ان کو کاہن اور نجومی علمِ نجوم ستاروں کے علم کی ڈوسے بھی بتا سکتے ہیں تو ستاروں کی کیفیت یہ ہے کہ ہم نے فضا کی بلندیوں میں اُبھرے ہوئے کڑے پھیلا رکھے ہیں اور اُن سے روشنی منعکس ہوتی ہے تو دیکھنے والوں کو بڑے خوشنما نظر آتے ہیں۔ اور انہیں ہم نے ہر قسم کی تخریبی قوتوں سے محفوظ رکھا ہے اسی لیے تو عظیم کارگر کائنات اس نظم و ضبط اور حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ یہ ہے ستاروں

کی حقیقت جن کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ ان کی گردش سے انسانی مقدرات اور واقعات کے متعلق پیش گوئیاں کی جاسکتی ہیں۔

اور کاہنوں اور منجموں کے متعلق کہا کہ ان کے یہ فریب اور جہالت میں تو چل جاتے تھے، اب (نزولِ قرآن سے) علم کی روشنی پھیل رہی ہے۔ اب ان کی دکانیں بند ہو جائیں گی۔ اس نے اپنے مخصوص تشبیہی انداز میں کہا:

﴿۱۵﴾ **الْأَمِنَ اسْتَرْقَ السَّمْعَ فَاتَّبَعَهُ شِهَابٌ مُّبِينٌ ﴿۱۸﴾**

(ان پیش گوئیوں کی بھی اس سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں کہ یہ) محض ان کی قیاس آرائیاں ہیں۔ یہ قیاس آرائیاں اُس زمانے میں تو چل سکتی تھیں جب علم کی روشنی اس قدر عام نہ تھی۔ اب قرآن کے بعد، ان کا دور ختم ہو گیا، اب ہر قیاس و تخمین کے پیچھے علم و یقین کا ایک چمکتا ہوا شعلہ موجود ہے جو اُس کی حقیقت کو بے نقاب کر دیتا ہے۔

(۲۶ / ۲۱۲-۲۱۱ ; ۲۴ / ۹-۸ ; ۵۲ / ۳۸ ; ۶۴ / ۵ ; ۴۲ / ۹-۸)

قرآن کریم کی اس نظری تعلیم کی عملی تشریح حضور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ نے کر دی۔ یہ عقیدہ عام تھا کہ جب کسی عظیم انسان (سردار قوم) کی وفات ہوتی ہے تو چاند اور سورج کو گہن لگتا ہے۔ حضورؐ کے ایک صاحبزادے کی وفات صفر سنی میں ہوئی تو اتفاق سے اس دن سورج کو گرہن لگ گیا۔ لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا کہ ایسا آپ کے بیٹے کی وفات کی وجہ سے ہوا ہے۔ آپ کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ چاند یا سورج کو گہن تو انینِ خداوندی کے مطابق لگتا ہے۔ اس کا کسی کی موت یا حیات سے کوئی تعلق نہیں (بخاری، کتاب الکسوف) یوں حضورؐ نے اس توہم پرستی کی جڑ کاٹ دی۔

آگے بڑھنے سے پہلے، ایک ثانیہ کے لیے رُکیے اور سوچئے کہ قرآن نے ان توہمات کے بتوں کو کس طرح توڑا تھا اور ہم (مسلمانوں) نے — ان بتوں کے پاشیدہ ٹکڑوں کو اپنی مٹرکابن عقیدت سے اٹھا کر کیسے جوڑا اور اپنے ”اسلامی عقاید“ کے محرابوں میں سجایا۔ اس نے نجوم (ستاروں کے ساتھ انسانی قسمت کی وابستگی) کو توہم پرستی اور منجموں کو باطل پرست قرار دیا تھا۔ ہم نے اسی نجوم کو حقیقی علم اور اس کی بنا پر پیش گوئیوں اور تقدیر کو اپنا عقیدہ بنا لیا جس سے انسان مجبور محض بن کر رہ گیا (انڈکس میں تقدیر کا عنوان دیکھیے) ہمارے دور میں علامہ اقبالؒ نے ”تقدیر (جبر) کے باطل عقیدوں کی تردید میں بڑی کثرت سے لکھا ہے اور ہر اس عقیدہ یا

نظریہ کو جس سے انسان کے صاحب اختیار ہونے پر کسی نوع سے بھی حرف آتا ہو، باعث تزییل انسانیت قرار دلیے۔ اس نے کہا ہے کہ انسان اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ حیوان، اپنی جبلت کی رو سے مجبور ہوتا ہے انسان صاحب اختیار ہوتا ہے۔

تقدیر کے پابند جمادات و نباتات انسان فقط احکام الہی کا ہے پابند وہ احکام الہی کی پابندی اپنے اختیار و ارادہ سے کرتا ہے۔ اس نے انسان سے کہا کہ تمہیں خالقِ فطرت نے آزادی عطا کی ہے کہ اپنی تقدیر آپ مرتب کر دو۔

تو اپنی سر نوشت خود اپنے قلم سے لکھ خالی رکھی ہے خامہ حق نے تری جبین  
اُس نے نجوم کی رو سے قسمت دریافت کرنے والوں کے متعلق کہا ہے  
ستارہ کیا تری تقدیر کی خبر دیگا وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں  
اور منجموں کے متعلق کہا ہے:

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں  
لیکن قرآن کچھ کہے اور اقبال بیچارہ کتنا ہی چلائے، اس طوکیت زدہ اُمت کو عقیدہ جبر ہی راس آتا ہے جو کچھ  
جو رہا ہے سب اللہ کی طرف سے ہے، ہم اسے بدل ہی نہیں سکتے۔

نہ آسماں بگردش و مادر میا نہ ایم غالب دگر میرس کہ برما چہ می رود  
قرآن انسان کو جن بلندیوں پر پہنچاتا ہے اُس کے متعلق تو پوچھنا ہی کیا، جو دانشورا اپنی بصیرت کی رو سے مقام  
انسانیت کا کچھ اندازہ کر لیتے ہیں، انہیں بھی اس کا احساس ہو جاتا ہے کہ مقدرات کے ستاروں کی حقیقت  
کیا ہے۔ نیتے ایک جگہ کہتا ہے:

میں اس مقام پر کھڑا ہوں جہاں سے میں اپنے مقدر کے ستاروں کو جھک کر  
دیکھتا ہوں۔

اور ایک مرد مومن پکار اٹھتا ہے کہ

برتر از گردوں مقامِ آدم است اصل تہذیب احترامِ آدم است

وہ تھی قرآن کی تعلیم کا حاصل۔ شرف و تکریم انسانیت۔ اور یہ ہے ہمارا مسلک!



آیت (۱۵) میں اس نے ستاروں اور ستارہ شناسوں کی حقیقت کو بے نقاب کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دھرتی (زمین) کو ماتا (دیویسی) اور پہاڑوں کو دیوتا ماننے والوں سے کہا کہ جنہیں تم اپنا معبود سمجھ رہے ہو ان کی اصل وحقیقت یہ ہے کہ:

وَالْأَرْضُ مَدَدْنَهَا وَالْقِينَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا

۱۵  
۱۹

فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ ①

حقیقت یہ ہے کہ یہ فضا اور اس میں تیرنے والے کڑے، سب ہمارے نظام ربوبیت کے نکل پڑے ہیں۔ بلندیوں کی طرف وہ کڑے اور پستی کی طرف، زمین کا کڑہ، جسے (گول ہونے کے باوجود) ہم نے پھیلا رکھا ہے اور اس میں بڑے بڑے پہاڑ بنا دیے ہیں (جن سے دیگر فوائد کے علاوہ، زمین کی آب پاشی کے لیے واٹر ورکس کا کام لیا جاتا ہے۔ اس پانی کے ذریعے) ہم نے، زمین میں نہایت عمدہ توازن اور تناسب سے تمام چیزیں اُگائیں۔



جیسا کہ ہم (سلسل) واضح طور پر کہتے چلے آ رہے ہیں، کہ قرآن نہ تاریخ کی کتاب ہے (جس وجہ سے وہ اقوام سابقہ کی سرگزشتیں بیان کرتا ہے)۔ نہ علومِ سائنس کی کتاب (جس کے لیے وہ تخلیقِ کائنات، تخلیقِ انسان، علومِ فطرت، علمِ الافلاک، علمِ الارض، نباتات، جمادات وغیرہ سے متعلق علوم و فنون کا اس شرح و بسط سے ذکر کرتا ہے) اُس کے سامنے ایک بنیادی مقصد ہے اور یہ تمام علوم، انسان کو اس مقصد کی طرف لے جانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ وہ اس لیے ان کا ذکر کرتا ہے۔ آیاتِ زیرِ نظر میں اس نے اجرامِ فلکی، زمین، پہاڑ، مغارات، بحیرہ کا ذکر کرنے کے بعد کہا:

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرِزْقِيْنَ ②

۱۵  
۲۰

اور زمین کی اس پیداوار کو، تمہارے لیے وجز معاش (روزی کا سامان) بنایا۔ تمہارے لیے بھی اور اُس مخلوق کے لیے بھی جن کے لیے تم رزق مہیا نہیں کرتے۔

غور کیجئے۔ قرآن کریم نے نظامِ ربوبیت کی وسعتوں کو کس طرح چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھا دیا ہے (زمین) اور اُس کے مزرعات، مخلوق کے لیے ذرائعِ رزق ہیں۔ اس لیے کسی کو حق حاصل نہیں کہ اسے اپنی جاشیداد



بنا کر بیٹھ جائے (انڈکس میں عنوان زمین دیکھیے) پھر کہا۔ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ۔ ضمیر کُم میں تمام انسان آجاتے ہیں۔ لہذا، ان ذرائع رزق کا نظم و نسق اس انداز سے ہونا چاہیے کہ تمام انسانوں (لکمُم) کے لیے اس سے رزق مہیا ہو۔ اگر کسی انتظام میں کوئی ایک انسان بھی سامانِ زیت (رزق۔ معاش) سے محروم رہ جائے تو یہ منشاءِ خداوندی کے خلاف ہوگا۔ (انڈکس میں دیکھیے قرآن کا معاشی نظام)

پھر یہ سامانِ زیت انسانوں تک محدود نہیں، اس میں تمام ذمی حیات آجاتے ہیں (وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرِزْقِيْنَ)۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ذرائع رزق کی وسعتیں محدود ہیں اور مخلوق بکثرت۔ پھر یہ مخلوق پھیلی ہی جاتی ہے تو اس صورت میں یہ ذرائع اس مقصد کو کس طرح پورا کر سکیں گے؟ کہا کہ:

وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنزِلُ

۱۵  
۲۱

إِلَّا بِقَدْرِ مَعْلُومٍ ۝۲۱

ہمارے پاس (کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں) ان چیزوں کے بے بہا ذخیرے ہیں (جو تمہارے لیے سامانِ زیت بنتی ہیں) لیکن ہم انہیں ایک معینہ انداز سے کے مطابق باہر لاتے ہیں (اس معینہ انداز سے کا دوسرا نام قانونِ فطرت ہے)۔

خانی فطرت کے اس انتظام پر غور کیجیے۔ خشک زمین، گڑھ ارض کا قریباً پانچواں حصہ ہے۔ جب سے اس پر ذمی حیات کی نمود ہوتی ہے، یہ ان سب کو رزق بہم پہنچاتی جاتی ہے۔ اس میں رزق پیدا کرنے کی صلاحیت (لامحدود نہیں تو) بے کنار ہے۔ اس میں سے رزق کی پیداوار قوانینِ نظرت کے مطابق ایک خاص انداز سے کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر کہیں ایسا ہوتا کہ یہ اپنے خزانے ایک ہی بار اُگل دیتا تو آنے والی نسلیں بھوک کی مرچاں۔ علاوہ ازیں استحصالی قوتیں زمین پر قابض ہو کر اس میں سے رزق نکالنے لگتیں اور یہ سارے کا سارا رزق ان کے حوالے کر دیتی تو بقایا مخلوق خدا کا جو حشر ہوتا، ظاہر ہے۔ یہ تو عنایت ہے کہ انہیں بھی رزق حاصل کرنے کے لیے ہر بار جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔

”بِقَدْرِ مَعْلُومٍ“ میں بھی ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے۔ زراعت کے لیے بھی قوانینِ مقدر ہیں۔ ان قوانین کا علم جس قدر بڑھتا جائے گا (وہ بِقَدْرِ مَعْلُومٍ ہوتا جائے گا) اس نسبت سے ارضی خزانے کی زیادہ نمود ہوتی جائے گی۔ سو سال پہلے اور موجودہ دور کی ارضی پیداوار میں کس قدر فرق ہے وہ انہی قوانین کے ”معلوم“

ہونے (اور ان پر عمل کرنے) کا نتیجہ ہے۔ جو تو میں اس علم کو زیادہ سے زیادہ جس قدر حاصل کریں گی اور ان کے مطابق زراعت کریں گی، ان کے ہاں اسی قدر رزق کی ارزانی ہوگی۔  
ذرائع رزق تنہا زمین تک محدود نہیں، اس کے ساتھ دیگر عناصر بھی تعاون کرتے ہیں جن کا ذکر اگلی آیت میں کیا گیا ہے۔

۱۵  
۲۲] وَارْسَلْنَا الرِّيحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً

فَاَسْقَيْنَكُمُوهُ ۚ وَمَا اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

اس مقصد کے لیے ہم ہوائیں چلاتے ہیں جو پانی کے بخارات سے لدی ہوتی ہیں (برعکس آندھیوں کے۔ ۱۵) پھر ہم انہی بادلوں سے میٹھ برساتے ہیں اور اس کا پانی تمہارے پینے کے کام آتا ہے۔  
(یہ ذخائر ہمارے پاس رہتے ہیں، تمہارے پاس نہیں رہتے۔

اس کے بعد پھر ان نکات کی اہمیت واضح کر دی جن کے لیے ان تصریحات کو بیان کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ افراد کی موت و حیات اور اقوام کا عروج و زوال ان ہی ذرائع کے ساتھ وابستہ ہے اور دوسرے یہ کہ ان کے خالق بھی ہم ہیں اور مالک بھی ہم جھنسی مالک، خالق ہی ہو سکتا ہے۔ فرمایا:

۱۵  
۲۳] وَاِنَّا لَنَحْنُ نَحْيُ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور (ہر شے کو ہمارے قانون کے مطابق) زندگی ملتی ہے اور اسی کے مطابق موت طاری ہوتی ہے۔  
(ان تصریحات سے واضح ہے کہ کائنات میں جس قدر سامانِ زلیت ہے، اُس کے مالک ہم ہیں۔

دتم مالک نہیں ہو کہ اسے سمیٹ کر بیٹھ جاؤ (۲۳-۲۴)

سورۃ ق میں بھی ایک آیت انہی الفاظ پر مشتمل ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَحْيُ وَنُمِيْتُ وَ الْيٰنَا الْمَصِيْرُ

(۲۳) ہم تو اس قسم کی آیات سے یونہی سرسری طور پر آگے بڑھ جاتے ہیں لیکن جن اہل علم حضرات کی نگاہیں گہرائیوں تک پہنچتی ہیں، وہ ان کے اسلوب بیان کو بھی قرآن کا معجزہ سمجھتے ہیں۔ (H.A.R. GIBB) عربی زبان کا سکالر اور ممتاز مستشرق ہے۔ اس نے ایک، بقامت کہتر لیکن بقیمت بہتر کتاب لکھی ہے (MODERN TREND IN ISLAM) اس میں اُس نے اس نکتہ پر بحث کی ہے کہ قرآن کریم کا دنیا کی کسی زبان میں ترجمہ

نہیں ہو سکتا۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے :

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ ہو نہیں سکتا۔ جس طرح کسی بلند شاعری کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ وحی کی زبان ہی مختلف ہوتی ہے۔۔۔۔۔ قرآنِ کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرو تو اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ اس کے عربی زبان کے تراشے ہوئے نگیٹوں کے گوشوں کو جامع طور پر سامنے لانے کی بجائے، مترجم اپنے وضع کردہ ایسے الفاظ استعمال کرے گا جو اصلی الفاظ کی وسعت اور جامعیت کو متقید کر دیں گے۔ ایسی آیات میں، جن میں عام واقعات یا قوانین و احکام مذکور ہوں، ترجمہ کا نقص شاید زیادہ نقصان رساں نہ ہو، لیکن، بایں ہمہ، جو مد و جذر، جو نشیب و فراز جو بلندیاں اور گہرائیاں، جو لطافتیں اور باریکیاں اور اس کے ساتھ جو جوش و خروش، اصل کتاب میں جلوہ فرما ہے، وہ ترجمہ میں کیا آسکے گا! ذرا اس صاف اور سیدھی سی آیت کو لیجئے:

إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَاللَّيْلُ الْمَصِيرُ ۝

اور انگریزی ہی نہیں، دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ کر کے دکھائیے۔ اس کے چھ الفاظ میں جو پانچ مرتبہ ”ہم“ (we) کی تکرار ہے، اسے کون سی زبان ادا کر سکے گی؟ (صفحہ ۴۴ ترجمہ رواں)

یہ ہے قرآن مجید کی پانچ پانچ جگہ جہے الفاظ پر مشتمل آیات کا اعجاز بیان۔ (میں نے اسی لیے قرآنِ کریم کے ترجمہ کی بجائے اس کا مفہوم مرتب کیا ہے)۔ یہ حقیقت ہے کہ ترجمہ ان خواہ کسی زبان میں ہو، قرآن کا مفہوم ادا کر ہی نہیں سکتا۔ کوئی اور زبان تو ایک طرف، خود عربی زبان کے مرادف الفاظ بھی قرآنی الفاظ کا مفہوم ادا نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں ایک مشہور تفسیر ہے۔۔۔ جلالین۔۔۔ اس میں قرآنی الفاظ کے مرادف الفاظ ساتھ کے ساتھ دیے گئے ہیں۔ آپ کسی آیت کے قرآنی الفاظ کو دیکھیے اور اس کے بعد اس کے مرادف الفاظ کی رُو سے اس آیت کے ”اصلی اور نقلی“ کا فرق نکھ کر سامنے آجائے گا۔ میں نے اس موضوع پر، مفہوم القرآن، جلد اول کے شروع میں ”تعارف“ کے تحت تفصیلی بحث کی ہے۔

اس ضمنی بحث کے بعد آگے بڑھیے۔ یہ کہنے کے بعد کہ سامانِ زیست، جس کے ساتھ افراد اور اقوام کی سورت و حیات وابستہ ہے، قوانینِ خداوندی کی رُو سے حاصل ہوتا ہے۔ فرمایا:

وَلَقَدْ عَلَّمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلَّمْنَا الْمُسْتَاخِرِينَ ۝

اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے کون (اپنی ہنرمندیوں اور چابک دستیوں کی بنا پر) آگے بڑھ جائے

والے (اور اس طرح سامانِ معیشت اپنے قبضے میں لے لینے والے) ہیں اور کون پیچھے رہ جانے والے ہیں۔  
 رزق سے متعلق جو موضوع پیچھے سے چلا آ رہا ہے ہم نے مفہوم اس کی رعایت سے متعین کیا ہے۔ لیکن اس آیت میں ایک عظیم اصول بیان کیا گیا ہے جو حصولِ رزق تک محدود نہیں۔ وہ انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ قرآن کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ خدائے انسان کو غلط اور صحیح راستے دکھا دیے۔ اُسے یہ صلاحیت عطا کر دی کہ وہ جو سارا راستہ چاہے اختیار کرے۔ اس کے ساتھ ہی اسے اس کی استعداد بھی مرحمت فرمادی کہ وہ اس (شاہراہِ حیات) پر جس رفتار سے جی چاہے چلے، جس قدر عمل کو شش ہونا چاہے ہو۔ شاہراہِ حیات افراد اور اقوام کے لیے دوڑ (RACE) کا میدان ہے۔ جو آگے نکلنا چاہے آگے نکل جائے جو پیچھے رہنا چاہے پیچھے رہ جائے۔ جو جس قدر کوشش کرے گا اس کے مطابق اُس کا مقام معین ہوگا۔ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا۔ (۵۱) ہم نہ کسی کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی کریں گے نہ بند لگائیں گے۔

ہست این میکہ و دعوت عام است این جا

قسمت بادہ بانداہ جام است این جا

قرآن کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ جو آگے بڑھ جائے، آگے بڑھ جائے۔ جو پیچھے رہنا چاہے، پیچھے رہ جائے۔  
 لَمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ۗ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ﴿۵۱﴾  
 اس کی رفتار کی تیزی اور سستی اُس کے عمل کی رُو سے متعین ہوگی۔ اس کی پابندی اور آزادی کے حلقے اس کی حرکت کے مطابق وضع ہوں گے۔ وَفِي ذَلِكَ فَلَيْتَتَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ﴿۵۲﴾ مسابقت اور منافست کی یہ آماجگاہ سب کے لیے ممکن ہے۔ وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ ۗ أُولَٰئِكَ الْمُقَدَّمُونَ ﴿۵۱﴾ جو جتنا آگے بڑھ جائے گا، اتنا ہی (یوں سمجھو کہ) "خدا کے قریب" ہوتا جائے گا۔

دوسروں سے آگے بڑھنے کا جذبہ انسان کے اندر ہے۔ خدا اس جذبہ کو افسردہ نہیں کرتا، اسے اُبھارتا ہے۔ اس کی تحقیر نہیں کرتا، تخسین کرتا ہے۔ آگے بڑھنے والوں کو شاباش دیتا ہے، ان میں انعامات تقسیم کرتا ہے لیکن وہ آگے بڑھنے کے میدان میں تفریق اور تمیز کرتا ہے اور یہ تفریق و تمیز، نظریہ حیات کی رُو سے متعین ہوتی ہے۔ ایک نظریہ حیات یہ ہے کہ زندگی بس اس دُنیا کی زندگی ہے اور مقصود حیات اس دُنیا کی آسائشوں اور آسائشوں کو حاصل کرنا ہے خواہ وہ کسی طرح سے حاصل ہو جائیں۔ اس سے کوئی بلند مقصد ان کے سامنے نہیں ہوتا۔ اسے مادی نظریہ حیات یا سیکولرازم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن اسے کفر کہہ کر پکارتا ہے۔ ایک دوسرے

سے آگے بڑھنے کا جذبہ اس میدان میں بھی، اس حد تک شدید کہ اس دوڑ میں انسان پاگل ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم اسے تنکاش سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس میدان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کا جذبہ، انسان کو زندگی کے حقیقی مقصد سے غافل کر دیتا ہے۔ **الْهٰکُمْ الشّٰکٰثِرُ** (۱۲)

اس کا جذبہ محرکہ ہوسکتی ہے۔ انسانی ضروریات کی تو ایک حد ہوتی ہے، لیکن ہوس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اسے تو جس قدر پورا کیا جائے، اتنی ہی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس میدان میں انسان ساری عمر دوڑتا رہتا ہے۔ ہانپتا، کانپتا۔ تاکہ وہ قبر کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔ **الْهٰکُمْ الشّٰکٰثِرُ حَتّٰی نَسُوۡمُ الْمُقَابِلٰتِ** (۱۲) ایک یہ میدان ہے۔ اس کے مقابل دوسرا میدان ہے جس کے متعلق کہا کہ **فَاَسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ** (۵) آگے بڑھنا ہے تو نوع انسان کی بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔ (قرآن کریم میں متعدد مقامات میں عمل خیرات میں آگے بڑھنے کی ترغیب و تلقین آئی ہے۔ مثلاً: **۲/۱۱۳**؛ **۲/۲۳۳**؛ **۲۳۵/۳۲**)

ان مقامات سے زیر نظر آیت (۱۵) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ **وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقِدِّیۡنَ مِنْکُمْ وَّلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاخِرِیۡنَ** ۵

ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ اس پر زور دیتا ہے کہ قرآن کریم کی صحیح تفسیر احادیث کی رو سے ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ تفسیر خود رسول اللہ کی بیان فرمودہ ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن کی جو تفسیر خود رسول اللہ نے بیان فرمائی ہو اس سے بہتر تفسیر اور کون سی ہو سکتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جن تفسیری روایات کو رسول اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ان میں پیشتر ایسی ہی جو زبان حال سے پکار پکار کر کہتی ہیں کہ ان کی نسبت رسول اللہ کی طرف صحیح نہیں، وہ وضعی ہیں۔ اسی آیت (۱۵) کی قرآن کی رو سے تفسیر آپ دیکھ چکے ہیں۔ اب دیکھئے کہ حدیث اس کی تفسیر کیا بیان کرتی ہے جامع ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ:

ایک حسین ترین عورت (مسجد میں) رسول اللہ کے پیچھے نماز پڑھنے آیا کرتی تھی۔ صحابہؓ میں سے کچھ لوگ تو آگے کی صف میں بڑھ جاتے تھے تاکہ اُسے نہ دیکھ سکیں لیکن کچھ لوگ پیچھے کی صف میں شریک ہوتے تھے اور رکوع کی حالت میں بغل کے نیچے کی طرف سے اُسے جھانکتے رہتے تھے۔ اس پر اللہ نے یہ آیت اتاری کہ ہم تم میں سے انہوں کو بھی جانتے ہیں اور پھیلوں کو بھی۔

یہ تفسیر کسی تبصرہ کی محتاج نہیں بجز اس کے کہ جن لوگوں نے اس قسم کی روایات وضع کی تھیں، ان پر تو کیا افسوس ہو سکتا ہے، افسوس آتا ہے ہمارے علماء کرام پر جو بصد ہیں کہ اسے صحیح روایت مانوا اور جو اسے یہ

کہہ کر صحیح ماننے سے انکار کر دے کہ اس کا جذبہ ایمان اس قسم کی روایات کو رسول اللہ یا صحابہ کبار کی طرف منسوب کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تو اسے منکر حدیث قرار دے کر دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیتے ہیں! اس سے اگلی آیت میں ہے:

﴿۱۵﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۱۵﴾

لیکن ہمارا نظام ربوبیت اس قسم کی تفریق و تقسیم کی اجازت نہیں دے سکتا، ہم ان سب کو یکجا اکٹھا کر دیں گے اور یہ ہمارے اس قانون کی زد سے ہو گا جو سزا سر علم و حکمت پر مبنی ہے۔

اگر آیت (۱۳) میں موت اور حیات، طبعی زندگی سے متعلق سمجھیں تو اگلی آیت (۱۴) کا مفہوم یہ ہو گا کہ جو لوگ دنیا سے پہلے جا چکے ہیں وہ بھی خدا کے علم میں ہیں اور جو ہنوز پیچھے ہیں انہیں بھی خدا جانا ہے۔ اس اعتبار سے آیت (۱۵) میں يَحْشُرُهُمْ کا تعلق آخری زندگی سے ہو گا۔ لیکن اگر ان آیات کا تعلق رزق میں مسابقت سے ہو گا تو زیر نظر آیت (۱۴) کا مفہوم یہ ہو گا کہ مستقدمین اور متاخرین سے جو طبقاتی تقسیم پیدا ہو گئی ہے، جب نظام ربوبیت قائم ہو گا تو یہ باقی نہیں رہے گا۔ تمام انسان ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے۔

اس کے بعد توحہ کا رخ قصۃ ابلیس و آدم کی طرف منعطف کر لیا۔ جو اس کشمکش کی داستان ہے۔ لیکن اس سے پہلے دو ایک آیات میں تخلیق انسانی کا ذکر اشارتاً کر دیا جس سے (ضمناً) ان اسرائیلی افسانوں کی (بار دیگر) تردید مقصود ہے جن کی رو سے کہا جاتا ہے کہ آدم ایک مٹی کا پتلا تھا۔ اس سے انسانوں کی تخلیق کا سلسلہ شروع ہوا۔ فرمایا:

﴿۱۵﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَآءٍ

مَسْنُونٍ ﴿۱۵﴾

یہی وہ حقیقت ہے جسے قصۃ آدم کے تمثیلی انداز میں، پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے اور جسے اب پھر دہرایا جاتا ہے، یہ حقیقت ہے کہ انسان کی پیدائش کی ابتدا سیاہ کچھڑ سے ہوئی جو شوکہ کرکھٹکے سے لگتا ہے۔ (یعنی وہ طین لاذب جس سے زندگی کا اولین جراثیم وجود میں آیا۔ ۳۲)

تخلیق انسانی کے متعلق مطالب الفرقان، جلد اول (صفحہ ۲۹) اور زیادہ تفصیل کے ساتھ جلد دوم (صفحہ ۳ تا آخر) لکھا جا چکا ہے۔ مزید شرح کی ضرورت نہیں جو الہ کے طور پر ذیل کی آیات میں اس کا اجمالی اور تفصیلی ذکر آیا ہے۔

۶/۲۸ ; ۱۵/۳۱ ; ۱۴/۳۲ ; ۱۸/۳۲ ; ۱۹/۳۲ ; ۲۲/۳۲ ; ۲۳/۳۲ ; ۲۵/۳۲ ; ۳۲/۳۲ ; ۳۶/۳۲ ; ۳۷/۳۲ ; ۳۸/۳۲ ; ۴۰/۳۲  
 ۶۹/۱-۲ ; ۷۷/۳۰ ; ۸۶/۵ ; ۹۲/۲

ان آیات کے مطالعہ سے یہ پوری سرگزشت بیک نگاہ سامنے آجائے گی۔ اس کے ساتھ اگر اندکس میں ارتقا کا عنوان بھی دیکھ لیا جائے تو زندگی جن مراحل سے گزر کر بیکر انسانی تک پہنچی ہے وہ بھی واضح ہو جائیں گے۔ اور نفس کے عنوان کے تحت وہ امتیازی خصوصیت جس نے انسان کو دیگر مخلوق سے ممتاز کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انسان سے پہلی مخلوق کا اجمالی سا ذکر ہے جسے جن کہہ کر پکارا گیا۔

﴿۱۵﴾ وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلِ مِنْ نَارِ السَّمُومِ ﴿۲۷﴾

واضح ہے کہ انسانی تخلیق سے پہلے کرۃ ارض میں بے پناہ حرارت تھی۔ اس لیے ابتداء یہاں ایسی مخلوق کی نمود ہوئی جس میں حرارت برداشت کرنے کی بڑی صلاحیت تھی۔

اس کی تشریح مطالب الفرقان، جلد دوم (صفحہ ۱۵) پر آچکی ہے۔

اس کے بعد آیات ۲۸ تا ۴۲ میں قصۃ ابلیس و آدم کو دہرایا گیا ہے۔ تخلیق آدم۔ ابلیس۔ ملائکہ کشکاش ابلیس و آدم۔ یہ تمام موضوعات شرح و بسط کے ساتھ مطالب الفرقان، جلد دوم کے ابتدائی ابواب میں آچکے ہیں اور زیر نظر آیات بھی جتنے جتنے وہاں مذکور ہیں۔ اس لیے یہاں ان آیات کا صرف مفہوم بیان کیا جانے کا مجبزی کسی ایسے نکتے کے جو پہلے نہ آچکا ہو۔ اگر آپ جلد دوم کے پہلے دو ابواب کا ایک بار پھر مطالعہ فرمائیں تو زیر نظر آیات خود بخود سمجھ میں آتی جائیں گی۔ سورۃ الاعراف کی آیات (۱۱-۱۸) میں بھی یہی موضوع بیان ہوا ہے مطالب الفرقان، جلد ختم، صفحہ ۱۷۲-۱۷۱ میں ان کی تشریح کے لیے ہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔

﴿۱۵﴾ وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ

صَلٰٰصٰلٍ مِّنْ حَمٰیْمٍ مَّسْنُوٰنٍ ﴿۲۸﴾

اور جب تیرے نشوونما دینے والے نے کائناتی قوتوں سے کہا کہ میں سیاہ کچیڑکی کھنکھنی مٹی سے انسان کی تخلیق کی ابتداء کرنے والا ہوں۔

آدم کا اختصاص۔

﴿۱۵﴾ فَإِذَا سَوَّيْتَهُ وَنَفَخْتَ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعْوَاهُ سَاجِدِينَ ﴿۲۹﴾

سو جب ایسا ہو کہ وہ زندگی کی مختلف ارتقائی منازل طے کر کے، اس مقام تک پہنچ جائے جہاں اس میں ٹھیک ٹھیک تناسب اور توازن قائم ہو جائے، اور میں ۱۰ اس میں، اپنی توانائی کا ایک شتمہ ڈال دوں اور یوں وہ صاحب اختیار و ارادہ، انسانی ذات کا حامل بشر بن جائے، تو تم اُس کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا۔

نفع روح ۱۱، ہم موضوع ہے جس کی تشریح مطالب الفرقان جلد دوم (ص ۱۲۱) پر آچکی ہے۔

﴿۱۵﴾ فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ ﴿۳۰﴾ إِلَّا ابْلِيسَ ط

أَبَى أَنْ يَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ ﴿۳۱﴾

پنچاچھ اس پر وگرام کے مطابق، تمام کائناتی قوتیں اس کے سامنے جھک گئیں۔ (یعنی انسان میں یہ صلاحیت رکھ دی گئی کہ وہ فطرت کی قوتوں کو مستحضر کر سکے، لیکن اس کے اپنے سرکش جذبات اس کے سامنے نہ جھکے۔ انھوں نے اس سے انکار کر دیا اور سرکشی اختیار کر لی۔ (۲۳) ابلیس سے پوچھا گیا کہ اُس نے آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا۔

﴿۱۵﴾ قَالَ يَا بَلِيسُ مَا لَكَ أَلَّا تَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ ﴿۳۲﴾

خدا نے ابلیس (انسان کے سرکش جذبات) سے پوچھا کہ تم اس کے سامنے جھکنے والوں میں سے کیوں نہیں ہو؟ تم نے سرکشی کیوں اختیار کی؟ اُس نے جواب دیا:

﴿۱۵﴾ قَالَ لَمَّا كُنْتُ لَاسْجِدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ

حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴿۳۳﴾

اُس نے کہا کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ایک ایسی مخلوق کے سامنے جھک جاؤں جسے سیاہ کچھڑ کی کھنکھی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے (یعنی انسان کی مادی تخلیق ایسی ہے کہ اس کے سرکش جذبات اس پر



غالب رہتے ہیں لیکن اسے جو "خُدائی توانائی کی جھلک"۔ انسانی ذات۔ دے دی گئی ہے اس سے یہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس کے جذبات اس پر غالب نہ آئیں۔

یہاں تو اتنا ہی کہا ہے۔ سورۃ الاعراف میں ہے:

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۗ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ۝ (۳۳)

ہم نے اُس سے پوچھا کہ جب ہم نے تجھے، آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا تو وہ کونسی بات تھی جس نے نہیں اس حکم کی تعمیل سے باز رکھا؟

اُس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے۔ (آبِ بَیِّنَاتِ) انسان پر اُس کے تند و تیز جذبات غالب رہتے ہیں لیکن جب وہ اپنے اندر وحی کے اتباع سے شرف

انسانیت کو بیدار کر لیتا ہے، تو پھر وہ ان جذبات سے مغلوب نہیں ہوتا۔ (۱۵-۳۳)

یہ جواب منطقی ہے لیکن اُس نے عقلی دلیل کی رو سے جواب دیا ہے (یہ الگ بات ہے کہ وہ دلیل باطل تھی۔ لیکن جواب بہر حال منطقی پر مبنی تھا)۔ اہل فقہ کے ہاں قیاس (منطقی طریق) بھی قانونی ماخذ میں سے ہے۔ فقہ میں قانونی ماخذ چار ہیں۔ یعنی قرآن، حدیث، قیاس اور اجماع۔ اہل حدیث کا مسلک یہ ہے کہ شریعت میں عقل کو دخل نہیں۔ اس لیے وہ عقلی طریق (قیاس) کو ماخذ قانون نہیں مانتے۔ وہ اس کے سخت خلاف ہیں۔ اس کے لیے وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ "اول من قاس ابلیس" سب سے پہلے جس نے قیاس (عقلی دلیل) سے کام لیا تھا، وہ ابلیس تھا اور اس کی سند یہی آیت ہے جو لوگ قرآن پر مبنی دین کے متعلق یہ کہیں کہ اس میں عقل کو دخل نہیں (حالانکہ سارا قرآن عقل و بصیرت کی تاکید سے بھرا بڑا ہے) ان کے متعلق کیا کہا جائے کہ یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا (۱/۳۳) اکثر لوگ اپنی گمراہی کی سند بھی قرآن سے دیتے ہیں!

اس کے اس مسلک کا نتیجہ یہ ہے کہ:

قَالَ ۙ فَاَخْرَجْنَا مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۙ وَاِنَّ عَلَيْكَ

اللَّعْنَةَ اِلَى يَوْمِ الدِّيْنِ ۙ (۳۵)

خدا نے کہا کہ تو اس حالت سے نکل جا۔ تو ہر قسم کی سعادت سے محروم ہو گیا۔ (اگر انسان اپنے جذبات سے

منظوب ہو جائے اور انہیں تو انہیں خداوندی کے تابع نہ رکھے، تو وہ، زندگی کی سعادتوں سے محروم رہ جاتا ہے)۔ اور یہ محرومی انسان کے ساتھ مسلسل لگی رہتی ہے۔ اس دنیا میں بھی اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔

اُس نے کہا:

﴿قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمٍ يَبْعَثُونَ﴾ (۳۷) ﴿قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ﴾ (۳۸) ﴿إِلَى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ﴾ (۳۸)

اس نے کہا کہ مجھے انسان کی نشاۃ ثانیہ تک ہمت دے دی جائے۔ اُس دور تک کہ انسان کی ترقی کے راستے میں جس قدر موانع ہیں، یہ اٹھیں دُور کر کے، صحیح انسانی آزادی حاصل کرے۔ جب انسان ان تمام موانع کو دُور کر کے، وحی الہی کے مطابق، صحیح آزادی حاصل کرے گا تو اُس وقت اس پر، اس کے تخریبی جذبات غالب نہیں آسکیں گے۔ (۱۳-۱۵)

خدا نے کہا ہاں! تجھے اس وقت تک ہمت دی جاتی ہے یعنی ایک وقت معلوم تک کے لیے "وقت معلوم" اس لیے کہ انسان کی صحیح آزادی کا دور جس میں وہ اپنے پست جذبات پر غلبہ حاصل کرے، ایسا نہیں جس کا کسی کو علم ہی نہ ہو سکے۔ یہ کوئی رازِ دُرون پر دہ نہیں۔ اس کا ہر ایک کو علم ہوگا۔ اور ہوتا ہے

اُس نے کہا:

﴿قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزِينَ فِي الْأَرْضِ وَأَلْغُوِيَهُمْ أَجْمَعِينَ﴾ (۳۹)

اس نے کہا کہ اے میرے پروردگار! تو نے مجھے جو، اس طرح، زندگی کی سعادتوں سے محروم کر دیا اور مجھ پر خوشگوار یوں کی راہ مسدود کر دی ہے تو میں اب ایسا کروں گا کہ انسانوں کو ان کی طبعی زندگی کے مفاد و اسباب اس طرح خوشنما بنا کر دکھاؤں کہ وہ انہی میں اُلجھ کر رہ جائیں اور انسانی زندگی کے بلند مقاصد کو یکسر نظر انداز کر دیں اور یوں میری طرح، یہ بھی زندگی کی حقیقی سعادتوں سے محروم رہ جائیں۔

یہ وہ آیت ہے جس میں انسانی زندگی اور دین کے اہم بنیادی حقائق پوشیدہ ہیں۔ اس کے لیے مطالب الفرقان

جلد دوم صفحہ ۱۰۱ کو بار و بار دیکھ لیجیے۔ اسے تو بار بار دیکھنا چاہیے۔ آپ اس اصول پر غور کیجیے کہ جو شخص اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتا اور اپنی ذمہ داری کو دوسروں کے سرختوپنے کی کوشش کرتا ہے، اُس کی کبھی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ دنیا میں جس قدر فتنہ و فساد برپا ہوتے ہیں وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، اُن کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ غلط کوشش یا غلط کار اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتا، اپنی ذمہ داری قبول نہیں کرنا، اُسے دوسروں کے سرختوپنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اسے قبول نہیں کرتا، جھگڑا شروع ہو جاتا ہے اور اس کے جو نتائج برپا ہوتے ہیں، ظاہر ہیں۔ اگر انسان اپنی غلطی کو تسلیم اور اپنی ذمہ داری کو قبول کر لے تو اس قسم کے جھگڑے ہی پیدا نہ ہوں اور انسان کی اصلاح بھی آسانی ہو جائے۔ تقدیر کا عقیدہ جبر اسی قسم کی ذہنیت پیدا کرتا ہے کہ میں اپنی غلطی کا ذمہ دار نہیں۔ میں تو مجبور محض ہوں، اس ذہنیت کی وجہ سے انسان دین اور دنیا دونوں میں تباہ ہوتا ہے۔ (انڈکس میں تقدیر کا عنوان دیکھیے)۔

مکرم

ابلیس نے جب یہ کہا کہ: **وَلَا غُورِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ** میں ان سب (تمام لوگوں) کو گمراہ کروں گا تو ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ:

**إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ** ﴿۱۵﴾

ہاں؛ جو تیرے مخلص بندے ہوں گے، ان پر میرا زور نہیں چل سکے گا۔ (وہ اپنے آپ کو وحی کے تابع رکھیں گے اس لیے مکرش جذبات ان پر غالب نہیں آسکیں گے)۔

دوسرے مقام پر (۱۵) میں بھی یہی آیا ہے۔ یہی وہ قوت ہے جس سے انسان ہر قسم کے شر کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسی استثناء سے، ان تمام باطل عقاید اور مسالک کی تردید ہو جاتی ہے جن کی رُو سے کہا جاتا ہے کہ انسان اپنے گناہوں کے داغ دھو ہی نہیں سکتا، تفصیل کے لیے مطالب الفرقان جلد دوم، عنوان ابلیس ص ۵۲ تا ۵۳) یہی حتیٰ پریمنی مسلک ہے۔

**قَالَ هَذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ** ﴿۱۶﴾

خدا نے کہا۔ جس راہ پر مخلص بندے چلیں گے، وہی وہ توازن بدوش راہ ہے جو انہیں سیدھی، زندگی کی

منزل مقصود تک پہنچا دے گی۔ یہی راہ میری طرف لانے والی ہے۔ (۱۶)

پہلے ابلیس نے خدا سے کہا تھا کہ تیرے مخلص بندوں پر میرا کوئی اختیار و اقتدار نہیں ہوگا۔ اس کے بعد خود

خدا نے اس کی یہ کہہ کر توثیق کر دی کہ :

۱۵  
۲۲ **إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ  
اتَّبَعَكَ مِنَ الْغُوفِينَ ۝۲۱**

میرے ان بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکے گا۔ تیرا غلبہ انہی پر ہو سکے گا جو اس متوازن راہ کو چھوڑ کر تیرے پیچھے لگ جائیں گے۔ ان کا انجام تباہی ہوگا۔

۱۵  
۲۲ **وَأَنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ ۝۲۲**

یقیناً ان سب کے لیے تباہی و بربادی کا جہنم ہے اور یہ وہاں پہنچ کر رہیں گے۔

وہ جہنم:

۱۵  
۲۳ **لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِّكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُومٌ ۝۲۳**

تباہی تو سب کے لیے ایک جیسی ہوگی لیکن اس تک پہنچنے کے راستے مختلف ہوں گے۔ ان میں سے ہر گروہ کا الگ راستہ ہوگا جہاں سے تباہی کے جہنم میں داخل ہوگا۔ (یعنی صراطِ مستقیم جو جنت تک لے جاتی ہے) ایک ہی ہے۔ لیکن جب اُسے چھوڑ دیا جائے تو غلط راستے بے شمار ہوتے ہیں اور مختلف لوگ مختلف راستوں سے تباہی تک پہنچ جاتے ہیں۔ ٹھیک نشانے کا مقام ایک ہی ہوتا ہے، غلط نشانے کے مقامات لا تعداد ہو سکتے ہیں۔ ٹھیک جواب ایک ہی ہوتا ہے۔ غلط جوابات کا شمار نہیں ہو سکتا۔ خدا کا دین ایک ہی ہے۔ انسانوں کے خود ساختہ مذاہب بے شمار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دین میں فرقے نہیں ہو سکتے۔ (۳۰-۳۱)

ان کے برعکس :

۱۵  
۲۶—۲۷ **إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝۲۶  
بِسَلَامٍ أَمِينٍ ۝۲۷**

ان کے برعکس متقین (زندگی کی تباہیوں سے بچ کر قوانینِ خداوندی کے مطابق چلنے والوں) کی منزل

سرسبز و شاداب باغات اور جاری چشمتے ہوں گے۔ اس جنتی معاشرہ میں (جو اس زندگی سے اخروی زندگی تک مسلسل چلا جائے گا) وہ ہر تباہی سے مامون ہوں گے اور ان کی تمام صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہوتی جائے گی۔

اس معاشرہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہوگی کہ:

﴿۱۵﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴿۴۴﴾

اس معاشرہ کے افراد کے دلوں میں (ایک دوسرے کی طرف سے جس قدر) گریہیں ہوں گی سب صاف ہو جائیں گی۔ بغض، کینہ، عداوت، فریب کی کوئی بات نہیں رہے گی۔ حتیٰ کہ کوئی راز ایسا نہیں ہوگا، جسے وہ ایک دوسرے سے پوشیدہ رکھیں (۴۴)۔ وہ بھائیوں کی طرح دل کھول کر، ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر بیٹھیں گے۔

غِلِّ کی تشریح مطالب الفرقان، جلد پنجم (۱۹۷) پر دی گئی ہے۔ اسے دیکھ لیجئے۔ کیونکہ یہ جنتی معاشرہ کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

﴿۱۵﴾ لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ ﴿۴۵﴾

وہاں انہیں، مُشَقَّت، نکان یا دامانگی چھو تک نہیں سکے گی۔ وہ ہر وقت تروتازہ اور ہشاش بشاش رہیں گے۔ نہ ہی وہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔

یہ کچھ بیان کرنے کے بعد کہا:

﴿۱۵﴾ نَبِيِّ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۴۹﴾ وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ ﴿۵۰﴾

(اے رسول!) میرے بندوں کو یہ خبر سنا دو کہ میرے ہاں ان کے لیے ہر قسم کی حفاظت اور نشوونما کا سامان ہے، لیکن جو لوگ میرے قوانین کی خلاف ورزی کر کے، اپنے لیے سامانِ ہلاکت خرید لیں گے، ان کے لیے بڑی ہی الم انگیز تباہیاں ہوں گی۔

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ یہ عذاب قوم لوط پر کس طرح آیا۔ اس سے (ضمناً) یہ بھی واضح ہے کہ (آخری عذاب تو اپنے مقام پر رہا) یہ عذاب اس دُنیا میں وارد ہو جاتا ہے (انڈکس میں قوم یا اقوام کا عنوان دیکھئے۔ متعلقہ مقامات سے واضح ہو جائے گا کہ قوموں کا عروج و زوال اور ان کا استخلاف و استبدال انہی قوانین مکافاتِ عمل سے وابستہ ہے)

قوم لوط کا تعارف مطالب الفرقان، جلد پنجم، (صفحہ ۲۹ پر) کرایا گیا ہے۔ اور اس کی داستان (۱۱-۸۳) میں ص ۲۹۳ تک پھیلی ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں، سورہ ہود کی آیات (۱۱-۸۳) میں بھی یہ داستان مذکور ہے (جس کے لیے مطالب الفرقان، جلد ششم دیکھیے)۔

اس داستان کا آغاز ضعیف ابراہیمی (حضرت ابراہیم کے ہاں آنے والے معانوں) سے ہوتا ہے۔ مطالب جلد پنجم ۲۹۵ پر تو اس کا ذکر اجمالی سا ہے۔ تفصیلی تذکرہ سورہ ہود میں آیا ہے۔ چونکہ سابقہ جلدوں (پنجم اور ششم) میں یہ واقعات تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں، اس لیے زیر نظر اوراق میں (حسب سابق) متعلقہ آیات اور ان کے مفہوم پر اکتفا کیا جائے گا، بجز کسی ایک نکتے کی تشریح کے جو پہلے نہ آیا ہو۔ زیر نظر سورہ میں آغاز داستان یوں ہوتا ہے۔

﴿۱۵﴾ وَنَبَّهْم عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۵۱﴾

الم انجیز تباہی کا یہ عذاب کس طرح آیا کرتا ہے، اس کے لیے انہیں (مثلاً، قوم لوط کی تباہی کا قصہ سناؤ جس کی ابتداء ابراہیم کے ہاں آنے والے معانوں سے ہوتی ہے۔ (۱۱-۸۳)) اس کے بعد کی پانچ آیتوں میں بیٹے کی بشارت کا تذکرہ ہے۔

﴿۱۵﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا قَالِ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿۵۲﴾

قَالُوْا لَا تُوَجَّلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۵۳﴾ قَالِ اِبْشِرْ مُوْنِيْ عَلٰى اَنْ اَمْسِنِي الْكِبْرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾ قَالُوْا اِبْشِرْ نَكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالِ وَمَنْ يَّقْنَطُ

## مَنْ رَحِمَ رَبِّهِ إِلَّا الصَّالُونَ ﴿۵۶﴾

وہ جب ابراہیم کے ہاں آئے تو انہوں نے کہا کہ ہم تمہاری سلامتی کے خواباں ہیں۔ اس نے کہا کہ تم صبی لوگ ہو اس لیے، مجھے تم سے کچھ اندیشہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ اندیشہ اور خطرہ کی کوئی بات نہیں۔ ہم تمہیں ایک ایسے بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں جو صاحب علم ہوگا۔ اس نے کہا کہ تم مجھے بیٹے کی خوشخبری دیتے ہو حالانکہ میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔ تم مجھے اولاد کی خوشخبری دیتے ہو تو کن قرآن کی رو سے؟ اب میرے ہاں اولاد کی کیا امید ہو سکتی ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہم تمہیں بالکل سچی خوشخبری دیتے ہیں۔ تم نامتدیت ہو۔ ابراہیم نے کہا۔ نہیں! میں خدا کی رحمت سے ناامید نہیں ہوں۔ اُس سے تو وہی امید ہوتے ہیں جو اُس کا راستہ چھوڑ کر غلط راستوں پر چل نکلیں یا جنہیں صلیح راستہ نہ مل سکے جو اُس کی راہ پر چلیں، ان کے سامنے، اُس کی رحمت کے عالمگیر نقشے ہوتے ہیں۔ لہذا، میں اُس کی رحمت سے کیے ناامید ہو سکتا ہوں؟ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ عام قرآن کے لحاظ سے میرے ہاں اب اولاد کی امید نہیں ہو سکتی۔

اس خوشخبری کا ذکر سورہ ہود کی آیات (۱۱-۱۳) میں آچکا ہے۔ نیز مطالب الفرقان جلد پنجم (ص ۳۰) پر اس کے بعد حضرت ابراہیم نے اُن سے پوچھا کہ وہ کس مشن کے لیے آئے ہیں۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿۵۷﴾ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا  
إِلَىٰ قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ ﴿۵۸﴾ إِلَّا آلَ لُوطٍ إِنَّا لَمَنْجُوهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۵۹﴾  
إِلَّا امْرَأَتَهُ قَدَرْنَا لَانهَا لِسِنِ الْغَابِرِينَ ﴿۶۰﴾

پھر اُس نے کہا کہ یہ بتاؤ کہ تم جو بھیجے ہوئے آئے ہو، تو وہ کون سی قوم ہے جس کے لیے تم مامور ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں یعنی قوم لوط کی طرف۔ وہ ساری قوم تباہ ہو جائے گی، بجز لوط کی اپنی جماعت کے لوگوں کے۔ انہیں بچالیا جائے گا۔ حتیٰ کہ لوط کے اپنے گھرانے کے لوگوں میں سے۔ اس کی بیوی بھی تباہ ہو جائے گی۔ اُس کے متعلق ہمارا اندازہ ہے کہ وہ لوط کے ساتھ نہیں جائے گی، قوم مخالف کے ساتھ پیچھے رہ جائے گی۔

اس کا ذکر مطالب الفرقان جلد پنجم (صفحہ ۲۹۵) پر آچکا ہے۔ نیز سورۃ ہود کی آیات (۲۴-۲۷) میں ازاں بعد قوم لوطؑ کی داستان بیان ہوئی ہے جو مطالب الفرقان جلد پنجم (صفحہ ۲۹۲ سے آخر تک) اور سورہ ہود کی آیات (۲۴-۲۷) میں زیر نظر سورۃ میں یہ واقعات اس طرح بیان ہوئے ہیں۔

﴿۱۵﴾ فَلَمَّا جَاءَ آلَ لُوطٍ الْمُرْسَلُونَ ﴿۶۱﴾ قَالَ إِنَّكُمْ قومٌ مُنكَرُونَ ﴿۶۲﴾ قَالُوا بَلْ جِئْنَاكَ بِمَا كَانُوا فِيهِ يَسْتُرُونَ ﴿۶۳﴾ وَاتَيْنَاكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّا لَصٰدِقُونَ ﴿۶۴﴾

پھر جب وہ پینا مبر قوم لوطؑ کے پاس آئے تو لوطؑ نے ان سے کہا کہ تم لوگ یہاں کے رہنے والے نہیں اجنبی معلوم ہوتے ہو انہوں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہم یہاں کے رہنے والے نہیں لیکن ہم وہ بات لے کر آئے ہیں جس کی بابت یہ لوگ تم سے جھگڑتے رہتے ہیں۔ (یعنی وہ تباہی جس سے تم انہیں آگیا کرتے ہو اور یہ کہا کرتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو اسے لاکر دکھاؤ) ہم اس تباہی کو ایک ٹھوس حقیقت بنا کر ان کے سامنے لانے کے لیے آئے ہیں۔ ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔ ایسا ہو کر رہے گا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں سے ہجرت کر جانے کی بھی تلقین کر دی۔

﴿۱۵﴾ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِنَ اللَّيْلِ وَاتَّبِعْ أَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ وَامْضُ حَيْثُ تُؤْمَرُونَ ﴿۶۵﴾ وَ قَضَيْنَا إِلَيْهِ ذَلِكَ الْأَمْرَ أَنَّ دَابِرَهُمْ لَاقِطْعُومٌ مُّصْبِحِينَ ﴿۶۶﴾

سو تم اپنی جماعت کو لے کر کچھ رات گئے یہاں سے نکل جاؤ۔ آگے آگے انہیں جانے دو اور ان کے پیچھے پیچھے خود چلو کہ خطرہ کے وقت، امام، لیڈر کو سبکے بعد جانا چاہیے، اور یہاں سے یوں دامن نشاں اٹھو کہ پھر اس طرف مڑ کر بھی نہ دیکھو (۶۵) اور جس مقام کا تمہیں دُعا کی طرف سے حکم دیا گیا ہے وہاں چلے جاؤ۔ اور ہم نے لوطؑ کو بذریعہ وحی بتا دیا کہ صبح ہوتے ہی اس قوم کی جڑیں کٹ جائیں گی بستی کے لوگوں کو اس کا علم ہوا تو :



﴿۱۵﴾ وَجَاءَ أَهْلَ الْمَدِينَةِ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿۶۷﴾ قَالَ إِنَّ هَؤُلَاءِ

صِيفِي فَلَاحِقُونَ ﴿۶۸﴾ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تَخْزُونِ ﴿۶۹﴾  
قَالُوا أَوْلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعَالَمِينَ ﴿۷۰﴾ قَالَ هَؤُلَاءِ بَنَاتِي

إِنْ كُنْتُمْ فَعِلِينَ ﴿۷۱﴾

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ ادھر جب بستی کے لوگوں کو ان نوواردوں کی اطلاع ملی تو وہ خوشیاں مناتے ہوئے آپہنچے۔ ٹوٹنے ان سے کہا کہ یہ میسر مہمان ہیں تم ان سے کوئی نازیبا حرکت کر کے مجھے رسوا نہ کرو۔ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور میری تدبیر کا باعث نہ بنو۔ انہوں نے ٹوٹ سے کہا کہ کیا ہم نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم دوسری قوموں کے لوگوں کو اپنے ہاں نہ بٹھرایا کرو؟ اب اگر تم وہی کچھ کرو جس سے ہم نے تمہیں روکا تھا تو اس کا خمیازہ بھگتو اس پر ٹوٹ نے ان سے کہا کہ اگر کوئی صنی مرد ادھر آسکے تو اس کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ تم اس پر پل پڑو، یہ تمہاری عورتیں جو میرے لیے نذرہ میری اپنی بیٹیوں کے ہیں، موجود ہیں۔ (اپنی نفسانی خواہش کو ان سے پورا کرو)۔

اس کی تشریح مطالب الفرقان، جلد چہیم (ص ۳۰۳) میں اور سورۃ ھود آیات (۱۹، ۲۸) میں کی جا چکی ہے۔ اگلی آیت کے دو معانی ہو سکتے ہیں۔ آیت ہے۔

﴿۱۵﴾ لَعَنَ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۷۲﴾

ترجمہ اس کلمے — تیری جان کی قسم! وہ لوگ اپنی بدستی میں اندھے ہو رہے تھے۔

اگر اسے انہی مہمانوں کا قول سمجھا جائے تو مفہوم یہ ہو گا کہ وہ حضرت ٹوٹ سے کہہ رہے تھے کہ آپ کن لوگوں سے بے فائدہ مغز ماری کر رہے ہیں۔ وہ اپنے جنسی جذبات کی شدت سے اندھے ہو رہے ہیں۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ آپ ان سے کیا کہہ رہے ہیں۔ جو شخص نشہ سے بدست ہو رہا ہو اس پر پند و نصائح کیا اثر کر سکتے ہیں اور اگر اسے جملہ معترضہ لیا جائے تو مفہوم یہ ہو گا کہ دستاں بیان کرتے کرتے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ سے کہا کہ "تیری جان عزیز کی قسم! وہ لوگ اپنے جذبات کی شدت سے اندھے ہو رہے تھے اس لیے وہ (حضرت) ٹوٹ

لے "تیرے دین کی قسم!" عمر کے معنی دین بھی ہوتے ہیں۔

کی بات کیا سنتے؟“ اس کے بعد پھر داستان کا سلسلہ جاری رکھا اور کہا۔

﴿۱۵﴾ ۴۳ فَآخَذْتَهُمُ الصَّيْحَةَ مُشْرِقِينَ ۙ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا

سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سَبِيلٍ ۙ ﴿۴۴﴾

قصہ مختصر، ان لوگوں کو سورج نکلنے ہی ایک ہولناک زلزلے نے آپکڑا اور آتش فشاں پہاڑ سے ان پر مٹی کے پتھروں کی ایسی بارش ہوئی کہ ساری بستی تہ و بالا ہو گئی۔

پھر مقطع کی آیت کے طور پر اس حقیقت کو دہرایا کہ یہ قصہ تو محض تاریخی واقعہ کے طور پر بیان کر دیا گیا۔

﴿۱۵﴾ ۴۵ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ ﴿۴۶﴾

یقیناً اس واقعہ میں ان لوگوں کے لیے عبرت کی بڑی نشانیاں ہیں جو ہمہ فراست سے کام لے کر حقیقت تک پہنچنا چاہیں۔

اور قوم مخاطب (عربوں) سے کہا کہ تمہیں اس قوم کے انجام کے متعلق بات سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے کہ :

﴿۱۵﴾ ۴۶ وَإِنَّهَا لِبَسْبِيلٍ مَّقِيمٍ ﴿۴۷﴾

دقوم لوط کی بستی غیر معروف مقام پر نہیں تھی۔ وہ اس راستے پر واقع تھی جہاں آمدورفت کا سلسلہ اب تک قائم ہے اس لیے یہ لوگ آتے جاتے اس کے گھنڈرات دیکھ سکتے ہیں۔

اور زمانہ نزول قرآن کے عربوں کے لیے ہی نہیں قیامت تک قرآن پر ایمان لانے والوں کے لیے۔

﴿۱۵﴾ ۴۷ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿۴۸﴾

یقیناً ان گھنڈرات میں ان لوگوں کے لیے حقیقت شناسی کی نشانیاں ہیں جو خدا کے قانونِ مکافات پر یقین رکھتے ہیں۔

(د)

اس کے ساتھ، ضمناً، دو اور قوموں کے اس قسم کے انجام کا ضمنی تذکرہ کر دیا۔ ایک قوم مدین جس کی طرف

حضرت شعیب مبعوث ہوئے تھے، اسے اصحاب الایکۃ بھی کہا گیا ہے یعنی گنے جنگلوں میں رہنے

والی قوم اور دوسری اصحابِ الحجر یعنی قومِ ثمود جس کی طرف حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے تھے۔ قومِ مدین کا تفصیلی تذکرہ 'مطالبُ الفرقان' جلد پنجم (صفحہ ۲۰۹) میں آچکا ہے اور قومِ ثمود کا اس جلد کے صفحہ ۲۳۶ پر سورۃ ہود میں بھی ان دونوں کا ذکر آیا ہے۔ (انڈکس دیکھئے)۔ یہاں کہا:

﴿۱۵﴾ وَإِنْ كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لَظَالِمِينَ ﴿۷۸﴾ فَانْتَقَمْنَا

مِنْهُمْ ۖ وَانْتَهَمَا لِيَأْمُرَ مَبِينًا ﴿۷۹﴾

اور اسی طرح، اصحابِ الایکہ (گھنے جنگلوں کے رہنے والے، یعنی قبیلہ مدین کے لوگ) بھی بڑے سرکش تھے۔ سو ہم نے انہیں بھی، ان کی سرکشی کی سزا دی۔ اور یہ دونوں بستیاں (یعنی قومِ لوط اور قومِ مدین کے شہر عام شاہراہ پر واقع ہیں۔ اور قومِ ثمود کے متعلق:

﴿۱۵﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ ﴿۸۰﴾ وَ

اتَّيَّهُمْ آيَاتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿۸۱﴾ وَكَانُوا

يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ ﴿۸۲﴾ فَآخَذْتَهُمُ الصَّيْحَةُ

مُصْبِحِينَ ﴿۸۳﴾ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۸۴﴾

اور اصحابِ الحجر، یعنی قومِ ثمود نے بھی اپنے رسولوں کے پیغام کی تکذیب کی۔ انہیں ہم نے واضح قوانین دیے تھے لیکن وہ ان سے روگرداں رہے (وہ بڑی طاقت ور قوم تھی) وہ لوگ پہاڑوں کو تراش کر اپنے مکان بناتے تھے تاکہ (ان قلعہ ناگھروں میں) محفوظ رہیں۔ (لیکن ان کے یہ محفوظ قلعے بھی انہیں خدا کے عذاب سے نہ بچا سکے) صبح ہوتے ہی انہیں سخت ہولناک آواز کے ساتھ، عذاب آدبوجا۔ اور جو کچھ انہوں نے اپنی کوششوں سے اپنے لیے بنا رکھا تھا، وہ ان کے کسی کام نہ آسکا۔

قرآنی

اقوام سابقہ کی یہ داستانیں اس لیے دہرائی گئی ہیں کہ حضور نبی اکرمؐ اور جماعت صحابہؓ کو بتایا جائے کہ

حق و باطل کی وہ کشمکش جس کا سامنا وہ کر رہے ہیں، کوئی نئی بات نہیں شروع سے ایسا ہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آخر الامر کامیابی حق کی ہوتی ہے۔

یہ کشمکش اب آخری مراحل میں پہنچی تھی، اس لیے اس جماعتِ مومنین کو واضح طور پر بتا دیا کہ انقلاب کی گھڑی اب بالکل سر پر کھڑی ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے مختلف مقامات پر ایک عظیم حقیقت بیان کی ہے اور وہ یہ کہ یہ سلسلہ کائنات اس لیے سرگرم عمل ہے کہ اعمال کے ٹھیک ٹھیک نتائج مرتب ہوں۔ اس سلسلہ میں مطالب الفرقان جلد دوم (ص ۹۳)۔ نیز (۵۳ : ۱۶) دیکھئے۔

انقلاب کے لیے قرآن حکیم میں ساعتہ کا لفظ آیا ہے۔ (دیکھئے مطالب الفرقان جلد پنجم (ص ۲۷۲) نیز سورۃ الاعراف آیت (۱۸۱)۔ مطالب الفرقان جلد ششم۔

اس کشمکش میں پروگرام یہ ہونا تھا کہ خدا کا رسول اپنی مخاطب قوم تک خدا کا پیغام پہنچاتا تھا۔ ان میں سے جو سعادت مند افراد اس پیغام کو قبول کر لیتے وہ اس کی جماعت میں شامل ہو جاتے۔ آخر الامر ایسا مقام آ جاتا جس میں نظر آ جاتا کہ باقی ماندہ افراد اس پیغام کو قبول نہیں کریں گے بلکہ اس کی مخالفت میں انتہا تک پہنچ جائیں گے۔ اس مقام پر رسول اپنی جماعت کے ساتھ وہاں سے ہجرت کر کے ایسے مقام کی طرف چلا جاتا جو اس کے مشن کے لیے زیادہ سازگار ہوتا۔ (انڈکس میں ہجرت کا عنوان دیکھئے)۔ یہ اس قوم سے قطع علائق کی علامت بھی ہوتی تھی۔ اس قطع علائق کی مثال یوں سمجھیے جیسے کوئی طبیب مریض کی بالیں سے یہ کہہ کر اٹھ کر چلا جائے کہ :

یوں خدا کی خدائی برحق ہے

پراثر کی ہمیں تو اس نہیں!

لیکن یہ غمبیرانہ اندازِ زیست یہ ہونا تھا کہ کسی کے ساتھ رہنا تو ایک طرف، اس سے الگ ہونا پڑے تو بھی

حسن کارانہ انداز سے الگ ہوا جائے۔ (۷۳)

یہ تمام نکات اگلی ایک آیت میں سمنا دیے گئے ہیں: فرمایا:

﴿۱۵﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ ط

وَإِنَّ السَّاعَةَ لَأْتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ ﴿۱۶﴾ إِنَّ

رَبَّكَ هُوَ الْخَلِيقُ الْعَلِيمُ ﴿۱۷﴾

۱) اے رسول! تم نے دیکھ لیا کہ اقوام سابقہ کو اُن کے غلط اعمال نے کس طرح تباہ کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سلسلہ کائنات (ارض و سما) پیدا ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ ٹھوس تعمیری نتائج مرتب کرنا ہے (تخریبی قوتیں، کائنات کے پروگرام میں فٹ نہیں بیٹھ سکتیں، اس لیے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ لہذا، جو کچھ اُن اقوام کے ساتھ ہوا، وہی کچھ تمہاری مخاطب قوم کے ساتھ بھی ہوگا۔ وہ فیصلہ کن انقلاب جس سے انہیں متنبہ کیا جاتا ہے، اُگر رہے گا۔ لہذا، تم ان سے اُلجھو نہیں۔ جس قدر تبلیغ حق کا ضروری کام تھا، وہ ہو چکا، تم ان سے، نہایت خوش آئند طریق سے الگ ہو کر اپنے پروگرام کی تکمیل میں مصروف رہو۔ (۳۳) یہ سب کچھ تیرے اُس پروردگار کی طرف سے کہا جا رہا ہے جس نے اس تمام سلسلہ کائنات کو پیدا کیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ کس قسم کی سعی و عمل کا نتیجہ کیا ہوتا ہے!

قرآن حکیم نے تاریخ کو کس قدر اہمیت دی ہے، اس کے لیے انڈکس میں عنوان تاریخ دیکھئے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ "تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے" اسے اگلی آیت میں بیان کر دیا۔ اس کی تشریح مطالب الفرقان جلد دوم ص ۱۵۱ پر آچکی ہے اس لیے یہاں اس کے مفہوم پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

﴿۱۵﴾ **وَلَقَدْ آتَيْنَكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنِ الْعَظِيمِ ﴿۸۷﴾**

ہم نے تمہیں اس تاریخ کے متعدد واقعات کا علم دیا ہے، جو اپنے آپ کو دہراتی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ قرآن عظیم عطا کیا ہے (جو ان اصولوں کو اپنے اندر رکھتا ہے جن کے مطابق اقوام کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں)۔ (۳۳)

کشمکش کے اس آخری مرحلہ میں، جب تصادم اپنی شدت کو پہنچ رہا تھا، جماعتِ مومنین کے دل میں یہ خیال اُبھرتا ہوگا کہ مخالفین مادی وسائل و ذرائع میں ان سے کہیں بڑھ کر ہیں اس لیے ان سے مقابلہ میں بڑی دقت پیش آئے گی۔ اس خیال کا ازالہ یہ کہہ کر کر دیا کہ تمہارے پاس جو (ایمان کی) قوت ہے اس کا مقابلہ کوئی بھی نہیں کر سکے گا۔ اس لیے تم (اپنی قلتِ اسباب کے خیال سے گھبرائو نہیں

اس کے ساتھ ہی سیرتِ رسولِ پاک کا ایک نہایت درخشندہ گوشہ بھی باعثِ فروغِ دیدہ بن رہا ہے۔ مخالفین کی جماعت تمام عمر مخالفت کرتی رہی اور اس میں انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ حضور تمام عمر ایک طبیبِ مشفق کی طرح انہیں سمجھاتے رہے کہ وہ اپنی غلط روش سے باز آجائیں ورنہ تباہ ہو جائیں گے۔ حضور کی یہ وردِ مندی اور غمگساری اس حد تک تھی کہ خود خدا کو یہ کہنا پڑا کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسًا أَلَّا يَكُونُوا

مُؤْمِنِينَ (۲۶) ”ایسا نظر آ رہا ہے کہ تو اس غم میں کہ یہ لوگ صحیح راستہ کیوں اختیار نہیں کرتے، اپنی جان گھلا لینگا“ یہاں کہا۔ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ (۲۷) ”تو ان کی تباہی کے تصور سے غم نہ کھا۔ کسی کی ہمدردی، خودکشی کرنے والے کی جان نہیں بچا سکتی اور اس کے بعد کہا کہ تم اپنی جماعت کی تنظیم و تربیت میں اور بھی شدت سے مصروف ہو جاؤ۔ یہ صحابہؓ کی جماعت تھی جن کے بلند و بالا مقام اور حسن سیرت و کردار کے متعلق قرآن میں بڑی تفصیل سے آیا ہے (انڈکس میں عنوان صحابہؓ دیکھئے) یہ تمام نکات ذیل کی آیت میں آگئے ہیں:-

﴿ ۱۵ / ۸۸ ﴾ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَانخِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۸۸﴾

تاریخ کی ان مرکز شدتوں اور تڑان کے ان بنیادی حقائق کے بعد، تم طبعی زندگی کے اُس ساز و سامان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو جو ہم نے، ان میں سے مختلف طبقات کے لوگوں کو دے رکھا ہے۔ (اقوام سابقہ کو ان سے کہیں زیادہ ساز و سامانِ زینت حاصل تھا، نہ ہی تم اپنے آپ کو اس غم میں گھلانے رہو کہ یہ لوگ صحیح راستے کی طرف آکر زندگی کی تباہیوں سے کیوں نہیں بچ جاتے! نہ اقوام سابقہ نے اپنے پیغمبروں کی بات پر کان دھرا تھا، نہ یہ تمہاری بات سنیں گے، تم اب ان مخالفین کا خیال چھوڑ کر) ان لوگوں کو جو اس پیغام کی صداقت پر ایمان لے آئے ہیں اپنے بازوؤں کے نیچے سیٹھے جاؤ (اور اس طرح مناسب تعلیم و تربیت سے اپنی جماعتی تنظیم میں شیخی اور مرکزیت پیدا کرتے جاؤ۔ (۱۵/۸۸))

اور اس آخری مرحلہ میں بھی ان مخالفین کو ان کی غلط روش کے انجام سے آگاہ کرتے رہو۔

﴿ ۱۵ / ۸۹ ﴾ وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ ﴿۸۹﴾

اور فریقِ مخالف سے کہتے رہو کہ میں تمہیں تمہاری غلط روش کے تباہ کن نتائج سے کھلے طور پر

آگاہ کر رہا ہوں۔

ان مخالفین میں وہ مخالف بھی ہیں جو قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے رہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں (دیکھئے

عنوان متناقض)۔ ان لوگوں کی روش اور مسلک کو قرآن نے ایک لفظ ”عَصِيْبٌ“ میں سمو کر رکھ دیا ہے۔ یہ بڑا

جامع المعانی لفظ ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں:-

۱۔ کسی چیز کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ ان کا انداز یہ ہے کہ قرآن کی جو بات اپنے مفید مطلب ہو اسے اختیار کر لیتے ہیں، جو ان کے خلاف جائے اسے چھپا دیتے ہیں۔ اس روش کا جو نتیجہ ہوتا ہے اسے قرآن نے آیت (۲) میں واضح کر دیا ہے۔ اس دنیا میں ذلت اور خواری اور آخرت میں عذاب شدید۔

۲۔ اس کے معنی جھوٹ، فریب اور دھوکا کے بھی ہوتے ہیں۔

۳۔ نیز جنت منتر، تعویذ تاکے اور وظائف، جادو، ٹونے ٹوٹکے۔

قرآن کریم نے ان لوگوں کی جو روش بیان کی ہے، آپ غور کیجیے، کیا ہماری بعینہ یہی حالت نہیں ہے؟ کیا ہم نے بھی قرآن کا یہی مصروف نہیں بنا رکھا۔

جن آیات کی یہ تشریح ہے وہ حسب ذیل ہیں :

﴿۱۵﴾ ۹۱-۹۰ **كَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِينَ ۙ الَّذِينَ جَعَلُوا**

**الْقُرْآنَ عِضِينَ ۙ ﴿۹۱﴾**

جن تباہیوں سے تو انہیں آگاہ کرتا ہے ان کا کچھ اندازہ ان لوگوں کو ہو بھی چکا ہے۔ یہ لوگ آپس میں قسمیں کھا کھا کر تیسری مخالفت کرتے اور پھر جھوٹی قسموں سے تمہیں اپنی رفاقت کا یقین دلاتے تھے (۱۵ : ۹۰، ۱۶ : ۱۳) اور اپنا سا رازوریش چھور کرنے میں صرف کر دیتے تھے کہ قرآن، جھوٹ، افتراء، سحر اور کہنت کے سوا کچھ نہیں۔ سو ہم نے انہیں طرح طرح کے مصائب و نوازل میں مبتلا کیا اور یہ تو ابھی ہلکے ہلکے جھکے تھے، آگے آگے دیکھئے ہونا ہے کیا۔

خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے ان کی اس غلط روش کے نتائج نکھر کر ان کے سامنے آجائیں گے۔

﴿۱۵﴾ ۹۳-۹۲ **فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۙ ﴿۹۲﴾ عَمَّا كَانُوا يَعْبَلُونَ ۙ ﴿۹۳﴾**

تیسرے رب کا قانونِ مکافات اس پر شاہد ہے کہ ان سب کے اعمال کی باز پرس ہوگی اس قسم کی روش کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا۔

ان کی مخالفت کا علاج یہ ہے کہ :

﴿۱۵﴾ ۹۴ **فَأَصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ۙ ﴿۹۴﴾**

لہذا، لے رسول! تم ان کا خیال مت کرو، بلکہ جیسا کہ تم سے کہا گیا ہے (۱۵)؛ ان سے الگ ہٹ کر اپنی جُدا گنا  
نظم کر دو اور ان لوگوں سے اعراض برتو جو خدا کے ساتھ اور قوتوں کو بھی شریک کہتے ہیں۔  
جس انداز سے نبی اکرمؐ اور جماعت مومنین کو اطمینان دلا یا جا رہا ہے، ان کی تسلی کرائی جا رہی ہے اس سے واضح ہوتا  
ہے کہ یہ مرحلہ کس قدر جانگس، ہمت شکن اور صبر آزما تھا۔

﴿۱۵﴾ اِنَّا كَفَيْكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ ﴿۹۷﴾ الَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ  
اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿۹۸﴾

یہ لوگ، جو خدا کے اقتدار کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کرتے ہیں، تمہاری ہنسی اڑا کر دہشت خوش  
ہوتے ہیں کہ بڑا کارناما سرانجام دے رہے ہیں، ہم تیری طرف سے ان کے لیے کافی ہیں (ہمارا قانون  
مکانات ان سے نیٹ لے گا اور، انہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ ان کے اس استہزاء کا انجام کیا ہے  
یہاں استہزاء کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فولادی تیغ و سناں کے زخموں کا مقابلہ کیا جا  
سکتا ہے لیکن طنز و طعن کے گھاؤ ناقابل برداشت ہوتے ہیں۔ بالخصوص اس لیے کہ طعن و تشنیع میں جس ذمیت  
اور پستی کی سطح پر اترنا پڑتا ہے، بلند سیرت و کردار کا حامل اس سطح پر اتر نہیں سکتا۔ اور اپنے مقصد کی بلندی  
اور مشن کی پاکیزگی کا احساس ہی اس میں قوت برداشت پیدا کرتا ہے۔ اس لیے مُسْتَهْزِئِينَ کے مقابلے کے  
لیے اِنَّا كَفَيْكَ کہا، اور فرمایا:

﴿۱۵﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَصِيْقُ صَدْرَكَ بِمَا يَقُولُونَ ﴿۹۷﴾

ہمیں اس کا بھی علم ہے کہ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں، اس کا تمہارے قلب حس پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ اس کے  
تم کبیدہ خاطر ہو جاتے ہو۔

غور فرمائیے۔ کہا یہ ہے کہ حریف کی طعن آمیز باتوں (بِمَا يَقُولُونَ) سے جو کچھ تیرے دل پر گزر رہی ہے  
اس کا ہمیں پورا پورا علم ہے۔ اس سے واضح ہے کہ مَا يَقُولُونَ کو برداشت کرنے کے لیے بڑی ہمت کی  
ضرورت ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ دنیا میں بیشتر جھگڑوں اور فسادات کی بنیاد مَا يَقُولُونَ ہی ہوتی ہے۔ اگر  
باتوں کو برداشت کر لیا جائے تو جھگڑا بڑھتا ہی نہیں۔ یہ مقابلہ تو طینس کا کھیل نہیں ہے۔ فریق مخالف جس شدت  
اور قوت سے گیند پھینکتا ہے اگر آپ اُسے نرمی اور لطافت سے واپس کر دیں تو کھیل آگے نہیں بڑھ سکتا۔



اگر ہم قرآن کی اتنی سی تلقین اور حضور کے اُسوۂ حسنہ کے اتنے سے گوشہ پر عمل پیرا ہو جائیں تو کتنے جھگڑے اور فساد یونہی ختم ہو جائیں۔  
لیکن حریف کے حملوں کو برداشت کرنا تو منفی عمل ہے، اس کے ساتھ مثبت پروگرام کی بھی ضرورت ہے اور وہ پروگرام یہ ہے کہ:

**۱۵**  
**۹۸** فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ﴿۹۸﴾  
لیکن تم ان باتوں کی قطعاً پرواہ نہ کرو۔ یہ تو چاہتے ہی یہ ہیں کہ تمہیں ان باتوں میں الجھا کر تمہاری قوتوں کو منغیانہ طور پر ضائع کر دیں، تم اپنے پروگرام کی تکمیل میں ہر منہ صرف رہو تاکہ خدا کا نظام ربوبیت اس انداز سے متشکل ہو کر سامنے آجائے کہ وہ خدا کی حمد و ستائش کا زندہ پیکر بن جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تم قوانین خداوندی کی کامل اطاعت کرتے جاؤ۔ تم خود بھی ایسا کرو اور تمہاری جماعت بھی ایسا ہی کرے۔

لیکن یہ پروگرام وقتی اور مہنگامی نہیں، اسے آخری کامیابی تک مسلسل جاری رکھنا ہوگا۔

**۱۵**  
**۹۹** وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ﴿۹۹﴾  
اور اس طرح اپنے نشوونما دینے والے کی محکومیت پورے طور پر اختیار کر لو تا آنکہ تمہارا یہ دعویٰ دکھ جس نظام کی طرف تم دعوت دیتے ہو، وہ نہایت خوشگوار نتائج کا حامل ہوگا اور غلط نظام پر چلنے والوں کا انجام تباہی و بربادی ہوگا، پایہ ثبوت تک پہنچ جائے اور ایک ٹھوس حقیقت کی شکل میں دنیا کے سامنے آجائے۔

قرآن کی حامل امت کے لیے یہ پروگرام کسی خاص خطہ زمین اور خاص زمانے تک محدود نہیں، اس کا منتہی یہ ہے کہ:

وَاشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا ﴿۳۹﴾  
تمام کرۂ ارض خدا کے نظام ربوبیت کے نور سے جگمگا اٹھے۔

اور اس طرح جگمگا اٹھے کہ پھر کوئی اس قنديل آسمانی کو سمجھانہ سکے۔ یہی اس کرۂ ارض پر انسانیت کی آخری

منزل ہے۔ (۵۳ : ۴۴)



# اِشَارِيہ

|                                        |                   | ا                     |                        |
|----------------------------------------|-------------------|-----------------------|------------------------|
| ۲۱۰۲۰                                  | برہان رب          |                       |                        |
| ۱۲۷                                    | بسیط حقائق        | ۱۵۲، ۸۳               | ابراہیم حضرت           |
| ۱۷                                     | بلوریں مجسمہ      | ۱۱۲، ۱۱۱              | ابلیس                  |
| ۶۷، ۶۴، ۶۳، ۶۰، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۲ | بن یاسین -        | ۸۱                    | اتقانی امور            |
| ۴۵                                     | بیت المقدس -      | ۱۲۹                   | اجل                    |
|                                        | <b>پ</b>          | ۱۰۰                   | اجرام فلکی             |
| ۴۶                                     | پاکیزگی دامن      | ۲۳                    | احوال و کوائف کی گواہی |
| ۷۲                                     | پیرہن یوسفی       | ۱۷                    | آزاد قبائل             |
|                                        | <b>ت</b>          | ۱۰۴                   | اسباب و علل            |
| ۱۵۱                                    | تاریخ انسانیت     | ۱۵۸                   | اسماعیل حضرت           |
| ۹۵                                     | تاریخی شہادتیں    | ۱۴                    | اسماعیلی عرب           |
| ۷۸، ۷۷، ۷۸                             | تاویل الاحادیث    | ۸۲                    | اضغاث الاحلام          |
| ۱۱۵، ۱۱۴                               | تخریبی قوتیں      | ۱۲۱                   | اطمینان قلب            |
| ۱۱۲                                    | تصوف              | ۳۳                    | افزائش نسل             |
| ۱۱۴                                    | تعمیری قوتیں      | ۵                     | اقوام گزشتہ            |
| ۳۶                                     | تعویذ             | ۱۰                    | اندھا کنواں            |
| ۵۹                                     | تفسیر ابن کثیر    | ۵                     | انسانی عقل             |
| ۴۱                                     | توحید باری تعالیٰ | ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۲        | آنون ڈاکٹر             |
| ۵۹، ۵۴، ۴۴، ۱۰                         | قورات             | ۱۱۶                   | امت واحدہ              |
| ۷۸                                     | تمکن فی الارض     | ۸۴                    | اولیام پرستی           |
| ۱۰۴                                    | تہذیب و تمدن      | ۱۳۸                   | ایام اللہ              |
| ۲۸                                     | تہذیب مصر         | ۱۰۶                   | ایمان                  |
|                                        | <b>ج</b>          |                       | <b>ب</b>               |
| ۱۳۰                                    | جاگیرداری         | ۴۱                    | بادشاہ کا خواب         |
| ۳۴                                     | جبری تجرد         | ۷۱، ۶۵، ۶۴، ۵۱، ۱۳، ۹ | برادران یوسف           |

|                    |                                |                |                            |
|--------------------|--------------------------------|----------------|----------------------------|
|                    | <b>د. د</b>                    |                |                            |
| ۷۷                 | داستان شیریں -                 | ۳۶، ۳۴         | جنتی جذبہ -                |
| ۱۸                 | دامنِ عقبت -                   | ۲۵             | جرمِ زنا، جرائم کی تفتیس - |
| ۴۲، ۴۱             | ذیلی گائیں -                   | ۷۲، ۴، ۳       | جمالِ یوسفی -              |
| ۴۰                 | دو آفت -                       | ۹              | جماعتِ مومنین -            |
| ۴۰                 | دینِ قیم -                     | ۱۸۹، ۱۴۸، ۱۱۸  | جنتی معاشرہ -              |
| ۲۷                 | دورِ ملکیت -                   | ۳۲             | جنسی اختلاط -              |
| ۹۹                 | دیوی دیوتیا -                  | ۳              | جوئے نور -                 |
| ۷۷                 | دہقانہ بچہ -                   | ۱۴۹            | جہنمی معاشرہ -             |
| ۱۲۲                | ذکر اللہ -                     | ۶۵             | جھوٹی روایات -             |
| ۲۳                 | ذلیلِ حربہ -                   |                | <b>ح. ح</b>                |
|                    | <b>س. س</b>                    | ۱۵             | چرواہوں کا لڑکا -          |
| ۱۵۵                | راغبِ اصفہانی، امام -          | ۲۶             | حدودِ آردینیس -            |
| ۱۰۱                | ربوبیت -                       | ۸۳             | حدیبیہ -                   |
| ۲۶                 | رجیم -                         | ۱۸۱            | حسین عورت -                |
| ۹۹                 | رعد -                          | ۱۲۸، ۱۱۵، ۱۱۳  | حق و باطل کی کشمکش -       |
| ۳۴                 | روحانی ارتقار -                | ۳۸             | حقیقتِ کبریٰ -             |
| ۱۳۰                | زمین کی ملکیت، زمینداری نظام - | ۱۲۹، ۹۰        | حیاتِ طیبہ -               |
| ۱۰۳                | زمینِ مُردہ                    |                | <b>خ. خ</b>                |
|                    | <b>س. س</b>                    | ۱۰۰            | خارجی کائنات -             |
| ۴۲                 | ساقیوں کا سردار -              | ۳۳             | خانقاہیت -                 |
| ۸۶، ۸۵             | سجدہ -                         | ۱۷             | خدا کا اٹل قانون -         |
| ۸۱                 | سبیل -                         | ۱۲۶            | خدا کے مقرّب -             |
| ۶۵                 | سلف صالحین -                   | ۱۷             | خانوادہ نبوت -             |
| ۶۲، ۶۱             | سنگھیا -                       | ۸۴، ۸۱، ۷۹، ۳۷ | خواب -                     |
| ۲۶                 | سنگساری -                      | ۵۹             | خورجی -                    |
| ۱۸۴، ۱۸۳           | سیاہ کچھڑ -                    | ۶۱             | خدا کا قانون -             |
| ۷۰، ۴۷، ۴۴، ۴۳، ۲۱ | سیرتِ یوسفی -                  | ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۰  | خیبر                       |

|                                    |                      |                                |                              |
|------------------------------------|----------------------|--------------------------------|------------------------------|
| ۱۰۷، ۱۰۴                           | غیر متبادل قوانین۔   | ۳۹                             | شاہجہان، سلطان۔              |
| ۱۱۶                                | فاسقین۔              | ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰             | شہر۔                         |
| ۲۱                                 | فحش کاری۔            | ۶۱                             | شکاری جانور۔                 |
| ۱۱۷                                | فرقہ بندی۔           | ۱۷۳                            | شعورِ انسانی۔                |
| ۲۶                                 | فقهی قوانین۔         | ۱۹۴                            | شعیبؑ حضرت۔                  |
| ۱۴                                 | فلسطین۔              | ۱۵۷                            | شکر۔                         |
| ۹۴                                 | نوق البشر۔           | ۷۳                             | شہیم یوسفیؑ۔                 |
|                                    |                      | ۱۴۸، ۱۴۷، ۱۱۱، ۸               | شیطان۔                       |
| ۱۳۵                                | قارون۔               |                                |                              |
| ۱۱۴                                | قانون ارتقاء۔        | ۱۰                             | صالحین۔                      |
| ۱۰۳                                | قانون نشوونما۔       | ۱۹۸                            | صحابہ کرامؓ۔                 |
| ۱۵۱، ۱۱۹، ۱۰۹، ۱۰۵، ۹۵، ۶۱، ۶۰، ۴۹ | قانونِ فطرت (مشیت)۔  | ۱۵۵، ۱۵۴                       | صنم۔                         |
| ۱۲۵، ۴۷                            | قانونِ مکافات۔       | ۱۲۷                            | صابطہ حیات۔                  |
| ۳۶                                 | قبر پرستی۔           |                                |                              |
| ۲۰                                 | قتلِ خطا، قتلِ عمد۔  | ۸۷                             | طاغوتی نظام۔                 |
| ۶۹، ۴۳                             | قحطِ سالی۔           | ۱۳۵                            | ظلمات۔                       |
| ۱۳۰                                | قرآنی انقلاب۔        | ۲۰                             | ظلم، سنگین جرم۔              |
| ۸۶، ۷                              | قرآنی مفاہیم۔        |                                |                              |
| ۱۷۹                                | قرآنِ کریم کا ترجمہ۔ | ۱۰۴                            | عجوبہ پسندی۔                 |
| ۱۸۲                                | قصۂ آدم۔             | ۷۰، ۴۶، ۳۲، ۲۹، ۲۴، ۱۵         | عزیزِ مصر۔                   |
| ۲۹                                 | قطعِ ید۔             | ۴۶، ۳۲، ۳۰، ۲۹، ۲۱، ۱۹، ۱۸، ۱۷ | عزیزِ مصر کی بیوی۔           |
| ۱۳                                 | قلبِ خائن۔           | ۶                              | عقلی صلاحیت۔                 |
| ۱۷۷، ۱۷۰                           | قومِ نوح۔            | ۱۱۶                            | عقلِ خود میں، عقلِ جہاں میں۔ |
| ۱۴۰                                | قومِ عاد۔            | ۱۲۱                            | علمِ الکتب۔                  |
| ۱۹۱، ۱۹۰                           | قومِ لوط۔            | ۱۷۳                            | علمِ التجوّم۔                |
| ۱۹۴                                | قومِ مدین۔           | ۲۰                             | عملِ شیعہ۔                   |
| ۲۵                                 | قوانینِ پاکستان۔     | ۲۶                             | عورت کی شہادت۔               |

ش

ف

ق

ص۔ض

ط۔ظ

ع۔ع

|                         |                            |                |                        |
|-------------------------|----------------------------|----------------|------------------------|
| ۱۵۳                     | مکافاتِ عمل -              | ۳۳             | قوموں کا عروج و زوال - |
| ۲۹، ۲۵، ۲۴              | مکر و فریب -               | ۴۵، ۴۲، ۳۷     | قیہ خانہ -             |
| ۸۴، ۸۳                  | مکہ مکرمہ -                | ۱۸۵            | قیاس -                 |
| ۱۵۵                     | ملتِ ابراہیمی -            |                | <b>ک، گ</b>            |
| ۴۹                      | مملکتِ مصر -               | ۱۰۹            | کائنات -               |
| ۱۷۴                     | منجسم -                    | ۱۴۶            | کائناتی قانون -        |
| ۴۲، ۴۱                  | موٹی گائیں -               | ۶۲، ۵۹، ۵۸، ۵۶ | کٹورا، شاہی -          |
|                         | <b>ن</b>                   | ۵۸، ۵۷         | کارندے، شاہی -         |
| ۸۸                      | نبوت -                     | ۱۰۳            | کرشمہ بینی -           |
| ۳۶                      | نذر و نیاز -               | ۱۵۴، ۸۳        | کعبہ شریف -            |
| ۱۵۴، ۱۵۳، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱ | نظامِ ربوبیت -             | ۱۵۲، ۱۵۱       | کلمہ طیبہ -            |
| ۲۷                      | نظامِ سرمایہ داری -        | ۷۳، ۵۰، ۴۸، ۴۳ | کنعان -                |
| ۱۵۲                     | نظامِ صلوة -               | ۸۱             | کوثر -                 |
| ۱۳۱                     | نظامِ ملکیت -              | ۱۷۴            | کاہن -                 |
| ۵۰                      | نظامِ یوسفی -              | ۳۶             | گندہ -                 |
| ۱۱۱                     | نظریہ ارتقاء -             |                | <b>ل</b>               |
| ۴۷                      | نفسِ امارہ - نفسِ مطمئنہ - | ۷۱             | لسانِ یوسفی -          |
| ۱۳                      | نفسِ نیم شعوری -           | ۴              | لوحِ جبیں -            |
| ۱۳۵                     | نور -                      |                | <b>م</b>               |
|                         | <b>و-ع-ی</b>               | ۳۲             | مریم، حضرت -           |
| ۸۸                      | وراثت -                    | ۸۳             | مدینہ منورہ -          |
| ۹۰، ۸۴، ۸۲              | وحی -                      | ۹۹             | مسجودِ ملائکہ -        |
| ۳۹، ۳۸                  | وعظِ یوسفی -               | ۴۵             | مُسلم، صحیح -          |
| ۱۸۱                     | ہوس -                      | ۱۷۳، ۱۰۷، ۹۹   | مظاہرِ فطرت -          |
| ۸۲، ۷۳                  | یعقوب، حضرت -              | ۱۳۰، ۴۹        | معاشی نظام -           |
| ۱۲                      | یوسف، درجاء -              | ۱۱۶            | مفسدین -               |
| ۲۴، ۲۲                  | یوسف، کاکرتنہ -            | ۱۱۹            | معیشت -                |
| ۴۵                      | یہود و نصاریٰ -            | ۱۲۳، ۱۲۰       | معجزات -               |